انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ 4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا 5000 روپے

مستقل سلسلے

جولائی 2011
جلد 25 شمارہ 11
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: ۱۰/۲ بی ای بخاری سی ای ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaamonthly@yahoo.com, Info@khawateendigest.com

شعاع کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

زندگی میں سب سے اہم بات جس پر ہمارے سارے اعمال کا دارومدار ہے، وہ نیت ہے۔ اگر حسن نیت کے ساتھ کام کیا جائے تو قدرت کامیابی عطا کرتی ہے۔ شعاع کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی سے سرفراز کیا لیکن کامیابی سے بڑھ کر جو بات ہمارے لیے اہم ہے وہ ہماری قارئین کا اعتماد ہے۔ بہنیں ہمیں خط لکھ کر، فون کرکے بتاتی ہیں کہ شعاع نے اس کی تحریروں نے ان کی زندگی میں ایک مثبت کردار ادا کیا۔ ایک اچھے استاد کی طرح سکھایا۔ ایک باشعور ماں کی طرح تربیت کی۔ زندگی میں انہوں نے شعاع سے بہت کچھ سیکھا۔ قارئین کا یہ اعتراف، یہ یقین ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں آپ کا اعتماد ہمیشہ حاصل رہے۔ آمین۔

سالگرہ نمبر،

آپ کے ہاتھوں میں جولائی کا شمارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور احسان ہے کہ اس شمارے کے ساتھ شعاع نے اپنی عمر عزیز کے چھبیس سال مکمل کر لیے ہیں۔ اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں مستقل سلسلوں کے ساتھ قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔

مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ شامل اشاعت ہو سکیں۔

قارئین سے سروے،

کردار نگاری کا کمال یہ ہے کہ انسان کوئی کہانی پڑھتے ہوئے خود ان کرداروں کے درمیان محسوس کرے۔ پڑھنے والے دل میں کرداروں کے لیے لگاؤ، محبت، اپنائیت یا نفرت اور غصے کے جذبات اس طرح ابھریں جیسے وہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار عموماً ہیروئن ہوتی ہے اور پوری کہانی کا تانا بانا اسی کے گرد بنا جاتا ہے۔ کہانی کا یہ مرکزی کردار ہر مصنف اپنے مشاہدہ، مطالعہ یا تخیل کے لحاظ سے تخلیق کرتا ہے۔ مختلف مصنفین کی تحریروں میں ہیروئن مختلف صفات سے جلوہ گر ہوتی ہے۔

- آسیہ رزاقی کی سنجیدہ، اصابرو شاکر، حالات سے سمجھوتہ کرنے والی، عنیزہ سید کی انٹیلیجنٹ لڑکی،
- نگہت سیما کی ذہین، پروقار اور سعادت مند،
- عمیرہ احمد کی شدت پسند، اپنے اصولوں پر اٹل، سمجھوتہ نہ کرنے والی، جذبوں کی انتہا کو چھوتی ہوئی،
- فرحت اشتیاق کی محبت و ایثار کا مجسمہ، اعلا تعلیم یافتہ،
- رفعت سراج کی بے مثال حسن اور تمکنت کی مالک،
- نگہت عبداللہ کی عام سادہ سی پرکشش لڑکی،
- ثمرہ بخاری کی خاموش طبع، غیر معمولی حساس، محبت میں شمع کی طرح چپ چاپ پگھلنے والی،
- نمرہ احمد کی مہم جو، وسیع مطالعہ کی حامل اپر کلاس کی لڑکی،
- عالیہ بخاری کی دلکش، سنجیدہ، سمجھ دار، خاندانی لڑکی،
- راحت جبیں کی رومانٹک اور فطرت کی رنگینیوں سے پیار کرنے والی اور
- کنیز نبوی کی حساس، محبت میں مر مٹنے والی، عشق حقیقی کی عارف،

سروے کا پہلا سوال اسی حوالے سے ہے۔

1- آپ نے شعاع میں ان تمام مصنفین کی تحریریں پڑھی ہوں گی۔ کس ہیروئن یا مرکزی کردار کو آپ نے اپنائیت کی نظر سے دیکھا، خود سے قریب محسوس کیا اور آپ کا اس سے دوستی کرنے کو دل چاہا اور کیوں؟ جس ناول، ناولٹ یا افسانے سے آپ نے یہ مرکزی کردار منتخب کیا اس کا نام اور اس کی مصنفہ کا نام بھی لکھیں۔

2- آپ کسی ایسی تقریب میں جائیں جہاں شعاع کی ساری مصنفین کا اجتماع ہو تو آپ کس مصنفہ سے کیا سوال کریں گی؟

جوابات کے لیے صفحات کی قید نہیں ہے۔ ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 جولائی تک موصول ہو جائیں۔ تین بہترین جوابات پر کتابوں کا تحفہ پیش کیا جائے گا۔

مجھے سرور ملا ہے، تیری ثنا کر کے
سدا قریب ہی پایا تجھے دعا کر کے

یہ کونپلیں، یہ شگوفے، یہ پھول، برگ و شجر
شگفتہ رہتے ہیں ہر دم تیری ثنا کر کے

کرم ہے تیرا، جو بھی دے دیا مجھ کو
میں دل اداس کروں کس لیے گلہ کر کے

خدا تو تو ہی ہے، کون و مکاں کا مالک
میں شعر کہتا ہوں بس تیرا آسرا کر کے

خطا کا پتلا ہوں اور وقت شام ہے مجھ پر
گزار دے میرے ایام دلربا کر کے

ترے اصول میں یکساں یہاں سبھی کے لیے
نجات پائی تھی یونس نے بھی دعا کر کے

یہ پھول حمد و ثنا کے کھلے رہیں سہراب
خدا قبول کرے اپنا واسطہ کر کے

سہراب جنگ لدھیانوی

قدرت کی آن والے، رحمت کی شان والے
تجھ پہ جہاں تصدق او پاک جان والے

دونوں جہاں کی نعمت ہے مٹھیوں میں تیری
بوسیدہ کپڑوں والے، ٹوٹے مکان والے

ایسے تھے آپ امی، کھولی زبان جس دم
دم بھر میں بے زباں تھے ساری زبان والے

روضہ پہ آئے صبا تو جا کر یہ عرض کر دے
مہجور کب تک آخر پاکستان والے

اک جنبش نگہ کے سب منتظر کھڑے ہیں
پر درد قلب والے، پرسوز جان والے

جگر مراد آبادی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

طاقت ور مومن

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کمزور مومن کی نسبت طاقت ور مومن بہتر ہے اور اللہ کو زیادہ پیارا ہے۔ اور سب میں خیر موجود ہے۔ جو چیز تجھے نفع دے سکتی ہے، اس کی (کوشش اور) حرص کر اور عاجز نہ بن۔ اگر تجھ پر (تیری مرضی کے خلاف) کوئی چیز غالب آجائے تو کہہ، یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ اس نے جو چاہا کیا۔ لفظ "اگر" سے بچ کیونکہ اگر سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔"

فوائد و مسائل: طاقت ور مومن اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو نیک کاموں کی انجام دہی (نیکیوں کے فروغ اور برائیوں کی راہ روکنے) میں خرچ کرتا ہے جب کہ کمزور آدمی بہت سے ایسے کام نہیں کر سکتا جو طاقت ور آدمی انجام دے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے طاقت ور مومن کمزور سے بہتر ہے۔

2۔ جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کے لیے جائز طریقے سے کوشش کرنا مستحسن ہے۔

3۔ جسمانی اور ذہنی قوتوں کو ظلم و زیادتی کے لیے استعمال کرنے سے پرہیز ضروری ہے ورنہ ایسا طاقت ور اللہ کو کمزور سے پیارا نہیں ہو گا بلکہ اللہ اس سے ناراض ہو گا۔

4۔ مومن دنیوی فوائد کے لیے محنت کرے تو اچھا ہے کیونکہ وہ انہیں نیکی کے کاموں میں استعمال کرے گا۔

5۔ اچھے مقصد کے حصول کے لیے پوری کوشش کرنا ضروری ہے لیکن اللہ پر اعتماد ہونا چاہیے۔ کامیابی ہو تو اللہ کا شکر ادا کیا جائے ورنہ سمجھ لیا جائے کہ ناکامی میں انسان کی کسی کوتاہی کو دخل ہے، یا یہ مطلوب چیز انسان کے لیے مفید نہیں اور اس کا نہ ملنا انسان کے لیے بہتر اور اللہ کا احسان ہے۔

6۔ ناکام ہونے والے منصوبے کی خامی سامنے آنے پر افسوس کو خود پر مسلط نہ کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ کاش یہ کام اس طرح کے بجائے اس طرح کیا جاتا، البتہ خامی تلاش کر کے آئندہ اس سے بچنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

7۔ شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ ناکامی کو بہت بڑا کر کے پیش کرتا ہے جس سے اللہ کی رحمت سے مایوسی یا اللہ کی ذات اقدس سے ناراضی اور شکوے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسان کی آخرت کو تباہ کرنے والی ہیں۔

8۔ بعض اوقات انسان اپنی ناکامی کا ذمہ دار کسی دوسرے انسان کو قرار دے دیتا ہے اور پھر حسد اور بغض کے جذبات کے تحت اسے نقصان پہنچانے یا بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بھی شیطانی عمل ہے۔

دانائی کی بات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دانائی کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ وہ اسے جہاں ملے اس کے لینے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔"

دو نعمتیں

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں اکثر لوگ خسارے کا شکار ہیں، صحت اور فراغت۔"

فوائد و مسائل:

1۔ (غبن) کا مطلب ہے اپنی چیز مناسب قیمت سے بہت کم قیمت پر بیچ دینا یا کوئی چیز مناسب قیمت سے بہت زیادہ قیمت پر خرید لینا۔ ایسا دھوکا وہی کھاتا ہے جسے اپنی چیز کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا، یا دوسرے کی چیز کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے عیب وغیرہ کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

2۔ صحت میں انسان بہت سی ایسی نیکیاں کر سکتا ہے جو بیماری میں نہیں کر سکتا لیکن غفلت کی وجہ سے یہ موقع ضائع کر دیتا ہے، اس طرح اپنے وقت کی صحیح قیمت وصول نہ کر کے گھاٹا پا لیتا ہے۔

3۔ ہم عام طور پر کہہ دیتے ہیں کہ فلاں نیکی نہیں کر سکا کیونکہ میرے پاس وقت نہیں، حالانکہ بہت دفعہ ہم اپنا وقت کھیل کود، لہو و لعب، ہنسی مذاق، غیبت وغیرہ اور فضول گپ بازی میں گزار دیتے ہیں۔ یا ایسے لٹریچر (کہانیاں، افسانے، ناول اور گندی شاعری وغیرہ) کے مطالعے میں ضائع کر دیتے ہیں جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو گیم وغیرہ پر وقت کا ضائع ہونا بہت واضح ہے، پھر کسی بھی کھیل کا میچ ہو رہا ہو تو چھوٹے بڑے سب ہی ضروری کاموں کو نظر انداز کر کے کمنٹری سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ ان فضولیات میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ایسی تفریح کو اختیار کرنا چاہیے جس سے کوئی فائدہ حاصل ہو۔ بہت سے غیر اسلامی تہواروں، مثلاً "بسنت" وغیرہ پر بے شمار وقت اور روپیہ ضائع ہوتا ہے اور طرح طرح کے گناہوں کا ارتکاب کر کے شیطان کو خوش کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں پر ان سے اجتناب کرنا فرض ہے۔

دین کی بات

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

"اللہ کے رسول! مجھے (دین کی باتیں) سکھائیے اور اختصار کیجیے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تو نماز پڑھنے کھڑا ہو تو ایسے نماز پڑھ جیسے تو دنیا سے رخصت ہونے والا ہو۔ اور کوئی ایسی بات نہ کہہ جس سے (بعد میں) معذرت کرنا پڑے اور لوگوں کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس سے پوری طرح مایوس ہو جا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ وعظ و نصیحت میں حسب موقع اختصار یا تفصیل سے کام لینا چاہیے۔

2۔ نماز کا پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نماز میں پوری توجہ اور انہماک ہو۔ دل اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو اور نماز میں جو کچھ پڑھا جائے، پوری طرح سوچ سمجھ کر اللہ کے حضور عجز و نیاز کی کیفیت کے ساتھ پڑھا جائے۔ ادب و احترام کے ساتھ کھڑے ہو کر غیر ضروری حرکتوں سے اجتناب کیا جائے۔

3۔ جب کسی انسان کو معلوم ہو کہ وہ تھوڑی دیر بعد دنیا سے رخصت ہونے والا ہے تو وہ اللہ کے سامنے انتہائی تضرع کا اظہار کرتا ہے اور خلوص سے دعا کرتا ہے۔ ہر نماز کو اسی طرح ادا کرنا چاہیے۔

4۔ بات کرتے وقت اس کے نتائج پر غور کر لینا چاہیے کیونکہ ایک دفعہ جو بات زبان سے نکل گئی وہ واپس نہیں ہو سکتی۔ بعض اوقات ایک غلط بات کے نقصانات لامحدود بھی ہو سکتے ہیں۔

5۔ دنیا میں انسان ایک دوسرے کے کام آتا ہے لیکن انسانوں کے دل بھی اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اس لیے امید بندوں سے نہیں، اللہ سے ہونی چاہیے۔ اسی سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ حاجت پوری کر دے، جیسے بھی اس کی حکمت و رحمت کا تقاضا ہو۔

حکمت کی بات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص حکمت کی بات سنتا ہے پھر اپنے (سنانے والے) ساتھی کی وہ بات (دوسروں کو) سناتا ہے جو سب سے بری ہو۔ (مثلاً" خطیب نے خطبے میں جو اچھی باتیں بیان کی ہیں' وہ دوسروں کو نہیں بتاتا' صرف یہ بیان کرتا ہے کہ آج خطیب نے فلاں بات ایسی کہی جو (غلط ہے) اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک آدمی ایک چرواہے کے پاس گیا اور کہا "چرواہے! اپنے ریوڑ میں سے مجھے ایک گوشت والی بکری دے دے (جسے ذبح کر کے میں گوشت کھا سکوں۔) چرواہے نے کہا۔ "جا کر ریوڑ کی بہترین (بکری) کا کان پکڑ لے۔" (اور لے جا۔)

وہ سائل گیا اور ریوڑ کے کتے کا کان پکڑ لیا۔"

تکبر سے بچنا اور فروتنی اختیار کرنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کے دل میں رائی کے ایک دانے جتنا بھی تکبر ہو گا' وہ جنت میں نہیں جائے گا اور جس کے دل میں رائی کے ایک دانے جتنا بھی ایمان ہو گا' وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔"

فوائد و مسائل : 1۔ سب سے بڑا تکبر حق کا انکار ہے۔ دوسروں کی خوبیوں کا انکار اور ان کی تحقیر بھی تکبر ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ تکبر کا مطلب حق بات کو ٹھکرانا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔

2۔ تکبر کی معمولی مقدار بھی اللہ کی ناراضی کا باعث ہے۔

3۔ جو شخص تکبر کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یا اللہ کے احکامات پر ایمان لانے سے انکار کرے گا' وہ جہنمی ہے۔ اگر کوئی شخص مال و دولت' حسن' طاقت' علم' نسب وغیرہ کی وجہ سے فخر کرتا ہے اور خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے تو یہ بھی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

بڑائی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ عزوجل فرماتا ہے' بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میرا تہبند ہے' جو شخص ان میں سے کوئی چیز بھی مجھ سے کھینچے گا' میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔"

فوائد و مسائل : 1۔ عظمت و کبریائی اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں۔ اگر مخلوق میں کسی کو وقتی طور پر محدود عظمت و شان حاصل ہے تو وہ اللہ ہی کی عطا کردہ ہے' لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ اس پر اللہ کا شکر کرے نہ کہ اپنی عظمت کا دعویٰ کرتے ہوئے تکبر کی روش اختیار کرے۔

2۔ تکبر کرنے والا گویا خدائی صفات کا حامل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے' اس لیے یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

3۔ انسان کی عظمت اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کا بندہ بننے میں ہے' فخر و تکبر میں نہیں۔

آگ

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اللہ پاک (کی خوشنودی) کے لیے ایک درجہ تواضع اختیار کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور جو شخص اللہ کے سامنے ایک درجہ تکبر اختیار کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس کا ایک درجہ کم کر دیتا ہے حتیٰ کہ (درجات کم ہوتے ہوتے یہ نوبت آجاتی ہے کہ) اسے سب سے نچلے طبقے میں ڈال دیتا ہے۔"

تین راتیں

حضرت سلمان بن صرد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے تو (ہماری یہ حالت تھی کہ) ہمیں تین رات تک کھانا میسر نہ ہو سکا۔"

شکر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گرم کھانا حاضر کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا۔ جب فارغ ہوئے تو فرمایا۔

"اللہ کا شکر ہے میرے پیٹ میں اتنے دن سے (تازہ اور) گرم کھانا نہیں گیا۔ (کھجور وغیرہ پر گزارہ رہا۔)

بستر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا' جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔"

فائدہ : مطلب یہ ہے کہ بستر عمدہ کپڑے کا نہیں تھا جس میں اون یا روئی بھری ہوئی ہو بلکہ چمڑے کا بستر بنا ہوا تھا' اس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی جو سخت اور ناہموار ہوتی ہے۔ لیکن چمڑے کی وجہ سے اس کی سختی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ اہل عرب چمڑے کو سادہ انداز سے تیار کرتے تھے جو نہ زیادہ قیمتی ہوتا تھا' نہ خوب صورت۔ اس لحاظ سے چمڑے کا بستر انتہائی سادگی کی مثال ہے۔

دین و دنیا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے۔ میں بیٹھ گیا' میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تہ بند پہن رکھا ہے' دوسرا کوئی کپڑا زیب تن نہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو پر چٹائی سے نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک طرف صرف تھوڑے سے جو تھے۔ غالباً" ایک صاع ہوں گے اور کیکر کے پتے تھے (جو چمڑے کے دباغت میں کام آتے ہیں) اور بغیر دباغت کھال لٹکی ہوئی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ابن خطاب! آپ کیوں روتے ہیں؟"

میں نے کہا "اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! میں کیوں نہ روؤں؟ اس چٹائی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں نشان پڑ گئے ہیں (کوئی نرم بستر بھی نہیں۔) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان رکھنے کی جگہ میں کچھ نظر نہیں آتا' سوائے اس (ایک صاع جو) کے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ادھر کسریٰ اور قیصر باغوں اور میووں میں (عیش کر رہے) ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے برگزیدہ ہیں' اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا توشہ خانہ ہے (جو خالی پڑا ہے۔)"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"خطاب کے بیٹے! کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ ہمیں آخرت مل جائے اور ان (قیصر و کسریٰ) کو دنیا۔"

میں نے کہا۔ "کیوں نہیں! (میں خوش ہوں۔)"

فوائد و مسائل : 1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کا مال جمع نہیں کیا بلکہ زہد اختیار فرمایا۔

2۔ گھر میں ایک دو وقت کی خوراک موجود ہونا زہد کے منافی نہیں۔

3۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے شدید محبت رکھتے تھے۔
4۔ کافروں کو ان کی نیکیوں کا معاوضہ دنیا ہی میں دنیوی سامان یا عیش و عشرت کی صورت میں مل جاتا ہے۔
5۔ مسلمان پر دنیوی تنگ دستی و زہد آخرت میں درجات کی بلندی کا باعث ہے۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) رخصت ہو کر میرے گھر آئیں' اس رات ہمارا بستر صرف ایک مینڈھے کی کھال پر مشتمل تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی گزران

حضرت ابو مسعود (عقبہ بن عمرو انصاری) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدقے کا حکم دیتے تو (ہماری یہ کیفیت ہوتی تھی کہ) ہم میں سے کوئی آدمی جا کر مزدوری کرتا اور ایک مد (کھجور یا جو وغیرہ) لے کر آتا (اور اسے صدقے کے طور پر پیش کر دیتا۔) آج تو ایک آدمی کے پاس ایک لاکھ کی رقم بھی موجود ہے۔
(ابو مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد) حضرت شقیق رحمتہ اللہ نے کہا۔ غالباً" ان کا اشارہ خود اپنی طرف تھا۔
فوائد و مسائل : 1۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہا سخاوت کے اعلا مقام پر فائز تھے کہ خود امداد کے مستحق ہونے کے باوجود امداد قبول نہیں کرتے تھے بلکہ اس مفلسی میں بھی محنت مزدوری کر کے خیرات کرتے تھے۔
2۔ صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے' حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو نام لے کر حکم نہیں دیتے تھے کہ خیرات کرو۔ تب بھی ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہم بھی اس کی تعمیل کرنے والوں میں شامل ہو جائیں۔
3۔ فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا اچھا بدلہ دنیا میں بھی خوش حالی کی صورت میں مل جاتا ہے۔
4۔ حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے حالات بیان فرمائے لیکن یہ وضاحت نہیں فرمائی کہ یہ میرا اپنا واقعہ ہے تاکہ یہ ریاکاری میں شامل نہ ہو جائے جب کہ ان کا مقصد سامعین کو اس نیکی کی ترغیب دلانا تھا' اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا اخلاص واضح ہے۔

صبر

حضرت خالد بن عمیر رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔ "ہمیں عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ نے منبر پر خطبہ دیا اور (اس میں یہ بھی) فرمایا۔
"میں نے دیکھا ہے کہ ہم سات افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہمیں کھانے کے لیے درختوں کے پتوں کے سوا کچھ بھی میسر نہ تھا۔ (ہم وہی کھاتے رہے) حتیٰ کہ ہماری باچھیں زخمی ہو گئیں۔"
فوائد و مسائل : 1۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ پر آنے والے سخت حالات ہمارے لیے صبر و استقامت کا سبق ہیں۔
2۔ منبر پر ایسے حالات بیان کرنے کا مقصد سامعین کو یہ سمجھانا ہے کہ اب جب کہ ہر قسم کی نعمتیں میسر ہیں' ان پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ان سے معمولی سی کمی پر شکوہ شروع نہیں کر دینا چاہیے۔

موم کی گلیاں

مصنف: بانو قدسیہ
تبصرہ: آمنہ زرّیں

اہلِ قلم اگر صاحب بصیرت بھی ہوں۔ تو یہ امتزاج ان کی تحریر کو دو آتشہ کر دیتا ہے۔ اور ہم جس قربِ قیامت کے دور میں جی رہے ہیں' وہاں بصارت پر اطلاعات طاری ہیں۔ جنہوں نے بصیرت پر دبیز پردے ڈال رکھے ہیں۔
کوئی ان اطلاعات سے چھٹکارا پائے بھی۔ تو کیونکر۔!
ایسے میں کسی عالم کی صحبت اختیار کرنے کا موقع نہ (ملے تو) کتاب کی صحبت اختیار کیجیے۔
کتاب آپ کے لیے آسانی پیدا کرتی ہے۔ سمجھنے۔ غور و فکر کرنے۔ جاننے اور جانا جانے کی خوشی عطا کرتی ہے۔!
بانو قدسیہ کی "موم کی گلیاں" مختصر سے حجم کی کتاب ہے۔ شاید اپنے مرکزی کردار "شہد کی مکھی" کی طرح۔
کارخانہ قدرت میں یوں تو کوئی چیز نکمی نہیں۔ یہ ہم ہیں جن کو ان کا اصل مصرف جاننے کی فرصت نہیں۔ لیکن شہد کی مکھی اپنے آپ میں ایک خاص چیز یوں بھی ہے کہ اس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ اور اس کی محنت سے حاصل ہونے والی کمائی کو شفا کہا ہے۔ تو یوں۔ جسے قرآن کریم نے شفا کہہ دیا' اس کی پاکیزگی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔
"موم کی گلیاں" ہم پر یہ راز منکشف کرتی ہے کہ ہم' جو دھڑا دھڑ شہد کی بوتلیں استعمال کرتے ہیں' دراصل وہ کس محنت' شفقت اور پاکیزہ طریقے سے مکھی ہمارے لیے اکٹھا کرتی ہے!
آہ۔ ہماری بے خبریاں۔!
کہانی میں جن کرداروں سے ہماری راہ و رسم استوار ہوتی ہے۔ ان میں' ابا میاں۔ اماں' خرم بھائی۔ عذرا۔ شیریں۔ اور "میں"۔
جی ہاں کہانی صیغہ واحد میں بیان کی گئی ہے۔
"میں' خرم بھائی اور عذرا آپس میں بہن بھائی ہیں اور ابا۔ اماں ان کے یونٹ کے سربراہ۔!
ابا کافی سخت گیر ہیں اور ان کی سخت گیری اولاد کی بہتری کے لیے نہیں۔ بلکہ اپنی ذات کی مرکزیت قائم رکھنے کے لیے ہے۔ نتیجتاً" ہم ایک ایسی قرابت داری کے تجربے سے آگاہ ہوتے ہیں۔ جس میں قربت نام کو نہیں' اور ابا کی سخت گیری پر دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ اف ابا۔ ذرا دیکھیے ابا کی گفتگو۔
"پھر یہ نواب زادے کہیں گے کہ باپ نے ان کے لیے کچھ نہیں کیا۔ کون سا شخص ایسا ہے' جو بہار کے دنوں میں اپنے بچوں کو پہاڑوں پر لے جاتا ہے؟ کون سا ایسا شاہ دل ہے جو اس بے دردی سے اولاد پر پیسہ بہاتا ہے۔ ان کو کیا؟ اس گھر میں تو بس ایک ہی آدمی کو لہو پسینہ ایک کرتا ہے۔ ایک کو ہی کولہو کے بیل کی طرح زندگی گزارنا ہے۔"
مختصر سی حیات کی اس کہانی میں ابا اسی بات کو مختلف الفاظ کے پیرایے میں دوہراتے ملیں گے۔
"خرم بھائی ملازمت نہ کر سکے۔ یہ ان کی نیت کا فتور نہ تھا بلکہ ان کی تربیت ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ وہ

تخیل کی دنیا میں رہنا پسند کرتے تھے۔ انہیں کتابوں سے عشق تھا۔ اندھیرے سے محبت تھی۔"

یہ خرم بھائی کا تعارف ہے اور اب ذرا ملاحظہ فرمایئے ان کا فلسفہ۔

"ابا جان! میں سمجھتا ہوں سب کچھ من جانب اللہ ہوتا ہے اور ہر انسان اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ کارخانۂ قدرت میں کوئی چیز بے کار نہیں۔ ہر انسان کا اپنا رنگ ہے اور اسے اپنے حصے کا کام کرنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اوروں کو کئی لوگ بے کار نظر آتے ہیں، جس طرح میرا وجود آپ کے لیے بے کاری کی ایک علامت ہے، اسی طرح ضروری نہیں کہ آپ کا کام میری نظروں میں بھی اہم ہو۔"

یہ حقیقت ہے کہ حقیقت پسند یا عملیت پسند لوگ بے کار رہنا پسند نہیں کرتے۔ نہ اپنا اور نہ ہی دوسروں کا، لیکن یہ ایک الگ حقیقت ہے کہ جس کو وہ حقیقت پسند ہونے کے باوجود تسلیم نہیں کرتے کہ دنیا یک رنگی کبھی نہیں ہو سکتی اور یہ تخیل ہی ہے جس کے کرشمے زندگی کو رنگ عطا کرتے ہیں۔

"مجھے ہمیشہ سے جانوروں سے عشق رہا ہے۔"

"اصل میں یہ ان کی جانداروں میں غیر معمولی دلچسپی ہی ہے، جو ہمیں شہد کی مکھی پر نادر، محیر العقول اور رنگا رنگ معلومات فراہم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ انہوں نے ایگریکلچر میں بی ایس سی کیا ہوا ہے اور بچپن سے جانوروں کی عادات اور روزمرہ زندگی کے اطوار جاننے کا شوق رکھتے ہیں۔

تخیل کی دنیا بھی عجب رنگ دنیا ہے۔ بچپن سے ہی انہیں حیاتیات کے متعلق جاننے کی جستجو تھی، جو آگے چل کر مطالعے، تحقیق اور دریافت کا باعث بنی۔ آپ کے بھی کام آئے گا۔ ایک نسخہ ملاحظہ کیجیے۔

"میں نے اپنی فرسٹ ایڈ جاری رکھی اور آہستہ سے کہا۔ جی نہیں شہد کی مکھی جہاں بھی لڑے، وہاں رگڑنا بڑا غیر مفید ہوتا ہے۔ اس طرح زہر سارے لہو میں چلتا ہے اور سوجن زیادہ ہوتی ہے۔ ابھی تھوڑا سا امونیا گھول کر لگادوں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی دوائیوں والی الماری کھولی، لیکن امونیا کی بوتل خالی تھی۔ ذرا سا سوڈا بائی کارب پانی میں ملایا اور روئی کے پھاہے کو تر کر کے گوالے کے بازو پر رکھ دیا۔

"شہد کی مکھی کا ڈنک اتنا زہریلا نہیں ہوتا، لیکن ہر جسم کی اپنی اپنی ساخت ہوتی ہے، اپنی اپنی طبیعت، بعض اوقات تو انسان شہد کی مکھی کے کاٹنے سے مر بھی جاتا ہے۔"

یہاں آپ کو مکھی کے ڈنک میں موجود مختلف زہروں کے امتزاج اور ان کے مختلف اثرات سے آگاہی ملے گی اور یہ کہ شہد کی ساری مکھیوں میں ڈنک نہیں ہوتا، صرف مادہ مکھی میں ہی ہوتا ہے۔

"صبح کی ہلکی دھوپ اخروٹ کے پتوں میں رینگ رہی تھی کہ اچانک میری نظر سامنے شہد کے چھتے پر پڑی۔ اگر مجھے شہد کی مکھیوں کا کچھ تجربہ ہوتا تو شاید میں [illegible] سے نظر کہاں ہٹنے لیتا۔"

لیکن آج میرے سامنے قدرت کی ایک مخلوق تھی جو صبح و شام محنت کرتی ہے، جو ایسی منظم زندگی بسر کرتی ہے جہاں سوشلسٹ، کمیونسٹ یا جمہوریت پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اخروٹ کی پتیوں میں ہولے ہولے بھنبھناتی قریباً" ساٹھ ہزار کی آبادی محو گردش تھی۔ کوئی سپاہی اس ٹریفک کے لیے مقرر نہ تھا۔"

یوں تو یہ دنیا عجائبات سے پر ہے اور فطرت کی کاری گری کا مظہر، مگر اس چھوٹی سی مخلوق کے اس قدر منظم، مستعد اور سرگرم ہونے کی داستان سن کر انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے، مگر وائے قسمت۔ نری حیرت ہی کرتا ہے سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔

"خود میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی کہ انڈا۔ عین یہ ہی مکھیوں کے چھتے کا حال ہے۔ چھتہ پہلے بنتا ہے کہ ملکہ مکھی پہلے جنم لیتی ہے؟ یہ

سلسلہ دراصل یوں شروع ہوتا ہے کہ ملکہ اپنے کارکنوں کو لے کر کسی ایسی جگہ کی تلاش میں چل کھڑی ہوتی ہے، جہاں پہنچ کر وہ اپنا گھر تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ کارکن مکھیاں ہر جگہ اڑتی پھرتی ہیں اور پھولوں کا پولن جمع کرتی ہیں۔ آج تک سائنس دان سمجھ نہیں پائے کہ کس طرح یہ زرگل موم میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر یہ ہی موم کس طرح شہد کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ تمام مکھیاں اپنے اپنے حصے کا زرگل سمیٹ کر ملکہ کے اردگرد آ بیٹھتی ہیں اور اٹھارہ سے چوبیس گھنٹے تک اسی جگہ پر بیٹھی رہتی ہیں، پھر ہر مکھی کے پیٹ پر سے چھوٹی چھوٹی جھلی نما پرت اترنے لگتی ہے۔ موم بنانے والی کارکن مکھی کے پیٹ تلے۔ قدرت نے چار جھلیاں [illegible] رکھی ہیں جن میں وہ ان جھلیوں کو رکھ کر موم بناتی ہیں۔ یوں ہی تمام مکھیوں کے موم [illegible] خانے ابھرتے ہیں۔ ایک ماہر مکھی [illegible] بڑھتی [illegible] فرش رکھتی، دائیں بائیں دیکھے بغیر وہ جگہ کا انتخاب کرتی ہے۔ پھر اپنے منہ اور تالوں سے وہ موم کا ایک ریزہ اپنے پیٹ سے چپکے ہوئے آٹھ ریزوں میں سے علیحدہ کرتی ہے اور اسے اپنے لعاب سے پلستر لگا کر اور سیدھا کر کے پہلا وہ جماتی ہے۔ پہلی مکھی یوں ہی سنگ بنیاد رکھ کر پلٹتی ہے، ایک اور مکھی بڑھتی ہے اور اپنا قیمتی ریزہ نہایت سلیقے سے جما آتی ہے، اگر اسے پہلی مکھی کے کام میں کچھ نقص نظر آتا ہے تو وہ احسان جتائے بغیر اسے درست کر دیتی ہے۔ ہولے ہولے موم کا ایک تودا یہاں جمع ہو جاتا ہے اور اصل عمارت کا نقشہ بننے کی آس بندھتی ہے۔ بیشتر سائنس دانوں کو یہ بات متحیر کیے ہوئے ہے کہ جب بھی یہ حجرے تعمیر کیے جاتے ہیں ان کی عمارت چھ گوشیہ ہی ہوتی ہے۔"

یہاں آپ کو چھتے کی تعمیر، عمارت کے چھ گوشیے ہونے کے سبب، مقاصد اور عوامل کی مکمل تفصیل جہان حیرت میں لے چلے گی۔

"مجھے مکھیوں پر تعجب آرہا تھا۔ ہم لوگ ان کے سامنے کتنے خود غرض اور کاہل تھے۔ ہم کسی کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے، کیونکہ ہمارے دل کا چور بیت المال پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ تو خیر بہت مشکل کام ہے، ہمیں تو شہر بسانا بھی نہیں آتا۔ ہم نے پنکھے ایجاد کر لیے ہیں، برف خانے بنالیے ہیں، لیکن اکثریت کے گھر نہ سردیوں میں گرم ہیں، نہ گرمیوں میں ٹھنڈے۔ یہ ننھی منی جانیں ہیں، لیکن اپنے شہر کو ہمیشہ حرارت سے بچاتی ہیں۔ گرمیوں کے تپتے دنوں میں بھی ان کا موم گھر کبھی نہیں پگھلا، قطار اندر قطار کھڑی اپنے پروں سے ایسے۔ پنکھا جھلتی رہتی ہیں کہ پر نظر بھی نہیں آتے۔ باہر چاہے برف پڑے، چاہے آگ برسے، اندر وہی ایک معتدل سہ پہر کا سماں ہوتا ہے۔"

"اتنی لاتعداد مکھیاں ہر لحظہ زرگل لاتی ہیں، موم اور شہد کی دنیا میں کتنا گند جمع ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ لگا لیجیے، لیکن یہاں کے خاکروب کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ رہتے۔ ادھر کچھ گرا ادھر انہوں نے سمیٹا۔ ہوا کے جھونکوں سے جو ریت اور پتے اندر آجاتے ہیں انہیں فی الفور اٹھا لیا جاتا ہے۔ سردیوں میں جب ژالہ باری ان مکھیوں کو باہر نہیں نکلنے دیتی تو یہ صفائی پسند مکھیاں ہزاروں کی تعداد میں مر جاتی ہیں، کیونکہ اردگرد پھیلا ہوا کوڑا کرکٹ ان کی صحت کے لیے بہت مضر ثابت ہوتا ہے۔"

"میں یہ ہی سوچتا ہوں، مگر بالکل میری طرح ہر گھر میں ایسے ہی جوان ہوں گے جو اصطبل کے سانڈوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ کھالیا، سولیا، جہاں کپڑے بدلے، پرانے جامے کو اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ جس شیشی کا ڈھکن کھولا، پھر کبھی واپس نہ لگایا، خط پڑھا اور پرزے پرزے کر کے فرش پر پھینک دیا۔ یہ اس لیے کہ ہر گھر میں کارکن مکھیوں کا ایک چپ چاپ دستہ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔"

"یہ حضرت بھی۔۔۔ بھی ہمہ وقت دوست احباب، بہن بھائی سے شہد کی مکھی کے حالات زندگی پر گفتگو

کرتے رہتے ہیں۔"

"یعنی یہ عذرا۔" میں نے سونف کے دانے منہ میں ڈال کر کہا۔ "شہد کی مکھی کو جاننے کے لیے ایک عمر درکار ہے، مکھی گروہ میں رہتی ہے، ٹکڑیوں میں اڑتی ہے، کبھی یوں نہیں ہوتا کہ ایک مکھی اٹھے اور کہے، دیکھو! یہ کام میں نے کیا ہے، یہ امرت میں لائی ہوں، یہ زر گل میرا ہے، اپنی ننھی منی ٹوکریوں میں وہ پھولوں کا زیرہ اکٹھا کر لاتی ہیں۔ ان کی محنت، مستقبل کے لیے، باقی قوم کے لیے، آنے والے بچوں کے لیے ہے۔"

عذرا نے دلچسپی سے پوچھا۔ "تو یہ مکھیاں ہمیشہ گروہ میں کام کرتی ہیں کیا؟ کیا ان کی ذاتی اغراض نہیں ہوتیں؟"

"ان کی تمام ذاتی اغراض ایک نقطہ پر مرکوز ہیں اور وہ نقطہ ہے مستقبل۔ ایک چھتے میں اپریل سے لے کر ستمبر تک قریباً چھ من شہد تیار ہوتا ہے۔ ایک بوند شہد کے لیے قریباً تین سو پھولوں کا زر گل ڈھونڈنا پڑتا ہے اور ہر مکھی قریباً 2 منٹ بعد اپنی ٹوکری بھر کر گھر لوٹتی ہے۔"

"مزا آرہا ہے نا؟"

"جی۔"

شہد کی مکھی کے فضائل و مناقب جان کر ایک لمحے کے لیے تو شہد کی مکھی ہونے کو جی چاہتا ہے، مگر پھر وہ ہی وجود کی موجودیت کہ ہم تو اپنے خالق کی وہ تخلیق ہیں، جس کے لیے اس نے کائنات کو مسخر کر رکھا ہے، تو ہمیں خود پہ ناز سہی کیا اپنے خالق پر بھی ہے؟

شہد کی مکھی کی منظم گروہی زندگی، انفرادی جدوجہد، صفائی پسندی، چھتے کی جگہ کا انتخاب، تعمیر، حفاظت اور پھر افزائش نسل کی انوکھی داستان آپ کو حیرت کے اس جہاں میں لے جاتی ہے جس کی بنیاد حقیقت ہے۔

بہرحال! "موم کی گلیاں" میں شہد کی مکھی کے ساتھ ساتھ گھریلو معاملات بھی مد و جزر کا شکار ہوتے ہیں اور وجہ وہی ہے ابا حضور کی سرمایہ دارانہ تسلط پسند سوچ اور اولاد کے ناپسندیدہ اور نکما ہونے کا شعور۔

گو کہ کتاب میں شہد کی مکھی کی حیات کا ہر پہلو زیر بحث ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ انسانی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

خرم بھائی کی شیریں میں دلچسپی اور حصول تمنا میں ناکامی کا قصہ اپنے بیان میں مختصر سہی مگر اثر پذیری میں اتنا مختصر بھی نہیں۔ وجہ جان لیجیے۔

"اگر خرم کا یہ خیال ہے کہ ٹھیکے دار صاحب کسی نکھٹو اور کاہل فلسفی کو اپنی بیٹی سپرد کریں گے تو یہ خیال خام ہے۔ خرم کی جو بھی عزت ہے وہ میرے وجود سے ہے جہاں بھی اس کی شادی ہوگی میری وجہ سے ہوگی۔"

"جی۔"

"وہ نوٹ کر لے۔" "اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔ لڑکی کا تعاقب کرنا لچے کمینوں کا کام ہے۔ تم جانوروں کی دنیا میں رہتے ہو کہیں ان سے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ سیکھ لینا۔"

جی میں تو آئی کہ کہوں ابا جان! ہم جانوروں سے کچھ سیکھ سکتے تو کیا اس گفتگو کی نوبت آتی؟ لیکن میں نے اور بھی سر جھکا کر کہا "جی۔"

پس "موم کی گلیاں۔" فطرت کی نادر تخلیق کی ان خدمات کا تذکرہ ہے جو وہ حضرت انسان کی لذت دہن کے لیے سرانجام دینے پر مامور ہے۔

اور ایسے میں مجھے لگتا ہے کہ اس مخلوق کی عزت ہم پر واجب ہو جاتی ہے اور شکریہ بھی۔ بانو قدسیہ کا بھی کہ جن کے ذہن رسا نے تحقیق جیسے دقیق عمل کو ہمارے لیے آسان اور دلچسپ قالب میں ڈھال دیا۔

اور اپنے خالق کا بھی۔ جو کائناتی مظاہر پر غور کرنے کو عبادت سے افضل قرار دیتا ہے۔

آپ کو پتا ہے کیوں؟

اس لیے کہ غور و فکر اور تدبر کے بعد خدا کی جو ہیبت دل میں سماتی ہے، کبھی کبھی عبادت کی ریاضت سے بڑھ جاتی ہے۔

☆

حریم فیصل اور فیصل خان

شاہین رشید

شادی کے لیے کہا جاتا ہے۔

"یہ ایک ایسا بندھن ہے جو دو شریف شہریوں کو خوامخواہ لڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

بات تو کسی حد تک درست ہے۔ دو انجان لوگ جب ایک بندھن میں باندھ دیے جاتے ہیں تو دونوں ہی نہ صرف ایک دوسرے کے مزاجوں سے ناواقف ہوتے ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کے گھروں کے ماحول سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے شادی کے ابتدائی دنوں میں دونوں طرف سے کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہوتی ہے۔

خیر ایسا تو ہر گھر میں ہوتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مزاج اور ماحول سے آشنا ہو جاتے ہیں اور زندگی سیدھے اور خوشگوار راستے پر چل پڑتی ہے۔ بس ایک بات ہے اس نئے رشتے میں لڑکی کو صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے اسی میں اس کی بہتری ہوتی ہے۔

تحریم زبیری شوبز کا معروف نام ہیں۔ اچھی پرفارمر ہیں۔ کم کام کرتی ہیں مگر لاجواب کرتی ہیں۔ آج کل آپ انہیں جیو سے پیش کی جانے والی سیریل "تم ہو کہ چپ" میں دیکھ رہے ہیں اور ان کا کردار کافی مقبول ہو رہا ہے۔

"تحریم زبیری جو اب تحریم فیصل خان کہلاتی ہیں۔ 23 جولائی 2008ء کو رشتہ ازدواج میں بندھیں اور 8 مئی 2009ء کو ماں جیسے عظیم رتبے پر فائز ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹی سے نوازا' جس کا نام انہوں نے نویا حسن خان (Noya Hasan Khan) رکھا ہے۔

تحریم کا تعلق اگرچہ کراچی سے ہے مگر ان کی مادری زبان پنجابی ہے۔ یہ چار بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔

اسی طرح فیصل خان کا تعلق افغانستان سے ہے۔ وہ لوگ جو انڈیا گئے اور روہیل کھنڈ فتح کیا' روہیل کھنڈی کہلاتے ہیں۔ افغانستان میں دو قبیلے تھے ایک خٹک اور ایک یوسف زئی ــــ فیصل کے والدین کا تعلق ان دونوں قبیلوں سے تھا اور وہ آپس میں رشتے دار بھی تھے' یعنی کزن تھے۔ ان کے والد 50 کی دہائی میں پاکستان آگئے تھے۔

"جی فیصل صاحب! کیسے ہیں آپ؟ آپ کا ایک ڈرامہ دیکھا تھا "بول میری مچھلی" بہت اچھا رول کیا تھا آپ نے۔"

"بس جی' وہ تو ایسے ہی ایک رول کر لیا تھا۔ کیمرے کے سامنے تو میں کبھی کبھار ہی آتا ہوں۔ زیادہ تر تو میں کیمرے کے پیچھے رہ کر ہی کام کرتا ہوں۔ میرا کام ڈائریکشن اور پروڈکشن کا ہے اور آج کل تو برانڈڈ شو (Branded) زیادہ کر رہا ہوں کیونکہ یہ چینل والے تو پیسے بہت دیر میں دیتے ہیں۔"

"اچھا ــــ یہ شکایت تو خیر سب کو ہی ہوتی ہے۔ ویسے فیلڈ کیسی ہے؟ مزا آرہا ہے؟"

"جی بالکل۔ فیلڈ اچھی ہے اور مزا بھی آرہا ہے اور میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے یہی فیلڈ پسند کی تھی۔ میں جب کامرس کا طالب علم تھا تو مجھے میوزک سے بہت لگاؤ تھا۔ میوزک چینل چارٹ کے زمانے میں میرا بینڈ تھا اور میں نے دو ویڈیوز بھی ریلیز کیے تھے اور پھر 2007ء میں بھی میں نے دو ویڈیو ریلیز کیے۔ میری فیملی میرے لیے بہت پریشان رہتی تھی کہ اس کو تو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے پڑھائی سے تو یہ کیا کرے گا۔ شاید اس زمانے میں اس فیلڈ کا کوئی اسکوپ ہی نہیں تھا مگر اب یہ فیلڈ باقاعدہ ایک پروفیشن بن گئی ہے۔"

"آپ اس فیلڈ میں بہت کچھ کر رہے ہیں' اس کے بارے میں بھی ان شاء اللہ آپ سے انٹرویو کریں گے۔ آج تو "بندھن" کے سلسلے میں کچھ گھریلو باتیں ہو جائیں؟"

"جی بالکل ـــ ضرور۔"

"تحریم سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟"

"میرا ایک شو تھا "سوزی" ایک مجھی ٹی وی چینل سے آتا تھا۔ اس شو کو میں ہی لکھتا تھا' میں ہی ڈائریکٹ بھی کرتا تھا اور ہوسٹ بھی میں ہی کرتا تھا۔ میرے اس پروگرام میں اعجاز اسلم اور فیصل قریشی ہوتے تھے۔ ہم تینوں کی ٹیم تھی اور یہ مقبول پروگرام "سوفٹی" کی پیروڈی تھا۔ اس میں بحیثیت مہمان تحریم نے شرکت کی' میں نے اپنے پروڈیوسر سے پوچھا کہ آج کون مہمان ہے تو اس نے کہا کہ ایک لڑکی ہے۔ تحریم نام ہے" اس نے ایک فلم میں بھی کام کیا ہے۔ میں نے سوچا ہوگی کوئی نخرے والی ہیروئین' یہ آئیں شو کیا اور چلی گئیں۔ آٹھ دس مہینے گزر گئے۔

پھر الیکشن کا دور آیا تو میں ایک سیریز کر رہا تھا "میں بنوں گا منسٹر" اسے میں لکھتا بھی تھا اور ہوسٹ بھی کرتا تھا ـــ ایک طرح سے کامیڈی شو تھا۔ اس پروگرام میں تحریم کو بلایا گیا ـــ یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی۔ پھر وقتاً فوقتاً ملاقاتیں ہوتی رہیں کام کے سلسلے میں۔ ان کے علاوہ ہمارے درمیان کچھ نہیں تھا لیکن میرا دل ان کی طرف کھنچتا تھا تو ایک دن میں نے ان سے دو ٹوک بات کی۔ میں نے کہا۔

"دیکھو میں نے کوئی افیئر نہیں چلانا کیونکہ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں قبول ہے تو مجھے سوچ کر بتا دینا کیونکہ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور میرے بڑے بھائی میرے لیے والدین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ان کو تمہارے گھر بھیجوں گا لیکن اگر تمہیں قبول نہیں تو ہم اپنی دوستی خراب نہیں کریں گے۔"

اس بات کو ایک مہینہ گزر گیا۔ نخرے' گھما پھرا کر بات کرنا ــــ ٹال مٹول وغیرہ وغیرہ۔ پھر میں لاہور چلا گیا۔ ہاں بات چیت ہماری ہوتی رہتی تھی۔ اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ بندہ سیریس ہے مذاق نہیں کر رہا۔ پھر ایک دن میں نے دوبارہ فون پر بات کی تو اس نے بہت بھرم دکھائے کہ ہمارا فلاں ملک سے باہر رہتا ہے فلاں بھی اور بھی کئی بھرم دکھائے تو مجھے غصہ آگیا ــــ اور میں نے تلخی سے کہا۔

"کیا تم نے مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے۔ اگر تمہیں پرپوزل قبول نہیں ہے تو انکار کر دو ــــ اور ختم کرو یہ قصہ' میں کوئی تم سے کوئی مذاق یا ٹائم پاس تو نہیں کر رہا۔"

اور میں نے صاف کہہ دیا۔

"اب میں بات نہیں کروں گا۔ جو بھی فیصلہ ہو مجھے بتا دینا۔" میں نے بات چیت بند کر دی۔

ان دنوں یعنی بات چیت سے کچھ ہی عرصہ پہلے تحریم کے والد کا اچانک انتقال ہوا تھا اور ان کے سارے رشتے دار باہر سے آئے ہوئے تھے' دو دن کے بعد میں کراچی آیا اور آخر بات پکی ہو ہی گئی۔"

"شادی کے بعد آپ نے انہیں کیسا پایا؟"

"شادی کے بعد کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ انہیں میں نے کافی میچور پایا۔ شادی کے بعد ہمارا رشتہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔ یک طرفہ محبت والا کوئی چکر نہیں تھا اور پھر جب ہماری بیٹی ہو گئی تو ہمارا رشتہ اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا ہے اور مزید گرو کر رہا ہے۔"

"تحریم روایتی بیوی کی طرح خیال رکھتی ہیں۔ سگھڑ ہیں' کیونکہ ظاہر ہے کہ وہ ایک آرٹسٹ بھی ہیں۔"

"ہم چار بھائی ہیں کوئی بہن نہیں ہے' تو ہمارا لائف اسٹائل ذرا مختلف قسم کا تھا' اس لیے ہمیں کھانا پکانا بھی آتا ہے اور دیگر کام بھی با آسانی کر لیتے ہیں یعنی جو کام ایک لڑکی کر سکتی ہے' وہ سارے ہم کر لیتے تھے بلکہ امی نے کروائے تو ہمارے دماغ میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ بیوی آئے گی تو کام آسان ہو جائیں گے۔ ہاں' بحیثیت بیوی تحریم بہت اچھی ہے' بہت خیال رکھتی ہے ــــ جس طرح ایک بیوی کو ہونا چاہیے ــــ پہلے یہ کافی کام کرتی تھی مگر اب صرف منتخب کام کرتی ہے کیونکہ اب اسے اپنے گھر کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ اسے گھر چلانے کے لیے تو کام کرنا نہیں ہے' بس شوقیہ کرتا ہے ــــ تو وہ گھر کو اور اپنی فیلڈ کو بہت اچھے طریقے سے متوازن رکھتی ہے' یہ بہت اچھی کوالٹی ہے اس میں۔"

"شادی بے شک حکم خداوندی ہے لیکن اگر شادی نہ ہو تو کیا مسائل جنم لیتے ہیں؟"

"یہ انسان کی نیچر پر منحصر ہے۔ کچھ لوگ Isolated (تنہائی پسند) ہوتے ہیں جیسے شعیب اختر' سلمان خان وغیرہ اور کچھ لوگ ہوتے ہیں' جو اپنے آپ کو مکمل کرنا چاہتے ہیں' ان میں سے ایک میں بھی ہوں میں چاہتا تھا کہ' میری فیملی ہو' ایک مکمل خوشگوار زندگی ہو۔"

"مگر انسان تو کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے' جب انسان غیر شادی شدہ ہوتا ہے تو کہتا ہے' یار یہ بھی کوئی زندگی ہے کچھ نیا ہونا چاہیے زندگی میں اور جب شادی ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ نہیں یار پہلے والا دور زیادہ اچھا تھا ــــ یہ رویہ اب ہماری زندگی کا خاصہ بن گیا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر آپ اپنے فیوچر کے بارے اور اپنے مقاصد میں

ووکس نہیں ہو سکتے۔ پرفیکٹ لائف اور پرفیکٹ ریلیشن کسی کا بھی نہیں ہوتا۔"

"آپ کے رسم و رواج اور تحریم کے رسم و رواج میں کوئی فرق پایا آپ نے؟"

"اب رسم و رواج رہ بھی کہاں گیا ہے۔ گزشتہ دنوں مجھے کچھ شادیوں میں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک فلور بنایا گیا تھا، وہاں گھر کے بچے بچیاں باقاعدہ کوریوگراف پرفارمنس دے رہے تھے جیسے فلم میں ہوتی ہیں، جیسے شاہ رخ کی فلم میں شادی کا گانا ہوتا ہے، ویسے ہی ڈریسز، ویسے ہی ریہرسل اور پرفارمنس اور چاروں طرف لوگ دیکھنے والے۔ تو کہاں رہے اپنے رسم و رواج، بس اب لوگ شادی کو انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ کی بیٹی ماشاء اللہ دو سال کی ہو گئی ہے اس کی تربیت میں زیادہ وقت کون صرف کرتا ہے؟"

"میری تربیت تو لاڈ پیار کی ہے۔ کھیلنا کودنا، مزے کرنا اور تحریم کہتی ہے کہ ایسا مت کیا کریں، بچے بگڑ جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں، کچھ نہیں ہو گا۔ وہ اگر ذرا سا ڈانٹ دے تو میں بہت ناراض ہوتا ہوں کہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

تحریم فیصل خان

"کیسی ہو آج کل تمہارا ڈرامہ سیریل "تم ہو کہ چپ" دیکھ رہے ہیں۔ رسپانس تو اچھا مل رہا ہو گا؟"

"جی... لوگ بہت پسند کر رہے ہیں اور مجھے خود بھی مزا آیا یہ رول کر کے۔"

"اب کام کم کرتی ہو، وجہ؟"

"وجہ تو صاف ظاہر ہے۔ ماشاء اللہ میری فیملی ہے۔ ایک عدد پیاری سی بیٹی ہے۔ فیصل بھی مصروف رہتے ہیں۔ اگر میں بھی کام کرنے لگ جاؤں تو آپ ہی بتائیں کہ بیٹی کتنی ڈسٹرب ہو جائے گی۔"

"یہ تو ہے... جوائنٹ فیملی والا کوئی سسٹم نہیں ہے؟"

"نہیں جی... کہاں۔ فیصل کے والدین حیات نہیں ہیں۔ بس ان کی بہنیں ہیں، بھائیوں میں کوئی امریکہ تو کوئی لاہور... بس ایک یہ ہی یہاں ہیں... تو جوائنٹ فیملی والا کوئی چکر نہیں ہے۔"

"پنجابی میں ایک مثل مشہور ہے کہ (سس نہ نیناں تے آپ کڑی پردھان) نہ ساس نہ نند اور لڑکی کا راج... تو تمہارا ابھی یہی حال ہو گا۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں، مجھے تو جوائنٹ فیملی بہت پسند ہے... میرا تو بہت دل چاہتا ہے کہ بہت سارے لوگ ہوں جو مل جل کر پیار محبت سے رہیں اور ایک ہی دسترخوان لگے اور سب ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں۔"

"بہت اچھی سوچ ہے تمہاری اور وہ بھی آج کے دور میں... کیوں پسند ہے تمہیں جوائنٹ فیملی...؟"

"ایک تو مل جل کر رہنا اچھا لگتا ہے۔ میرا ننھیال اور ددھیال سب دور دور رہے تو میرا بڑا دل چاہتا تھا ان کے قریب رہنے کا۔ دوسری بات یہ کہ مل جل کر رہنے سے بچوں کو رشتوں کی پہچان ہوتی ہے، پھوپھی، چاچو، دادی، دادا، پھپھو اور پھر بڑوں کی تربیت۔ کیونکہ وہ جس انداز میں بچوں کی تربیت کر سکتے ہیں ہم نہیں۔ ان کے پاس تجربہ ہوتا ہے۔ ہمارے پاس تجربہ نہیں ہوتا۔"

"شادی سادگی سے ہوئی یا خوب ہلا گلا ہوا؟"

"شادی سادگی سے ہوئی کیونکہ شادی سے دو ماہ پہلے میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور ہم سب بہت زیادہ اپ سیٹ تھے۔ بس ان ہی کی طرف سے کچھ رسمیں ہوئی تھیں۔"

"کوئی رسم جو انجوائے کی ہو یا عام رسموں سے مختلف ہو؟"

"رسمیں تو سب ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ وہی مایوں، مہندی اور ڈھولکی ہلا گلا وغیرہ۔ ہاں ایک رسم میرے لیے نئی تھی، وہ یہ کہ جب میں رخصت ہو کر سسرال آئی تو آتے ہی میری "گود بھرائی" کی رسم ہوئی۔ یہ ایک نئی رسم تھی۔"

"آپ دونوں میں اچھا کون لگ رہا تھا؟"

"اچھا... ہر ایک اپنے حساب سے بہت اچھے لگ رہے تھے اور میں اپنے حساب سے اور چونکہ میرا اپنا بیوٹی پارلر ہے تو میں وہیں سے تیار ہوئی تھی اور جب میں نے اپنے آپ کو دیکھا تو احساس ہوا کہ میں تو بہت اچھی لگ رہی ہوں۔"

"پہلے دن کا جوڑا کسی ڈیزائنر کا تھا؟"

"نہیں جی... میں خود بہت اچھی ڈیزائنر ہوں، اس لیے Branded جوڑے کو ترجیح دینے کے بجائے میں نے اپنے پہلے دن کا جوڑا خود ڈیزائن کیا تھا۔ شادی کی تیاریاں تو میں نے کی تھیں لیکن میں اپنے والد کی وجہ سے بہت افسردہ تھی کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہو رہے ہوتے۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا... اور ہنی مون منایا تھا؟"

"منہ دکھائی میں سونے کا سیٹ ملا تھا۔ فوری طور پر ہنی مون کے لیے نہیں جا سکے کیونکہ ایک تو میرا پروگرام شروع ہونے والا تھا اور پھر مہمان بھی کافی آئے ہوئے تھے تو سوچا کہ فراغت ہو جائے پھر جائیں گے اور جب فراغت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اولاد کی خوش خبری سنا دی۔ ہاں! بیٹی کے بعد ہم گھومنے پھرنے ملک سے باہر گئے تھے۔"

"فضول خرچ کون ہے۔ فیصل بتا رہے تھے کہ وہ فضول خرچ ہیں جب کہ تم نہیں ہو؟"

"ہاں جی... فیصل فضول خرچ ہیں۔ انہیں کوئی چیز پسند آ جائے تو خریدے بنا نہیں رہ سکتے۔ میں بھی فضول خرچ ہوں مگر ان سے کم۔ مجھے گھر سجانے اور نئی نئی چیزیں لانے کا شوق ہے۔"

"گھر کا بجٹ کس کے ہاتھ میں ہے؟"

"ہے تو میرے ہی ہاتھ میں لیکن بجٹ بنانے کی ضرورت ہی کہاں پیش آتی ہے، چھوٹی سی تو فیملی ہے، اس کے لیے کیا بجٹ بنانا۔ ہاں، مہنگائی بہت ہے اس لیے سنبھل کر ہی خرچ کرتے ہیں۔"

"ان کی کوئی اچھی اور بری عادت بتاؤ اور گھر میں نوکر چاکر ہیں یا خود ہی کام کرتی ہو؟"

"تین سال ہو گئے ہیں شادی کو اور اللہ کا بڑا شکر ہے کہ ہماری زندگی بہت خوشگوار گزر رہی ہے۔ مجھے ان میں ایسی کوئی بری عادت نظر نہیں آئی جو میں آپ کو بتا سکوں... سب سے اچھی عادت تو یہ ہے کہ وقت کی پابندی کرتے ہیں۔ جس ٹائم پر گھر آنے کا کہتے ہیں، اس سے پندرہ بیس منٹ پہلے ہی آ جاتے ہیں اور جہاں تک نوکر چاکر کی بات ہے تو وہ تو ہر گھر میں ہوتے ہیں۔ البتہ ناشتہ اور کھانا میں زیادہ تر خود ہی بناتی ہوں اور یہ بھی میرے ساتھ گھر کے کاموں میں بہت مدد کرتے ہیں۔"

"آپ دونوں میں لڑائی جھگڑا ہوتا ہے؟"

"بالکل ہوتا ہے اور ہر گھر میں ہوتا ہے۔ لڑائی جھگڑا بھی زندگی کا ایک حصہ ہے... ہمارے درمیان بھی لڑائی ہوتی ہے مگر ذرا پڑھے لکھے انداز میں اور پھر صلح بھی ہو جاتی ہے۔"

"صلح میں پہل کون کرتا ہے اور غصے کا تیز کون ہے؟"

"فیصل ہی صلح میں پہل کرتے ہیں۔ بہت ہی اچھے انسان ہیں اور جب کہ میں غصے کی تیز ہوں۔ انہیں زیادہ غصہ نہیں آتا... مجھے غصہ آتا ہے تو میں بات دل میں نہیں رکھ پاتی، سب کچھ منہ پر کہہ دیتی ہوں۔"

"بہت تعریف ہو گئی... اگر خدانخواستہ کوئی دوسری پسند آ گئی تو!"

"نہیں نہیں، میں بلاوجہ تعریف نہیں کر رہی۔ اول تو ایسا ہو گا نہیں، پھر بھی اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اسلام نے اجازت دی ہے اگر یہ دونوں کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہیں، زندگی کو بیلنس رکھ سکتے ہیں تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے فیصل اور تحریم سے اجازت چاہی۔

☼

رضیہ جمیل

خط کہانی

ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار کراچی۔
Email: [illegible]

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ سب کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو ان "دہشت گردوں" سے محفوظ رکھے جو بے گناہ لوگوں کو نشانہ بنا کر شہید کر رہے ہیں۔ ان کے ناپاک ارادوں کو ناکام بنائے اور انہیں ہمیشہ نامراد رکھے۔ آمین۔
اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔
گزشتہ ماہ نایاب جیلانی کی کہانی "دوسرا پہر" شائع ہوئی تھی۔ کچھ قارئین نے اس کہانی کے کرداروں کی حقیقت کے بارے میں سوالات کیے۔ نایاب جیلانی نے اس خط میں ان سوالات کی وضاحت کی ہے۔
اس ناول کو لکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر کیا ہوا؟ بس گرما کی ایک طویل ترین دوپہر میں اخبار بینی کرتے ہوئے ایک خبر پر نظر گویا ٹھہر گئی تھی۔ بعض لمحے ایسے طلسماتی ہوتے ہیں کہ ان کے زیر اثر کچھ نہ کچھ تخلیق کر دیا جاتا ہے۔ میرا ذہن اسکول کے زمانے میں چلا گیا جب کچھ کلاس فیلوز نے ایسا ہی واقعہ سنایا تھا۔ ذہن کے گوشوں میں محفوظ یہ واقعہ نہ جانے کیسے یاد آ گیا۔ اس وقت تو اس واقعے، سانحے یا حادثے کو بھی ایک عام سا واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس ایک چھوٹے سے واقعہ کو میں نے بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ لکھا اور پیش کیا۔
میرے اس ناول کے تمام تر کردار فرضی تھے۔ ان کے نام تک فرضی تھے۔
میرا اپنا خاندان ایک حادثے کا شکار ہوا ہے۔ اس فرضی داستان کو لکھنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ میں یہ پیغام پہنچانا چاہتی تھی کہ معاف کرنا اور درگزر کرنا سب [illegible]
[illegible] صرف [illegible] اس [illegible] لفظ "معافی" اور "درگزر" [illegible]
[illegible] کرنے والوں کے دل وسیع ہوتے ہیں۔ ظرف [illegible] ہوتے ہیں۔
میرے لاشعور میں صرف ایک بات تھی کہ اس تحریر کو پڑھنے کے بعد کوئی الہامی جذبہ "قلب عباس" کے ماں اور باپ کے دل میں بھی اتر جائے گا اور ان کا ایک لفظ "معافی" میرے "دادا" کے لیے رہائی کا سندیسہ لے آئے گا۔ جیل کے سارے تالے کھل جائیں گے اور میرے بھائی کے قلم تھامنے والے ہاتھوں کی کڑیاں خود بخود کھل جائیں گی۔
میرا یہ تحریر لکھنے کا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا نہیں تھا۔ کسی کا دل دکھانا نہیں تھا۔ نہ ہی کسی کے احساسات یا جذبات پر ضرب لگانا تھا۔ ناول آغاز سے لے کر اختتام تک فرضی ناموں اور کرداروں پر مشتمل رہا ہے۔ اگر اس ناول کے کچھ نام یا کردار کسی کی بھی ذاتی زندگی سے مماثلت رکھتے ہیں تو یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے۔ کسی شعوری کوشش کا اس میں عمل دخل نہیں۔
دنیا بہت وسیع و عریض ہے، یہ جہاں بے شمار واقعات روزمرہ رونما ہو رہے ہیں۔ بعض لوگ ان کو ایک عام کہانی یا واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعض لوگ اپنے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں انہیں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔
ایک مصنف یا داستان گو جب کچھ تحریر کرنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے تو وہ کہانی کو خلا سے نہیں پکڑتا۔ اپنے اردگرد کے ماحول یا بستیوں میں تلاشتا ہے، ڈھونڈتا ہے اور پھر ایک خاص انداز میں اسے تحریر کی شکل میں مکمل اور جامع بنا دیتا ہے۔
آخر میں صرف اتنا کہوں گی کہ کبھی کبھی حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت سمجھ کر بھی پڑھ لینا چاہیے۔ بہرحال اگر کوئی ذاتی طور پر اس کہانی کو اپنے ساتھ منسلک کرے یا پھر اسے اپنی داستان سمجھ کر ہرٹ ہوا ہے تو اس کے لیے میں معذرت چاہتی ہوں۔
[illegible] افسانے کو ایک حقیقت بنا دیا [illegible]
پیاری نایاب! ہم تہہ دل سے دعا گو ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی کو جرم بے گناہی کی سزا سے نجات دے اور زندگی کی تمام خوشیاں نصیب کرے۔ آمین۔
قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ نایاب جیلانی کے بھائی کے لیے خاص طور پر دعا کریں۔

حنا، ثنا، صبا اور مریم نے فاروق کالونی سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں۔

سب سے پہلے "ستارہ شام" پڑھا۔ پلیز آمنہ جی! ناول کو زیادہ طوالت کا شکار مت کیجیے گا۔ جو بھی ناول بہت طویل ہو جاتا ہے وہ اپنا حسن اور دلکشی کھو دیتا ہے۔ "زرد موسم" کو ہی دیکھ لیجیے۔ اس طرح "دیوار شب" بھی [illegible] کا شکار کرنے لگا ہے۔
"[illegible] کے رستے" آغاز تو اچھا ہے مگر جلدی جلدی [illegible] گا۔
آسیہ رزاقی ہمیشہ سے ہماری فیورٹ ہیں۔ سائرہ عارف کا ناولٹ بھی یقیناً "بیس بائیس قسطوں تک جائے گا۔ پھر بوریت کا سلسلہ۔ افسانے ہمیشہ سے پسند رہے ہیں کیونکہ ان کے اختتام پر ہمیشہ ایک سبق موجود ہوتا ہے۔
اب بات کر لیتے ہیں اپنی ہر دل عزیز مصنفین کی۔ فرحت اشتیاق جی لوٹ آئیے۔ اس طرح سیدہ شہلا شکور سے بھی کہیں شعاع کے لیے ناول لکھیں۔ میمونہ جی مستقل غائب ہو چکی ہیں۔ انہیں بھی اب ڈھونڈنا پڑے گا۔
اور اب بات کریں گے اپنی جند جان نایاب جیلانی کے بارے میں۔ بہت کم عرصے میں اپنا الگ اور منفرد مقام بنانے والی نایاب جیلانی نے قارئین کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ ہماری امی آپ کی بہت فین ہیں۔ نایاب جیلانی اور کنیز نبوی سے شعاع کے لیے صرف دو تین قسطوں پر ناول لکھوائیں، مگر یاد رہے دو یا تین قسطیں۔۔۔ اس سے زیادہ اگر ہوئیں تو پھر بوریت، کیونکہ بہت طویل ناول دلچسپی اور شوق کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔
اس دفعہ نایاب کا ناول "دوسرا پہر" پڑھ کر ہم ہی نہیں ہماری امی بھی بہت دیر روتی رہی ہیں۔ یقین مانیے حادثاتی موت نے بے حد غم زدہ کیے رکھا تھا۔ ہمارے دل ان کی مغفرت کے لیے ہمیشہ دعا گو رہیں گے۔
ج: حنا، صبا، ثنا اور مریم! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ "دل کے رستے دشوار بہت تھے" سلویٰ علی کے ناول کی صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو اقساط مزید ہیں۔ سائرہ عارف کا ناولٹ بھی زیادہ سے زیادہ پندرہ اقساط پر مشتمل ہوگا۔ کنیز نبوی اور نایاب جیلانی تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔

لاہور سے حرا حسین نے ای میل کی ہے

سرورق پر موجود محترمہ کا میک اپ خوب تھا۔ خاص طور پر آنکھوں پر لگائے ہوئے لینز بہت بھلے لگے۔
شعاع میں رضیہ صاحبہ نے خوب لکھا۔ ہم ان کے ساتھ دل و جان سے متفق ہیں۔ حمد بہت زبردست تھی۔ "آخر شب کے ہم سفر" پر آمنہ زریں کا تبصرہ لاجواب تھا۔ "ستارۂ شام" میں آمنہ کیا کمال کا لکھ رہی ہیں۔ پڑھ کر سواد آ جاتا ہے۔ عالیہ سستی کے ساتھ بھی شاندار لکھتی ہیں۔ طرز تحریر میں روانی بہت بھاتی ہے۔ بس ان کی کہانیاں جب

پاکستانی ٹرینوں کی طرح سست روی سے چلتی ہیں تب بہت کوفت ہوتی ہے۔

مجھے آج آپ ایک بات بتائیں تو میری ایک بہت بڑی الجھن کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یقین کریں کہ میں صرف ایک اس بات کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ مجھے اس وجہ سے بعض دفعہ رات کو نیند نہیں آتی۔ اور وہ بات یہ ہے کہ آپ کی ایک رائٹر نایاب جیلانی آخر ہر مہینے شعاع یا خواتین میں اتنا مسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ بے تکا اور حقیقت سے دور کیسے لکھ لیتی ہیں؟

ثمینہ عظمت کا عروج بہت زبردست تحریر تھی۔ آسیہ رزاقی کو پڑھنا ہمیں بہت پسند ہے۔ اس دفعہ بھی انہوں نے خوب لکھا۔ سلویٰ علی بٹ بھی ہمیں متاثر کرنے میں ناکام رہیں۔ کاشفہ حسین نے بھی اچھے ٹاپک پر لکھا' میں اس سے بالکل متفق ہوں۔

ج۔ پیاری حرا! آپ کا "بے لاگ" تبصرہ پڑھا۔ آپ کو نایاب جیلانی پسند نہیں لیکن ہماری بہت سی قارئین انہیں بہت پسند کرتی ہیں۔ ہمیں اپنی تمام قارئین کی رائے کا احترام ہے۔ آپ نے ان کی کہانی کو حقیقت سے دور لکھا ہے جبکہ بہت لوگوں کو اس پر حقیقت کا گمان ہوا۔

یاد آوری کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ملیر کراچی سے نیلما درانی لکھتی ہیں

ہمارے اور شعاع کے ساتھ کو برسوں بیت گئے اب تو ہم پڑھ لکھ کر پڑھانے کے لائق ہو گئے ہیں' دوسرے قارئین ہمارے دل کی بات کہتے رہے تو ہم نے آپ کو ایک اور خط پڑھنے کی زحمت سے بچا لیا۔ شعاع کے مستقل سلسلے "لفظ لفظ روشنی ہے" جو ہمارے والدین کے بعد بھی ہمیں جینے کا قرینہ سکھاتے ہیں۔ رفعت ناہید سجاد' عمیرہ احمد' راحت جبیں' رخسانہ نگار اور عالیہ بخاری .... ایک کہکشاں ہے' جو زندگی کو جگمگاتی ہے اور ان کی حکمت و دانائی کے موتی جیسے لفظوں سے ہم اپنی زندگی کی گرہیں سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعاع ہر لحاظ سے ایک مکمل رسالہ ہے' جو خواتین کی زندگی کے ہر گوشے کو سنوار رہا ہے۔ شعاع کو ہم اتنے ایمان اور دھیان سے پڑھتے ہیں گویا عبادت کر رہے ہوں۔ یہ محض تفریح نہیں بلکہ زندگی میں منزل کا نشان بتاتے ہیں۔

ج۔ نیلما جی! آپ نے تو یہ وضاحت کر دی کہ خط پڑھنے میں ہمیں قطعاً "کوئی زحمت نہیں ہوتی" آپ نے ہمیں خط پڑھنے کی زحمت سے نہیں بچایا بلکہ بہت بڑی خوشی سے محروم رکھا۔ اتنے خوب صورت الفاظ میں آپ نے شعاع کی تعریف کی ہے' یقین کریں ہمیں بہت اچھا لگا اور بھی اچھا لگتا اگر آپ جون کے شمارے پر اس کی تحریروں پر تبصرہ کرتیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا اور ہاں' اب یہ سوچ کر مطمئن نہ ہو جائیے گا کہ دوسری بہنوں نے آپ کی ترجمانی کر دی ہے۔ اپنی رائے کا اظہار بہت ضروری ہے' خواہ ووٹ دینے کا معاملہ ہو یا شعاع کی محفل اگر آپ اچھائی کے ساتھ ہیں تو آپ کا شمار بھی اچھے لوگوں میں ہو گا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

[illegible] شہزاد [illegible] خان [illegible] سے شریک محفل ہیں

شعاع اس مرتبہ بہت اچھا لگا۔ سب سے پہلے ریاض کو پڑھا زبردست لکھا تھا۔ ثمینہ لگتا ہے کہ اس صورت میں بدلہ اپنے سسرال سے لیں گی۔ دین محمد نے جنت کے کہنے پر بیوی پر ہاتھ اٹھایا تو مجھے جنت بہت ہی بری لگی اور جب "بشریٰ" نے بددعا دی تو بہت دکھ بھی ہوا کیونکہ ظالم بددعا کی لپیٹ میں دیر سے ہی سہی لیکن آتے ضرور ہیں۔

عالیہ بخاری کو پڑھنے کی باری آئی تو ایسا محسوس ہوا کہ سالار لاہور آتے ہی [illegible] سے شادی کر لے گا۔ خیام اور ربیعہ کا جوڑ بنے گا۔ پلیز جلدی کہانی کو آگے بڑھائیے۔

مکمل ناول میں سب سے پہلے سینئر رائٹر آسیہ رزاقی کو پڑھا۔ آسیہ سوتے ہوئے کو جگا کر اپنا حق لینے کو ہمت دلاتی ہیں۔ آخر میں جس طرح ایک نوکر، جہانگیر کو کہتا ہے کہ آپ کی بیٹیاں ہوتیں تو آپ کی خدمت کرتیں اور حقیقتاً "بھی ایسا ہی ہے۔ الحمدللہ ہم بہنوں کی پیدائش' تعلیم و تربیت پر بابا نے کبھی بھی یہ شکوہ نہیں کیا کہ اتنی بیٹیاں کیوں ہوئیں۔ بابا بھائیوں کے برعکس ہم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہم کو پیار کے نام سے بلانا ہنسی مذاق کرنا اور ہمارے [illegible] کی تعریف بھی کرنا۔ ہمارے بابا بھی اب اس عمر میں ہیں جب ان کو ہماری ضرورت ہے اور الحمدللہ ہم بہنیں خدمت والدین "پر عمل" کر رہی ہیں تو بابا خوش ہو کر کہتے ہیں کہ "اگر نہ ہوتیں تو میرا کیا ہوتا" میرا خیال ہے یہ اللہ کی بڑی نعمت ہو سکتی ہیں! ہر انسان تو ہر نعمت کی قدر نہیں کرتا تو اس کی سزا بھی اوپر والا اسے دے ہی دیتا ہے۔

آسیہ جی! عورتوں کے لیے اس طرح کے ہمت دلانے اور جدوجہد کرنے کے ناول لکھتے رہیے گا۔ ہمیں آپ کی ہمت کی بہت ضرورت ہے۔

سلویٰ علی بٹ نے کردار اچھے منتخب کیے ہیں۔ ماہم کو شوہر کی ناشکری اور اولاد کو چھوڑنے کی بڑی سزا ملے گی اور وہ پچھتائے گی۔ ناولٹ میں تو پہلے سائرہ عارف کا "صبح کا ستارہ" پڑھا بہت اچھی تحریر ہے۔ ام کلثوم [illegible] والا ڈرامہ کچھ لوگوں کو بالکل پسند نہیں آیا تو وجہ یہ ہے کہ ایک حافظ عورت کو گلوکاری کی فیلڈ میں دکھا کر آپ نے اللہ سے محبت کرنے والے لوگوں کے دلوں کو ٹھیس پہنچائی ہے [illegible]

[illegible] کلام [illegible] اس کو [illegible] یہ سب دکھانے کا کیا مقصد ہے؟ آپ ہماری بیٹیوں کو کیا دکھانا چاہتے ہیں؟"

اب بات ہو جائے ثمینہ عظمت کی تو سندھی لفظوں کے ساتھ ان کا لکھا ناول بہت انجوائے کیا۔ "ہم سیدوں پر [illegible] پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" یہ نعرہ ہمیں بلند کرنا ہے [illegible] اس سرزمین کا ہمارے اوپر حق بنتا ہے یہ حق ہم نے پورا نہیں کیا تو زمین ہمیں چھوڑنے کی نہیں حق کو پہچانیے اور حق حاصل کیجیے۔ افسانوں کی بات کی جائے تو واہ واہ چاروں افسانے زبردست تھے۔ اتنے اچھے افسانے لکھنے پہ چاروں رائٹرز کو مبارک باد اور اسی طرح قلم کا حق ادا کیجیے۔

ج۔ پیاری کومل! آپ نے اتنا خوب صورت اور جامع تبصرہ کیا بہت اچھا لگا۔ ثمینہ عظمت علی نے اپنے افسانے میں جو بات کہنا چاہی ہے' ہماری بہت کم قارئین اس کو سمجھ پائی ہیں۔ آج ہم پاکستان کا مطلب کیا ہے' یہ بھول چکے ہیں بلکہ جو پاکستان کے اس مقصد کو یاد دلاتے ہیں' انہیں بنیاد پرست کہہ کر ان کی تضحیک کرتے ہیں۔ اگر آج بھی ہم متحد ہو جائیں تو دہشت گردی' غربت اور جہالت کے جو اندھیرے ہمارے ملک پر چھائے ہیں' دور ہو جائیں اور ایک نیا آزاد پاکستان ابھرے گا۔

تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ' اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

ہانیہ ملک نے ای میل کی ہے

مجھے ساون' سرسوں اور کوئل اتنی ہی عزیز ہیں جتنا شعاع اور شعاع میں راحت جبیں' رفعت سراج اور عنیزہ سید کے ناول۔ اس مرتبہ بارش کے سنگ شعاع پڑھنے کا بہت مزا آیا۔ "ستارہ شام" منفرد کہانی ہے۔ مجھے شبینہ کا کردار پسند آیا۔ شعاع میں سلسلہ شعاع کے ساتھ ساتھ بہت اچھا ہے۔ اسے ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔ عالیہ جی! پلیز "دیوار شب" کو فاسٹ کریں تھوڑا۔ بہت ماہ پہلے میں نے اور میری دوست "ریا" نے ایک سیریز کا آغاز کیا۔ مگر بھیجنے کے لیے ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے۔

ج۔ ہانیہ! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے ہاں اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ یہاں تو اس وقت شدید حبس کا عالم ہے اور صبح سے لائٹ بھی غائب ہے۔ مت پوچھیں' کتنا برا حال ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سیریز لکھ لی ہے تو سوچ کیا رہی ہیں فوراً بھجوا دیں۔

اعتذار

جون کے شمارے میں نایاب جیلانی کی کہانی "دوسرا پہر" شائع ہوئی تھی۔ یہ کہانی اور اس کے کردار فرضی اور مصنفہ کے ذہن کی تخلیق تھے۔ اگر کوئی مماثلت ہے تو محض اتفاقیہ ہے۔ اگر اس کہانی سے کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچی تو مصنفہ معذرت خواہ ہیں۔

ثانیہ عبدالغفور نے للیانی سے لکھا ہے

"میری صبح کا ستارہ" ناولٹ بہت زبردست جا رہا ہے۔ سائرہ پلیز ماہین کو کاشف سے ضرور ملوا دیجئے گا۔

"ستارہ شام" بھی بہت شاندار جا رہا ہے۔ اس میں سب سے دلچسپ مادی کا کردار ہے، لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مادی تو اپنے منگیتر شہروز سے انتہائی محبت کرتی ہے تو پھر اس کی والدہ جیڈی سے یہ کیوں کہتی ہیں کہ مادی تم سے پیار کرتی ہے اور یہ کہ شبیہہ العباس کا رویہ نوی کے ساتھ اس قدر عجیب کیوں ہے۔

"دوسرا پہر" بھی انتہائی زبردست تحریر تھی۔ نوشی اور ساشا کی نوک جھونک سے خوب حظ اٹھایا۔ حسن کا کردار بھی اچھا لگا۔ افسانوں میں سب سے زبردست "تربیت" تھا اور "راز کی بات" بھی دلچسپ تھا۔

کیا میں بھی کوئی تحریر بھیج سکتی ہوں؟ ضرور آگاہ کریں۔

ج۔ ثانیہ! للیانی کا نام پہلی بار سنا ہے، آپ ہمیں اپنے شہر کے بارے میں کچھ بتائیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ اپنی تحریر بھجوا دیں، اس میں پوچھنے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔

فیصل آباد سے نفیسہ حق نے ای میل کیا ہے

عظمیٰ افتخار کا "راز کی بات" بہت زبردست لگا۔ ذرا تھیٹر کا بس سو سو تھا۔ ثمینہ عظمت علی نے بات شروع کہاں سے کی اور ختم کہیں اور۔ مستقل سلسلوں میں آمنہ ریاض ٹاپ پر جا رہی ہیں۔ اس قسط میں انبیا کا فیضان سے اظہار محبت مزا دے گیا۔ "دیوار شب" اچھا ہے۔ مگر بہت سست روی کا شکار ہے۔ "میری صبح کا ستارہ" میں سسپنس نہیں ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ کاشف دولت کے لالچ میں ماہین سے محبت کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ سلویٰ علی بٹ کی تحریر میں وہ پختگی مفقود ہے جو آپ کے ڈائجسٹ کا خاصا ہے۔ نایاب جیلانی کا ناول حقیقت سے بہت دور لگا۔ آسیہ رزاقی کا ناول ایسا نہیں تھا کہ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ ان کے ناول کا موضوع ہمیشہ اچھا ہوتا ہے مگر مکالمہ بازی جو کہ ناول کی خاصیت ہوتی ہے وہ ان کی تحریروں میں سرے سے غائب ہوتی ہے۔ ایک قاری بہن فروا ساجد کی بات دل کو لگی کہ اب شعاع کا معیار وہ نہیں رہا، جو پرانی تحریروں کا تھا۔ پرانی رائٹرز کی تحریریں تو ایسی ہوتی تھیں کہ سالوں ذہن پر نقش رہتی تھیں۔ ایک دو کہانیاں تو ایسی تھیں کہ میں باقاعدہ سسکیاں بھر بھر کے آنسوؤں کے ساتھ روئی۔

ج۔ پیاری نفیسہ! ہمیں قارئین کی رائے کا پورا احترام ہے اور پرانی رائٹرز بھی ہمیں عزیز ہیں، اگر وہ لکھیں تو ہم ان کی تحریریں ضرور لگائیں گے۔

آسیہ رزاقی طویل عرصہ سے لکھ رہی ہیں اور ان کا اپنا ایک اسٹائل ہے جسے بہت سی قارئین بے حد پسند کرتی ہیں۔ آپ ان سے روایتی انداز کی توقع نہ رکھیں۔

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کو شعاع کا معیار پہلے جیسا نہیں لگ رہا ہے۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

منزہ رحمت نے گاؤں ڈھنگ شاہ تحصیل و ضلع قصور سے لکھا ہے

اس دفعہ کا ٹائٹل دیکھ کر ہمارے منہ سے [illegible]

اس دفعہ شعاع نے [illegible] کہ ہمارے نہیں ہوتا۔ کئی مہینوں کے بعد شعاع کی پرانی رعنائیاں لوٹی ہیں۔ سلویٰ علی بٹ! میں بہت حساس ہوں اور آپ کی کہانی کا اینڈ [illegible]۔ نایاب! کبھی زندگی میں ملاقات ہوئی تو آپ کے ہاتھوں پہ بوسہ ضرور دوں گی۔

سلسلے وار ناول دونوں ہی خوب جا رہے ہیں اور پلیز دونوں کے صفحات بڑھا دیں۔ سائرہ اور ثمینہ عظمت نے بھی خوب کمال دکھایا۔ افسانے بھی سب اچھے تھے۔ سیرو جہاں میں آمنہ زرین بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ اس دفعہ یاور عظیم کی غزل بہت اچھی لگی۔ باقی سب بھی اچھے تھے۔ افسانوں میں عظمیٰ افتخار نے جو ٹاپک لکھا، وہ بالکل ہمارے گھر جیسا تھا۔ ہمارے اندر بھی لوگوں نے اکھاڑ پچھاڑ کر کے دلوں کو پتھر بنا دیا ہے۔ آپ سے ایک بات کہنا تھی پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا ہماری رائٹرز عمیرہ احمد، فرحت، رفعت وغیرہ کچھ مغرور سی ہو گئی ہیں مہربانی کریں انہیں واپس بلائیں ہم شدت سے منتظر ہیں۔

ج۔ پیاری منزہ! یہ آپ نے کیسے سوچا کہ ہم آپ سے ناراض ہیں اس لیے آپ کے خطوط مختصر کر دیتے ہیں۔

[illegible] ضروری ہے کہ خطوط کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور [illegible] ہماری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ [illegible] کے خطوط جگہ پا سکیں اس لیے مختصر کر دیتے [illegible]

عمیرہ، فرحت اور رفعت مغرور نہیں، مصروف ہو گئی ہیں۔ اس لیے شعاع اور خواتین میں نہیں لکھ پا رہی ہیں۔

صوفیہ مدثر، سدرہ مدثر نے سعادت پور جہلم سے لکھا ہے

اس ماہ شعاع کا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ سب سے پہلے اپنا پسندیدہ ناول "دیوار شب" پڑھا۔ سلمان نے اپنے حالات سے ابھی تک سبق نہیں سیکھا۔ دوسرے نمبر پر "ستارہ شام" آمنہ ریاض کی اچھی کاوش ہے۔ رمشا خالد کا "تربیت" زبردست تھا، واقعی پیسے سے نہیں تربیت سے زندگی بنتی ہے۔ "دل کے راستے دشوار بہت تھے" نام نے اپنے پیر پر خود ہی کلہاڑی مار لی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ثمینہ عظمت علی کا افسانہ بہت اچھا [illegible] سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے یوں کہنا چاہیے۔ آسیہ رزاقی جو [illegible] زبردست۔ سائرہ عارف ہمیشہ سے ہی اچھا لکھتی ہیں لیکن "میری صبح کا ستارہ" مجھے خاص متاثر نہیں کر سکا۔ باقی سلسلے سب ہی زبردست ہیں اسی لیے تو ہمیں شعاع پسند ہے کیونکہ اپنا ہے۔

نویدہ سید نے ابوظہبی سے ای میل کی ہے

[illegible] آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھی، اس وقت سے [illegible] رہی ہوں اور اب ایک بچی کی ماں ہوں۔ "دیوار شب" بہت پسند ہے۔ خاص طور پر جویا اور زویا [illegible] پسندیدہ کردار ہیں۔ میں سلویٰ کی یہ دوسری کہانی پڑھ رہی ہوں۔ سلویٰ ایک تجربہ کار اور پختہ مصنفہ کی [illegible] ابھری ہیں۔ کہانی میں کہیں بھی دلچسپی ختم نہیں ہوتی۔ آخر تک آپ کہانی کے سحر سے نکل نہیں [illegible] طرح عمیرہ احمد اور رخسانہ نگار عدنان کی [illegible] ہو رہا ہوتا ہے۔ اس ماہ نایاب جیلانی نے اپنے [illegible] سے ہٹ کر کہانی لکھی ہے۔ ان کی کہانی [illegible] کی بھرمار ہوتی ہے اور واقعات بہت جلدی جلدی رونما ہوتے ہیں، لیکن اس ماہ بہت خوب صورت انداز میں لکھا ہے۔

ج۔ نویدہ جی! یاد آوری کا شکریہ۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

لودھراں سے رضوانہ شکیل راؤ نے لکھا ہے

کچھ عرصہ پہلے ہم بھی آپ کی محفل میں پائے جاتے تھے مگر پھر گردش زمانہ نے ہمیں بھولی بسری یاد کی طرح بنا دیا۔ گرمیوں کے مطابق ٹائٹل گرل اچھی لگ رہی تھی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں، جو ہمیشہ کی طرح گوہر نایاب جیسی تھیں۔ اللہ ہمیں عمل کی توفیق دے۔ (آمین)

دستک میں انٹرویو کچھ خاص نہیں لگے۔ "ستارہ شام" پڑھا، کردار آہستہ آہستہ کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ رمشا خالد کا افسانہ "تربیت" دل کو چھو گیا۔ "دل کے رستے دشوار بہت" سلویٰ کی اچھی تحریر ہے۔ گو اس میں رومانس کا عنصر کچھ زیادہ تھا، "تھا" کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ اب کہانی نے اک نیا موڑ لیا ہے "میری صبح کا ستارہ" جیسی کہانیاں کئی بار پڑھ چکے ہیں سو اس نے مجھے کچھ خاص اٹریکٹ نہیں کیا۔

ایک افسانہ تھا، جس میں لڑکی کا نام پروین تھا، وہ غیر مسلم خاندان سے تھی اور قرآنی آیات والے صفحات کو بہت احترام سے چوم کر رکھتی تھی اور وہ مرنے کے بعد سیدوں کے قبرستان میں دفن ہوئی تھی۔ اگر کسی بہن کو اس کہانی کا نام اور یہ کہ وہ کون سے رسالہ میں شائع ہوئی تھی معلوم ہو تو ضرور بتا دیں، میں اسے دوبارہ پڑھنا چاہتی ہوں۔ شعاع کے سلسلے تو کم ہو ہی رہے تھے جیسے "شعاع کے ساتھ ساتھ" اور "شاعری سچ بولتی ہے" مگر جو سلسلے شامل ہوتے ہیں ان کے صفحات بھی کم ہوتے ہیں۔

پلیز قسط وار ناولز کو بہت طویل مت کیجیے۔ عمیرہ احمد کے لیے اتنا کہنا چاہوں گی کہ ان کی پہچان، شہرت شعاع اور خواتین سے ہوئی لہٰذا اسے مت بھولیں۔

ج۔ رضوانہ! یہ کس نے کہا کہ آپ بھولی بسری یاد بن گئی ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے جیسے کل کی بات ہے کہ ہر ماہ رضوانہ شکیل راؤ کے خطوط ہمیں موصول ہوتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری بہت سی مصنفین اب زیادہ تر طویل کہانیاں لکھتی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری بہت سی قارئین طویل کہانیاں زیادہ پسند کرتی

ہیں۔

صائمہ بشیر نے گجرات سے لکھا ہے

حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح نور سے منور تھیں۔ جزاک اللہ۔ "دیوار شب" میں [illegible] ہے کہ اب ہر طرف سے پٹاخے پھوٹنے کا وقت آگیا ہے یعنی کلائمکس۔ "ستارہ شام" میں دین محمد اور جنت کے متعلق زیادہ سے زیادہ پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ "نعرہ حق" ثمینہ عظمت کی زبردست تحریر تھی۔ "غلام والدین" بھی اچھا لگا۔ ایک شکایت ہے کہ ایک ہی رسالے میں اتنے سلسلہ وار ناول۔؟ "تاریخ کے جھروکوں سے" میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ اس میں حضرت خضر حیات کے متعلق بھی لکھیں۔ میرا علم ان کے متعلق کافی محدود ہے لہٰذا ضرور کچھ شائع کریں "شعاع کے ساتھ" کیا آپ نے ختم کر دیا ہے؟

ج۔ پیاری صائمہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ غالباً" آپ حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں، غلطی سے خضر حیات لکھ گئیں۔

"شعاع کے ساتھ" سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ بس صفحات کی کمی کے باعث کبھی کبھی اس سلسلے کی جگہ نہیں بن پاتی۔

فیصل آباد سے مدیحہ نے ای میل کی ہے

شعاع ملا اور سب سے پہلے "ستارہ شام" پڑھا۔ بہت مزا آیا۔ "دیوار شب" بھی بہت اچھا ہے۔ عالیہ جی سے درخواست ہے کہ وہ سالار اور گیتی کو ملا دیں خیام کو پتا تو چلے کہ خود غرضی کی سزا کیا ہوتی ہے۔

"دل کے رستے" ابھی تک تو اچھا ہے، آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ آپ نے اتنی ساری قسط وار کہانیاں کر دی ہیں، پلیز! کچھ کم کریں۔ ویسے "دل کے راستے" کی کتنی اقساط ہوں گی۔ پلیز! میری میل ضرور شامل کیجیے گا۔ اور حسن قادر کا انٹرویو ضرور شامل کریں۔

ج۔ یاد آوری کا شکریہ۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ عالیہ جی نے آپ کی فرمائش پوری کر دی ہے۔ سالار اور گیتی مل گئے ہیں۔ سلویٰ علی بٹ کے ناول کی دو اقساط باقی ہیں۔

تہمینہ کوثر نے لیانی سے لکھا ہے

جون کا شمارہ ملا، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ مکمل ناول بہت زبردست تھے۔ "نعرہ حق" نے ہنسا ہنسا کر برا حال کر دیا۔ "میری صبح کا ستارہ" بہت اچھا جا رہا ہے اور مجھے بہت پسند ہے "ستارہ شام" بھی اچھا جا رہا ہے۔ "دیوار شب" سست روی کا شکار ہے۔ اسے جلدی سے آگے بڑھائیں۔

ج۔ پیاری تہمینہ! آپ کا ناول ابھی پڑھا نہیں۔ پڑھ کر ہی رائے دی جا سکتی ہے۔ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رقیہ اسماعیل بزمان سے شریک محفل ہیں

"دیوار شب" کی رائٹر عالیہ بخاری میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ اس ماہ بھی اس تحریر نے مزا دیا لیکن یہ تھوڑی سست روی سے چل رہی ہے۔ آمنہ ریاض کا ناول "ستارہ شام" پڑھا بہت ہی مزا آیا پڑھ کر لیکن سسپنس برقرار ہے ابھی۔ سائرہ عارف بھی زبردست لکھ رہی ہیں۔ [illegible] "آستانہ" نے تو مزا ہی کرکرا کر دیا۔ [illegible] باقی ساری کہانیاں بھی بہت ہی زبردست تھیں۔ ریاض صاحب سے بچھڑنے کا دکھ ابھی تک تازہ ہے لیکن وہ ہمارے دلوں میں ابھی تک زندہ ہیں۔ آخر میں میری امی کی طرف سے اور میری طرف سے اتنے خوب صورت پرچوں کی اشاعت پر مبارک باد۔

ج۔ رقیہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ شعاع کو سراہنے کے لیے خوب صورت الفاظ ضروری نہیں۔ سچے جذبات اگر سادہ سے لفظوں میں بھی بیان ہو جائیں تو اثر رکھتے ہیں۔ محض سستی کی وجہ سے آپ ہمیں خط نہ لکھ سکیں اور ہم آپ کی رائے نہ جان سکے۔ اب سستی کو قریب نہ آنے دیجیے گا اور باقاعدگی سے ہمیں شعاع کی تمام تحریروں کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیجیے گا۔ اپنی امی کو ہمارا شکریہ پہنچا دیں۔

خالدہ ریاست اور ساجدہ سرور شہداد پور سے تشریف لائی ہیں

کئی ماہ سے خط لکھنے کا سوچ رہے ہیں، لیکن یہ سوچ کر رہ جاتے ہیں کہ شعاع کے اتنے خطوط میں ہمارے خط کی کیا اہمیت ہوگی۔ جی! شعاع کے لیے کچھ کہانیاں اور ناول بھی لکھ رکھے ہیں۔ چونکہ نئے لکھاری ہیں اس لیے یہ پتا نہیں کہ کہانی کس طرح کے صفحات پر تحریر کریں۔

خالدہ اور ساجدہ! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اگر ہمیں ڈھیر سارے خطوط موصول ہوتے ہیں تو آپ کے خط کی ہماری نظر میں اہمیت نہیں ہوگی؟ کہانیاں اور افسانے آپ اسی کاغذ پر لکھیں جس پر خط لکھا ہے لیکن صفحے کے ایک جانب اور سطر چھوڑ کر لکھیں۔

سائرہ منیر احمد نے شرقپور شریف لاہور سے لکھا ہے

چار ماہ پہلے آپ سے گزارش کی تھی کہ آپی! پلیز علی ظفر کا تفصیلی انٹرویو شامل کریں۔ کیا شعاع پر ہمارا کوئی حق نہیں؟

کافی مہینوں کے بعد اس ماہ کا ٹائٹل اچھا لگا۔ شعاع میں اپنی فیورٹ رائٹر نایاب جیلانی کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی مگر حسب معمول سب سے پہلے "ستارہ شام" پڑھا۔ اس بار بہت [illegible] کہ یہ ناول کی [illegible] انہیں اتنی ہمت کہاں سے آئی [illegible] ہماری زندگی میں بھی کوئی دوسری لڑکی ہوتی، یہ گا ایک اور شاک تھوڑی بے حد ڈرپوک لگتی شبیہہ کے ساتھ تو ہادی ہی بچے گی اور اس بار شبیہہ کو بہت مس کیا۔ پھر "دیوار شب" پڑھا وہاں بھی خیام کو نہ پا کر دل دکھا اور گیتی کی شادی صرف سالار سے ہونا چاہیے۔ پلیز! انہیں الگ مت کیجیے گا۔ خط لکھنے کی خاص وجہ "دوسرا پہر" ہے۔ اتنا اچھا لگا یہ ناول کہ قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئے، ساشا اور نوشی کی باتیں بہت ہی پیاری لگیں۔ دولہا دلہن تو میرے کوئی عزیز تھے کہ آنکھیں بھیگ گئیں۔ ویل ڈن جی! آپ تو میری آل ٹائم فیورٹ ہیں نایاب جی۔ "تلاش ختم انتظار باقی" یہ تو سچ ہے کہ آج کے دور میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو بیٹیوں کو بیٹوں سے کم تر سمجھتے ہیں۔ ہمارے پیارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں میں عورت کا اعزاز بڑھایا۔ "تربیت" بھی پھیکی سی کہانی بہت سے سبق دے گئی۔ "راز کی بات" بھی بس ٹھیک تھی۔ "غلام والدین" سمجھ نہیں آئی۔ حرا قریشی کی "عہد اسیری" لکھنے کا انداز پسند آیا۔ "نعرہ حق" بھی بہت خوب صورت کاوش۔ "دل کے راستے دشوار ہیں" اتنا قدردان، باوفا محبت کرنے والا شوہر اور اتنی بے وفا خود غرض بیوی، بہت افسوس ہوا۔ "شاعری سچ بولتی ہے" بہت اچھا سلسلہ ہے، اسے ختم نہ کیجیے گا۔ باقی سلسلے بھی بہت ہی اچھے ہیں۔ FM-103 کے آر جے اظہر حسین کا انٹرویو تصویر کے ساتھ شائع کریں۔

ج۔ سائرہ! شعاع پر آپ کا پورا حق ہے لیکن آپ خود ہی بتائیے کہ علی ظفر دستیاب نہ ہوں تو آپ کی فرمائش کیسے پوری کریں؟

علی ظفر کے انٹرویو کی فرمائش ضرور پوری کریں گے، تھوڑا انتظار کر لیں۔ شعاع کے ساتھ ساتھ سلسلہ بند نہیں ہوا ہے۔ بس کبھی کبھی صفحات کی کمی آڑے آ جاتی ہے۔ اظہار حسین کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ شعاع پر تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

لاہور سے جویریہ ذیشان نے ای میل کیا ہے

میں 15 سال سے آپ کے ڈائجسٹ کی خاموش قاری ہوں۔ مگر آج ہما انور کی کہانی نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ زندگی کے بارے میں افسانے کے آخری الفاظ اتنے مثبت تھے کہ میں مجبور ہو گئی ان ہاتھوں کو داد دینے پر جنہوں نے یہ لکھا۔ نہایت خوش آئند اور خوش گوار افسانہ تھا۔ مجھے بے حد اچھا لگا۔

مٹی میں بیج ہو تو صحرا کو نخلستان بنایا جا سکتا ہے، مگر ریت تو صرف صحرا کی خشکی اور گرمی میں اضافہ کا ہی موجب بنتی ہے۔ میری طرف سے ہما کو اتنے خوب صورت اور پرامید افسانہ لکھنے پر بہت مبارک باد، وہ مستقل لکھتی رہیں شکریہ۔

ج۔ جویریہ! آپ کی تعریف ہما انور تک پہنچائی جا رہی ہے۔ لیکن ایسی بھی کیا خاموشی کہ 15 سال بعد خط لکھا اور صرف ایک کہانی پر تبصرہ؟

ثمینہ اکرم نے بہار کالونی کراچی سے لکھا ہے

آپ نے اتنی محبت سے تبصرہ (خط) بھیجنے کی فرمائش کی تھی، پھر میں آپ کی کوئی بات کیسے ٹال سکتی ہوں۔ آپی ایک بات بتائیں کہ کیا "ہڈیوں میں بھربھراپن" ہڈیوں کا کینسر ہوتا ہے اور کیا واقعی اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا؟

خوشبوؤں میں بسا۔

مہندی سے سجا ہاتھ اس نے چہرے پر رکھا تھا' شاما کو لگا جیسے وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی' یا پھر کسی کا بھی نہیں۔

"بہت خوش رہو گی اللہ نے چاہا تو' سارے دکھ' سارے شکوے ختم ہو جائیں گے۔ اپنے گھر پر راج کرنے کی شان ہی کچھ اور ہو گی۔" اپنی فطری وفاداری سے مجبور وہ گیتی کے کندھے' کمر دھیرے دھیرے دباتے ہوئے ملک صاحب کا قصیدہ پڑھنے گئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ مت کرو!"

ایک بار پھر اس کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

نیچے سے آتی آوازیں ادھ کھلے دروازے میں سے یہاں تک آ رہی تھیں۔

"نیچے کیا ہونے لگا ہے شاما؟"

"خیر سے دیگیں چڑھانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں' ظہر تک ساری برادری میں بانٹ کر فارغ ہو جانا ہے' نانی کی سختی سے ہدایت ہے کہ عصر تک باہر سے دھو دھلا کر ساری صفائی ہو جائے' پھولوں کا گیٹ بنے گا دروازے کے ساتھ۔ پتا بھی ہے!"

بے زاری سے سر جھٹک کر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی۔

"مجھ سے کچھ کہا؟" شاما نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"جب چار لوگ ہی آنے ہیں تو دروازے [illegible] کی کیا ضرورت ہے' چپ چاپ کی طرح آ جائے اور لوٹ کر لے کر جانا ہے' اتنی خوشیاں کس حساب میں منا رہی ہیں شاما!" اس کی [illegible] اونچی ہوئی۔

"پھر وہی!" شاما نے بے ساختہ ہی ایک بار پھر اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ان چند دنوں میں کتنی ہی دفعہ اسے ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔

"خیر کے ساتھ اپنے گھر جاؤ' کیوں اتنے برے الفاظ منہ سے نکالتی ہو' بدشگونی ہوتی ہے!"

"جب قسمت ہی خراب ہو تو اچھے برے الفاظ سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور میں نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا ہے' سچائی تو یہی ہے نا!"

"ہاں!" شاما نے ایک ٹھنڈی سانس لی "سچائی صرف یہ ہے کہ تمہیں ایک عزت دار زندگی مل رہی ہے اور تمہیں اس بات کا احساس اس وقت ہو گا جب تم ملک صاحب کے گھر میں راج کر رہی ہو گی۔۔۔ دیکھو مہندی کا رنگ کتنا گہرا آیا ہے' محبت کرنے والا۔۔۔"

"بس کرو نا شاما!" گیتی نے اپنا ہاتھ' تیزی سے شاما کے ہاتھ سے چھڑایا "گھن آتی ہے مجھے ان باتوں سے۔ پلیز مت کرو' مجھے پتا ہے وہی ہو گا' جو نانی اور امی نے ہمیشہ چاہا تھا' پرانا پلان تھا ان کا۔"

شاما نے ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو' خدا نہ کرے' وہ کیوں پلان بنانے لگیں' ملک صاحب نے تمہارا عزت سے رشتہ مانگا۔ مناسب لگا تو ظاہر ہے قبول کرنا ہی تھا۔"

پچھلے سارے دنوں میں یہی ایک بات کوئی بھی اسے نہیں سمجھا پا رہا تھا نہ شاما اور نہ نگینہ۔

"تم جاؤ شاما! یہاں سے پلیز!"

وہ اتنی بیزار تھی کہ شاما کو لگا جیسے وہ نہ گئی تو گیتی آرا اسے ہاتھ پکڑ کر بھی باہر کر سکتی ہے' سو اصولاً اسے اٹھ ہی

[illegible] تا گم و ذہیت بنی وہیں بیٹھی رہی۔

[illegible] وفاداری آج کے دن ہمیشہ سے کہیں زیادہ آزمائش میں پڑی تھی۔

[illegible] کے ساتھ سائے کی طرح رہنا شاما! جب تک وہ رخصت نہ ہو جائے' یہ تیری ذمہ داری ہے!"

[illegible] اسے خاص طور پر کہا تھا اور وہ تعمیل حکم میں کوئی ذرا سی بھی کمی چھوڑنے والی نہیں تھی' سنی ان سنی [illegible] ہوئے وہ پھر سے اس کے پیر دبانے لگی۔

سر جھکائے' خاموش'

گیتی کو خود ہی اس پر رحم آیا تھا۔

"تم جاؤ شاما! میں تھوڑی دیر سوؤں گی!" اپنے پیر کھینچتے ہوئے اس نے اس بار کچھ نرمی سے کہا۔

شاما نے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کیا اور ہلکے سے مسکرا دی۔

ایسا ہی ہوتا ہے۔

رو پیٹ کر' ناراضی دکھا کر' بھوک ہڑتالیں کر کے' آخر کار سمجھوتا۔۔۔ اور آخر کار۔۔۔؟

اس کے آگے وہ کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی تھی' سو دروازہ بند کر کے باہر برآمدے میں نکل آئی۔

رات کے اس آخری پہر میں بھی بلا کا حبس تھا اور محرابوں کے دوسری طرف گہرے سرمئی بادلوں کا غبار جھکا [illegible] تھا۔

برسات کے مہینوں میں یہی ایک منظر کئی کئی دن کے لیے ٹھہر جاتا اور پھر کسی وقت اچانک ہی بادل موسلا دھار [illegible] پڑتے۔

"بس خدا کرے [illegible] آج بارش نہ ہو' ورنہ تو بڑی ہی گڑبڑ مچے گی!" برآمدے کی آخری محراب سے نیچے جھانکتے [illegible] سے دعا کی۔

[illegible] سے رکھی ہوئی دیگوں کے لیے مسالے کوٹے جا رہے تھے اور چولہوں کی آگ روشن کی جا رہی تھی' شاما [illegible] مسالوں کی مہک سانس کے ساتھ اندر اترتے ہوئے محسوس کی۔

[illegible] فراغت بیگ نہ جانے کس وقت اتر کر نیچے جا چکے تھے اور اس سارے کام کی نگرانی خود اپنے ذمہ لے کر [illegible] ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔

[illegible] بیماری جھیلنے کے باوجود آج ان کی ہمت قابل داد تھی۔

[illegible] انہیں بڑے فخر سے دیکھا' اور نانی ستارہ کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

[illegible] پر نگینہ اور نانی کے درمیان' دلچسپ سا موضوع چھڑا تھا۔ آج یہاں کوئی بھی نہیں سویا تھا۔

[illegible] بار تو بہت بڑا دل کیا' خالہ دل دار نے' جو گیتی کے لیے اتنا بھاری سیٹ لے آئیں' ورنہ صندل کی پہلی فلم [illegible] پر تو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا تھا ساریوں کو۔"

[illegible] جب گیتی نے بی اے پاس کیا تھا' تب بھی کافی دے دلا کر گئی تھیں دلدار اور گل ناز۔ ویسے بھی کبھی ہاتھ [illegible] کیا ان لوگوں نے دینے دلانے میں تو۔"

[illegible] ستارہ کی یادداشت شاید نگینہ سے زیادہ بہتر تھی۔

"[illegible] بھی اس سال میں چار نئے جوڑے دیے ہیں باجی گل ناز نے' بڑے اچھے مہنگے والے۔"

شاما کو حسب عادت بے موقع ہی گل ناز کی مہربانیاں یاد آئیں۔

"ساری زندگی تیری ان ہی چار جوڑوں میں ہی تو گزرے گی۔ بیٹھ گئی گل ناز کا ترانہ گانے۔ ارے الماس کا

صدقہ نکالتی ہے تو تیرا نمبر آتا ہے' اتنا بھی نہیں سمجھتی۔"

خالہ دلدار اور گل ناز کے لیے کہا گیا کوئی تعریفی جملہ سچا بھی ہو' تب بھی ناقابل قبول۔

شاما کو اس وقت بھی نگینہ نے خاصا جھاڑا تھا۔

نانی ستارہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اسے تاسف سے دیکھے گئیں' نگینہ کا ہلکا پن' آج بھی کم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔

"خود کو بدل نگینہ! اللہ نے تجھ پر کتنے کرم کیے ہیں۔ صندل کی کامیابی دیکھ لی' خیر سے آج اونچے مرتبے والا داماد بھی تیرا ہوا' دل بھی بڑا کر' شکر گزار بن' معاف کرنا سیکھ لوگوں کو' معاف کرنے کا بڑا اجر ہے۔ صبر اور شکر دونوں گنا جاتا ہے' بیٹی رخصت ہو رہی ہے آج' اپنے نصیب پر فخر کر' شکرانہ پڑھ!"

نگینہ کا سر خود بخود ہی جھکا تھا' نانی اور شاما کو لگا تھا جیسے وہ بہت غور سے' جو کچھ کہا جا رہا ہے سن رہی ہے۔

"بات بات میں گل ناز سے اپنا موازنہ کرنا کب چھوڑے گی آخر' اس سے کہیں آگے نکل آئی ہے۔ یہ کیا کم مقام شکر ہے' چھوڑ بھی دے اب یہ ہلکا پن!"

"کیسے چھوڑ دوں اماں! انسان اپنی فطرت سے کیسے ہٹ سکتا ہے۔" اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا' نگینہ کا چہرہ بھیگا ہوا تھا "میں بھی مجبور ہوں' نہیں نکال سکتی اپنے اندر کی نیچ عورت کو۔ اپنے حسد اپنے کینہ کو۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں' جو اپنی برائی کو کامیابی سے چھپا لیتے ہیں' مگر مجھ سے تو یہ بھی نہیں ہوا' اندر آگ بھڑکتی ہے تو بولے بغیر نہیں رہا جاتا' میرا رب مجھے معاف کرے۔ میں تو اس کے آگے نگاہ اٹھانے کے بھی قابل نہیں' ساری عمر سجدے میں پڑی رہوں' تب بھی۔۔۔!"

نگینہ کی آواز میں بڑی نمایاں لرزش تھی اور بات کے اختتام پر جب اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے تھے تو اس کا پورا وجود بکھر رہا تھا۔ شاما نے اپنا دل کٹتا ہوا محسوس کیا۔

"اللہ تیری ندامت کو قبول کرنے نی! یہاں کون ہے' جو گناہ گار نہیں' مگر توبہ کی توفیق بھی ہر ایک کو نہیں ملتی جب اتنا اچھا دل اللہ نے دیا ہے تو زبان کو بھی میٹھا کر' یوں ہر وقت انگارے چبانا!" نگینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جو کچھ بھی وہ سمجھا رہی تھیں بیچ میں ادھورا چھوڑ کر شاما کو دیکھا۔

"شاما! جا کر چائے بنا لا!"

"جی!" وہ مستعدی سے اٹھی۔

"ایک منٹ' ذرا گیتی کو بھی دیکھ لے' اٹھ نہ گئی ہو!" ہتھیلی سے آنسو خشک کرتے ہوئے نگینہ نے اسے روکا۔

شاما نے مڑ کر نگینہ کی طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پر تازہ آنسوؤں کے نشان تھے اور آنکھوں میں عمر بھر کی جھیلی محرومیوں کی اداسی!

"اور کچھ نہ سہی تو وہ اس کے چھوٹے چھوٹے غم کو چھپائے رکھتی ہی ہے' سو یہ بھی غنیمت ہے!"

کمرے کی دہلیز پر کھڑی شاما نے سوچا اور ہلکے سے مسکرا دی۔

"گیتی تو سو رہی ہے۔ گہری نیند۔ ماشاء اللہ آرام سے' ابھی دیکھ کر آ رہی ہوں' آپ فکر مت کریں۔" اپنی بات کہتے ہی وہ تیزی سے مڑ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

نگینہ کے چہرے پر اتنی دیر میں پہلی بار مسکراہٹ آئی۔

"شکر ہے اللہ کا' اس لڑکی کے دل کو کچھ تو قرار آیا' میرا تو دل کٹ رہا تھا' اسے دیکھ دیکھ کر اماں! قریب بھی نہیں جا رہی اسی لیے کہ کہیں نرم نہ پڑ جاؤں۔۔۔"

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔

"کیسی قسمت ہے اماں! اپنی بچی کو حسرت سے وداع کرتے ہوئے' کوئی تسلی' کوئی پیار بھی نہیں دے سکتی' ماں کی لاڈلی رہیں گی بیٹی کے ساتھ' سخت دل' بدزبان' بے حس' یہی سمجھتی رہے گی نا ساری عمر مجھے۔"

نگینہ کے لفظ لفظ میں سے درد بھری حسرت نے جھانکا تھا۔

نانی ستارہ نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"اپنی جذباتیت پر قابو پا نگینہ! ساری عمر جس حوصلے سے کاٹی ہے' اب اس نازک وقت میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ گیتی کو جو سمجھنا ہے' سمجھتی رہے' اپنے کسی ایک عمل سے بھی اسے نرمی کا تاثر نہیں دینا' آج یہ رخصت ہو جائے' اس کے بعد کمرہ بند کرکے' جتنا رونا ہے' رو لینا۔ میں بھی آج تک روتی ہوں فیروزہ کو' مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی۔"

نانی ستارہ کے لہجے میں بڑا پتھریلا سا تاثر تھا۔

"جس دن فیروزہ نے یہ چوبارہ چھوڑا تھا' میرے لیے وہ اسی دن مر گئی تھی' قبر بن گئی تھی اس کی میرے دل میں حالانکہ اس کے بعد وہ خیام کو گود میں لیے واپس آئی مگر زندوں میں کب شمار تھا اس کا' ایک سایہ تھا محض' پھر وہ سایہ بھی معدوم ہوا۔۔۔ اور یہاں کتنی ماؤں نے بیٹیوں کو سایہ بنتے اور مٹتے دیکھا ہے' ہائے! عورت کا نصیب۔ اور یہ اسی گلی کا رونا نہیں' باہر کی ہنستی کھیلتی دنیا میں بھی کہانی مختلف سہی' مگر درد کی شدت وہی ایک۔۔۔"

بولتے بولتے ان کی آواز دھیمی پڑی۔

وہ شاید تھک گئی تھیں۔

"آپ فکر نہ کریں اماں! ہو گا وہی جو آپ چاہیں گی' بس میری بچی کے اچھے مقدر کی دعا کیجیے گا' بڑی غریب طبیعت ہے' اپنے باپ پر گئی ہے' صابر' خاموش' خود دل پر سہنے کے لیے تیار' وہ بھی تو ایسا ہی تھا۔"

فیض علی کے اس دنیا سے جانے کے بعد شاید نگینہ نے اسے پہلی بار اچھے لفظوں میں یاد کیا۔

شاما چائے لے آئی تھی‘ آج بارہ ایک بجے تک صندل اور بالی صاحب کو بھی آجانا تھا اور پھر عصر کے بعد ملک صاحب کو چار لوگوں کے ساتھ۔

”قاضی گواہ سب ان کے‘ اپنی طرف سے استاد فرحت بیگ‘ دلدار اور گل ناز‘ یہ گھر کے ہی لوگ ہیں‘ ملک صاحب کا منشی سختی سے منع کر کے گیا ہے‘ لوگ اکٹھے کرنے سے۔“ نانی نے ایک طے شدہ بات کا اعادہ کیا۔

نگینہ کے ماتھے پر ہلکا سا بل آیا۔

”میرا تو دل تھا کہ بڑی دھوم دھام سے شادی کرتی‘ صندل کی کوٹھی میں بارات آتی‘ شہر کے بڑے بڑے لوگ انوائیٹ ہوتے‘ میری گیتی کا دل بھی خوش ہو جاتا۔“

”پھر وہی گیتی‘ کیوں بھولتی ہے کہ یہ شادی اس کا دل خوش کرنے کے لیے نہیں ہو رہی‘ وہ یہاں سے رخصت ہوتی یا وہاں سے اسے کوئی فرق نہیں پڑنے والا!“

نانی ستارہ نے چائے کا کپ ایک طرف رکھتے ہوئے بڑی کوفت سی محسوس کی تھی‘ ایک بات سمجھاتے سمجھاتے کتنے ہی دن گزر گئے تھے مگر نگینہ ـــــ!

شاما نے بڑی رحم بھری نگاہوں سے نگینہ کے چہرے پر آتی شرمندگی کو دیکھا۔

”کتنی عجیب سی بات ہے نا‘ پہلے کبھی تو ایسا پیار نگینہ باجی کو گیتی پر آتا دکھائی نہیں دیا‘ ہمیشہ ہی اس سے نالاں‘ صرف صندل کے گن گاتی رہیں‘ گیتی تو ہمیشہ نانی کے قریب‘ ان ہی کی چہیتی رہی‘ مگر اب تو کایا پلٹ ہے!“

”ہمارے ہاں سمجھوتے کی اہمیت ہے صرف اور یہی ہمیں راس بھی آتے ہیں‘ دل کی خوشی کا ہمارے یہاں کام نہیں ہے نگینہ! بڑی بربادی ہے دل کے پیچھے بھاگنے والوں کی۔“

مشہور تھا کہ نانی کی کہی بات حرف آخر ہوتی ہے۔ خود شاما نے کئی بار اس کا تجربہ کیا تھا‘ مگر یہاں اس ایک معاملے میں ان کا انداز خوف زدہ کر رہا تھا‘ اس جیسی معمولی نوکرانی کو ہی نہیں‘ نگینہ جیسی بہت عورت کو بھی۔

”اٹھا لے یہ ٹرے شاما!“ نگینہ نے ہاتھ میں تھاما کپ واپس ٹرے میں رکھا‘ پیالی میں آدھی ٹھنڈی چائے ابھی باقی تھی۔

”اور لے آؤں باجی!“ اس نے اٹھتے ہوئے نگینہ کی طرف دیکھا تو نگینہ نے بے دلی سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

آج بسکٹ‘ کلچوں سے بھری پلیٹ بھی یوں کی یوں ہی رکھی رہ گئی تھی‘ نانی ستارہ تو خیر علی الصبح کچھ کھاتی ہی نہیں تھیں‘ مگر نگینہ کے حلق سے خالی چائے مشکل سے ہی اتری تھی۔

”فجر کا وقت ہوا چاہتا ہے‘ اٹھ کر نماز پڑھ لو!“ اپنے پیچھے اس نے نانی ستارہ کو نگینہ سے کہتے سنا تھا۔

آج مدت بعد نانی ستارہ جان نے ریاض کا ناغہ کیا تھا۔

باہر برآمدے میں نیچے سے آتی بڑی مزے دار سی خوشبو اڑنے لگی تھی‘ دوپہر تک لمبے چوڑے کام نمٹانے تھے‘ روز مرہ میں آنے والی کچھ لڑکیاں مدد کے لیے سویرے سے آنے والی تھیں۔ ناشتے میں حلوہ پوری‘ چھولے‘ ملے حلوائی کے ہاں سے آئے تھے۔

آج کا سب سے بڑا کام نیچے پکتی ہوئی دیگوں کی تقسیم کا تھا‘ جو وہ ہمیشہ ہی بہت شوق سے کرتی تھی۔

آسمان سے جھکتا ہوا بادلوں کا غبار اور بھی گھنا اور بھی میلا ہو رہا تھا۔

”خدا کرے کہ بس آج اور بارش نہ ہو‘ بھلے کل سے شروع ہو کر پورے ہفتے بھر بھی نہ رکے مگر آج نہیں اللہ میاں!“

گیتی کو واقعی نیند آگئی تھی یا پھر اداکاری کا کمال تھا۔ صندل شہزادی کی پورے کروفر سے آمد کا شور بھی نیند

توڑنے کے لیے کافی نہ ہوا۔

بالی صاحب ساتھ تھے‘ مگر یہی بات‘ اب گلی محلے کے سارے دریچے ساری بالکونیاں‘ انہیں دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ صندل کو دیکھنے کے لیے متجسس نظروں سے بھری تھیں۔

صندل شوبز کی دنیا کا جگمگاتا نام۔

ملک کی نمبرون ہیروئن‘ جسے پڑوسی ملک سے بھی آفر آنے لگی تھیں۔

سو اس کے حسن کی آب و تاب قابل دید تھی۔ جس کسی نے بھی دیکھا‘ سحر زدہ سا ہو دیکھے گیا۔ دیگوں سے اترتے کھانے کی تقسیم کا کام بیچ میں چھوڑ کر شاما کو صندل کے استقبال کی فکر پڑی تھی۔

مگر وہ اب لوازمات سے بھری ٹرالی سے بے نیاز تھی۔

”شاما! میرے اور بالی صاحب کے لیے صرف گرین ٹی بغیر شگر کے!“

بہت دل و جان سے تیار کی ہوئی تمام اشیاء کو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

شاما کے دل کو تو ٹھیس لگی مگر ساتھ میں جن لڑکیوں نے لگ کر سارا اہتمام کیا تھا‘ وہ اور بھی زیادہ مایوس ہوئیں۔

”کیا تھا‘ جو باجی صندل ذرا سا ہی چکھ لیتیں‘ رات ہی سے دہی بڑوں کی دال بھگو کر رکھی تھی‘ صبح ہی پیس کر تیار کیے۔“ شاما نے اپنی مایوسی چھپا کر مصنوعی سی خفگی اختیار کی۔

”دماغ خراب ہوا ہے تیرا‘ صبح شام شوٹ پر ہوتی ہے صندل۔ گلا ولا خراب ہو گیا الٹی سیدھی چیزیں کھا کر تو ہے پروڈیوسر کا لاکھوں کا نقصان ہوتا ہے‘ وہ عام لڑکی نہیں ہے‘ تمہاری طرح الا بلا کھانے کے لیے ہر وقت تیار‘ میری بھی عقل کبھی کبھی کہاں گم ہو جاتی ہے۔ پتا نہیں!“

[illegible] سب نے اوپر کے زنانے میں رکھا تھا۔ شاما کا ہاتھ نہیں جا رہا تھا‘ چھل چھاند کر وہ بھی اتارا۔

”ورنہ اس میں بہت نانا۔ نانی کے کمرے کے سامنے۔ جاؤ نیچے چوکریانے کا کام نمٹاؤ‘ میں ابھی آتی دس منٹ میں۔“

وہ ساری خاموشی سے نیچے اتر گئیں۔

”اب کیوں کھائے گی ہمارے ہاتھ کا پکا ہوا‘ یورپ امریکہ کی سیریں کر کے آ رہی ہے‘ دماغ ساتویں آسمان پر ہے‘ ایک بار اتنا بھی نہ پوچھا کہ شاما کیسی ہے تو؟ کتنی منتیں کی تھیں اس کے ہیروئن بننے کی‘ آج تک اماں رہی ہیں!“

[illegible] خاموش ہو گئے‘ جس سے لپٹے تھے بنا ایک لفظ کہے اس نے چائے پہنچائی۔

صندل کے نخرے ٹھیک سپر اسٹارز والے تھے‘ گرمی کی شکایت‘ شور کا گلہ‘ بے چینی ہی بے چینی۔ ابھی تک ایک بار بھی اس نے گیتی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا‘ جو گھر کے آخری سرے والے کمرے میں سے کتنے دن سے نہیں نکلی تھی۔

اس کی ساری دلچسپی‘ اپنی شکایتوں میں تھی یا اپنی فتوحات گنوانے میں۔

گیتی کا نکاح محض ایک سرسری سی چیز تھا‘ جیسے اس میں مجبوراً ”شرکت کرنا پڑ رہی تھی۔

بالی صاحب جلدی میں تھے‘ نکاح کے وقت ملک صاحب کے ساتھ ہی آنے کا کہہ کر رخصت ہوئے۔

”اگر ملک کے ساتھ بالی صاحب کی پارٹنر شپ نہ ہوتی تو شاید اس وقت وہ واپس آتے بھی نہیں۔ بڑا سخت شیڈول ہے‘ بڑی ذمہ داریاں ہیں۔“ اس کے پاس صرف اپنا ہی ترانہ تھا۔

وہ مستقل دہرا کر بھی بور نہیں ہو رہی تھی۔

[illegible] میں رش بڑھنے لگا تھا۔

تائی دلدار کا کنبہ، نانی ستارہ کی خاص ملنے والیاں، صندل جیسی سپر اسٹار سے اپنا تعلق جتانے کے لیے بے قرار تھیں۔

آج کا دن گیتی کا نہیں صندل کا تھا۔

فخر، غرور، حیرت، رشک اور بہت سارا حسد!

نانی ستارہ کے اس ہال نما کمرے میں ہر چہرے پر ایک سی کیفیت رقم تھی!

ایک طرف بالکل پیچھے کو ہو کر بیٹھی نگینہ نے خالی خالی نگاہوں سے ہر ایک چہرے کو دیکھا۔

اس وقت کے لیے اس نے ساری عمر انتظار کیا تھا۔ صندل کی بلندیوں کو چھوتی کامیابیاں۔

گیتی کے لیے ایک باعزت زندگی۔

آج وہ دلدار جان، گل ناز اور الماس کے حسد سے تپتے ہوئے چہروں پر جتنا دل چاہے ہنس سکتی تھی، انہیں اسی حقارت سے دیکھ سکتی تھی جس سے ساری عمرات دیکھا گیا۔

"سب شان میرے مولا کی!"

دل کی گہرائیوں سے ایک آواز اٹھی مگر نہ غرور بھری نظر نہ حقارت بھری ہنسی۔

اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست رہے اور آنکھوں میں بلا کی جلن۔

اس کے نصیب میں وہ دونوں راحتیں آج بھی نہیں تھیں۔ بڑے ہی غیر محسوس انداز میں وہ کمرے سے نکل آئی، کسی کو بھی اس کے باہر جانے کا پتا نہیں چلا۔ برآمدے کی محراب کے نیچے، شاما کی مصروفیت بھی اب آخری مراحل میں تھی۔

نگینہ نے پیشانی پر آئے پسینے کو یوں ہی ہاتھ سے رگڑ ڈالا۔

ہوا اتنی ساکت تھی کہ سانس لینا مشکل! ایسا دم گھٹتا موسم۔

برآمدے کی محرابوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ ٹھیک گیتی کے کمرے کے سامنے جا کر رکی، پتا نہیں کیا کر رہی تھی وہ اندر۔

نگینہ کا شدت سے دل چاہا تھا اندر جانے کو۔

جب سے نانی ستارہ کا ہاتھ گیتی پر اٹھا تھا، وہ چپ چاپ کمرہ بند تھی۔ کل جب تھوڑی دیر کے لیے اسے مہندی لگانے کے لیے نانی کے کمرے تک لایا گیا تھا تو وہ لمبا گھونگھٹ لیے ہوئے آئی۔ بے حس و حرکت بیٹھ کر ساری رسومات پوری کروائیں اور بنا کسی کی بھی طرف دیکھے، واپس اندر اپنے کمرے میں!

نگینہ تو کوشش کے باوجود اس کی شکل تک نہ دیکھ سکی تھی۔

اور آج بس چند گھنٹے اور! پھر تو وہ یہ چہرہ جانے کتنے مہینوں، سالوں میں دیکھا کرے گی، جب ملک صاحب مہربان ہوں ورنہ تو.....

آنکھ کے کونے پر آ کر رکا ایک آنسو نگینہ نے انگلی کی پور سے جھٹک کر گرایا۔

نانی کی سختی سے ہدایت تھی نگینہ کو۔

"دل پر پتھر رکھ لے چند دن کے لیے، سمجھ لے اسی میں گیتی کی بھلائی ہے، بالکل دور رہ۔ نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اسے تیری کمزوری کا احساس ہوا تو بس.....!"

ٹھہر ٹھہر کر ادا کیے سرد لہجے والے اس ادھورے بیان میں کھلے معنی تھے اور نگینہ بڑی تابعدار بیٹی تھی، مگر پھر بھی گیتی کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا بھی، مگر اب دیر ہو چکی تھی۔

سامنے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی گیتی دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

بکھرے ہوئے بال اور سوجی ہوئی آنکھیں۔

وہ یقیناً ان دنوں زیادہ وقت رونے میں ہی صرف کر رہی تھی۔

چند لمحوں کے لیے تو نگینہ کی نگاہ اس پر سے ہٹنا بھول گئی۔

اتنا حسن! اتنی تمکنت،

وہ حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

آج سے پہلے اسے گیتی کبھی اتنی حسین لگی ہی نہیں تھی یا پھر وہ کبھی اسے غور سے دیکھ ہی نہیں پائی، شاید اسے صندل کی آرتی اتارنے سے ہی فرصت نہیں ملی تھی، ورنہ وہ اس کے لیے بھی ممکن تھا کچھ اور سوچ پاتی۔

"امی!"

"ہوں!" نگینہ کہیں دور سے جیسے واپس آئی۔

"کہاں تھیں آپ، میں کب سے.....!" وہ بڑی بے قراری سے جو کچھ کہنے جا رہی تھی، نگینہ کے لیے سننا ممکن نہ تھا۔

"بہت سارے کام باقی پڑے ہیں، صندل آگئی ہے، میں اسے بھیجتی ہوں تمہارے پاس۔"

نگینہ وہیں سے کہتے ہوئے واپس مڑی تھی۔

"امی پلیز!" بڑی ہی درد بھری پکار تھی، لرزتی ہوئی۔

نگینہ کا قدم دہلیز پار کرنے سے پہلے زمین پر جما تھا۔

"امی! ادھر دیکھیں میری طرف۔"

نگینہ کا دل بری طرح کانپا، گیتی کی آواز میں بڑا گہرا خوف تھا۔

کاش! وہ اسے اپنے سینے میں چھپا کر دور کہیں دور چلی جاتی، ہر خوف ہر آزمائش سے بچا کر۔ نچلے لب کو سختی سے دانتوں تلے دباتے ہوئے نگینہ نے پہلی بار زندگی کی سب سے عجیب آرزو کی۔

"امی! امی!" ایک گردان تھی۔

کمزور کرنے والی، دھوکے میں ڈالنے والی۔

ویسے بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے والوں کو پتھر کا کرتی ہے، نگینہ کو یاد تھا۔

مگر وہ تو کب کی پتھر بن چکی تھی۔

مدتوں پہلے ہی۔

زمانے کے سرد و گرم سہ لینے کے بعد شکستہ دراڑوں سے پر۔

اب تو ذرا سی بھی ٹھیس سے چورا چورا ہونے کے لیے تیار!

یہاں ابھی زندگی سے جڑے کچھ اور کام بھی منتظر تھے۔

"میں صندل کو بھیجتی ہوں تمہارے پاس۔" اس نے اپنی ہی بات کو دہرایا اور باہر نکل آئی۔

شاید اس نے پھر پکارا تھا۔

بند دروازے سے ٹیک لگائے نگینہ کو ایسا ہی لگا مگر اب وہ دروازہ کھولنے کی غلطی نہیں کرنے والی تھی۔

برآمدے کے اس آخری انتہائی گوشے میں صرف وہی اکیلی تھی، بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی۔

آنسوؤں سے بھیگا چہرہ لیے، دیوار کا سہارا لے کر، وہ سامنے والی محراب کے تلے آ کر کھڑی ہوئی۔ نیچے دیکھیں

ہٹانے کا کام تیزی سے شروع تھا۔ آنے والے معزز مہمان کے لیے صفائی اور سجاوٹ ہو رہی تھی۔ شاہ فراغت بیگ، کچھ اور مخلص شناسا چہرے۔

"محبت کرنے والوں کا دم کتنا غنیمت، مگر پھر بھی نہ اس کی خوش قسمتی میں شک اور نہ بد قسمتی میں۔"

ریلنگ پر ٹکے نگینہ کے ہاتھ پر ٹپ ٹپ پانی کے قطرے گرے تھے۔ وہ ٹھیک سے سمجھی بھی نہیں تھی کہ پیچ یک دم سراسیمگی سی پھیلی۔

نارمل انداز میں کام کرتے ہوئے لڑکوں میں ایک دم ہی پھرتی کا احساس جاگ گیا تھا۔

چوبارے کی نچلی منزل میں خالی دکانوں کے شٹر آج اٹھے ہوئے تھے، تیزی سے دیگوں کو وہاں اندر کیا جانے لگا۔

پانی کی ایک تیز بوچھاڑ نے نگینہ کا چہرہ اور کپڑے بھگوئے تھے۔

"بڑا زور کا مینہ برسنے والا ہے، جلدی جلدی سب اندر کرو۔" آسمان کی طرف منہ اٹھائے، استاد فراغت بیگ کہہ رہے تھے۔

گہرا سرمئی غبار نیچے اور نیچے جھکتا چلا آ رہا تھا اور مٹی کی خوشبو لیے کہیں دور سے اڑ کر آتی ٹھنڈی ہوا۔ بادل جھوم کر برسنا شروع ہو گئے تھے۔ نگینہ نے الجھن بھرے انداز میں اس بھیگتے ہوئے منظر کو دیکھا۔

"پتا نہیں اب کیا ہونا باقی ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ لوگ ابھی ناشتے کی میز پر ہی تھے کہ زوبیہ کی آمد ہوئی۔

شیشے کے بڑے سے دروازے کے دوسری طرف سے [illegible]

"یہ اتنی صبح کیسے؟" یوسف کمالی نے [illegible] انداز میں سامنے [illegible] کی طرف دیکھا۔ "جو دوسرے دن یہیں موجود ہوتی ہے، لگتا ہے [illegible] میں بسایا جا رہا ہے۔"

زوبیہ لاؤنج میں داخل ہو رہی تھی اور ابھی ڈائننگ ٹیبل سے اتنی دور تھی کہ ان کے اس [illegible] تبصرے کو سننے سے محفوظ تھی۔

"[illegible] آپ کو سب پتا ہے۔" وہ بیٹی کے استقبال کے لیے کھڑی ہو چکی تھیں، سو جھنجلا کر ادھوری سی ہی یاد دہانی کروا کر آگے بڑھ گئیں۔

وہ پھر سے اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

زوبیہ ماں کے ساتھ سامنے ذرا فاصلے پر صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔

"السلام علیکم پاپا!" اس نے وہیں سے پکار کر کہا تھا۔

پتا نہیں انہوں نے سنا بھی یا نہیں، زوبیہ چند لمحے منتظر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی بھی رہی۔

"دل برا مت کرو، اپنے باپ کی عادت پتا ہے تمہیں، کبھی کبھی یوں ہی کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ناراض رہتے ہیں۔" ماں نے اس کی دل جوئی چاہی تھی۔

"نہیں ممی! میرے ساتھ وہ پہلی بار ایسا کر رہے ہیں، اس طرح تو وہ تب بھی ناراض نہیں ہوتے تھے جب میں نے سلمان سے شادی کا فیصلہ کیا تھا، مجھے اچھا برا ضرور سمجھایا تھا، مگر سختی سے مخالفت نہیں کی تھی، انہوں نے لاکھوں روپیہ خرچ کیا، کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی مجھے دینے میں، اب اگر یہ شادی نہیں چل پا رہی تو......"

"وہ اس قابل تھا ہی نہیں لالچی مکار، ناکارہ، کاش! یوسف نے اس وقت تمہاری بات نہ مانی ہوتی۔ میں تو شروع سے ہی مخالف تھی، اگر یوسف میرا ساتھ دیتے تو یہ شادی ہوتی ہی نہیں۔"

بیگم کمالی نے زوبیہ کی بات کاٹی تھی۔

زوبیہ نے ملکے سے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اس وقت جتنی سلمان کے پیچھے پاگل ہو رہی تھی، آپ کی مخالفت کی بھی پروا نہیں کرنے والی تھی۔ کورٹ میرج بھی کر سکتی تھی، یہ بات سمجھ لی تھی ممی! انہیں میری ضدی طبیعت کا آپ سے زیادہ اندازہ ہے۔" اپنی بات کے اختتام پر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

وہ بڑی بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی اور اس کے کپڑے بھی شکن آلود تھے۔

بیگم کمالی کا دل آج کل اس کی طرف سے مستقل ہی دکھی رہتا تھا۔

پیسہ، گاڑی، گھر، کچھ بھی تو زوبیہ کی خوش گوار زندگی کا ضامن نہیں بن سکا تھا۔

"بدبخت کہیں کا نیچ خاندان۔ پہلے دن سے ہی اس کی ماں اور وہ بہن گل، زہر لگتے تھیں مجھے۔ شکر ہے کہ تم نے ان کو سر پر نہیں چڑھایا، ورنہ آج تمہارے گھر پر قبضہ کیے بیٹھی ہوتیں، میں ان کا سارا پلان سمجھ رہی تھی اور اب یہ اس کے باپ کے غبن کا معاملہ......"

ہم تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ وقفے وقفے سے کتنے ہی دنوں سے یہ باتیں دہرائی جا رہی تھیں ہر بار سوائے کوفت اور پچھتاووں کے کچھ بھی حاصل نہیں۔

"وہ فون کر رہا ہے ممی! معافیاں مانگ رہا ہے۔"

"تم کیا چاہتی ہو، پہلے خود سے کنفرم کرو۔ اسے چھوڑنا یا اس کے ساتھ رہنا۔" کمالی صاحب قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ "ایک بار فیصلہ کر لو گی تو سب کچھ آسان ہو جائے گا، مگر بار بار خود کو تماشا مت بنانا۔ آگے زندگی پڑی ہے، اچھا برا کچھ بھی ہو سکتا ہے، کوئی گارنٹی نہیں اور کوئی دے بھی نہیں سکتا۔"

ان کا [illegible] کسی دوسرے کے جانے والے کو کوئی سرسری سا مشورہ دیا جا رہا ہو۔

زوبیہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھے گئی۔

"خیر ہم تو اپنی بیٹی کی اچھی زندگی کی ضمانت دے سکتے ہیں، کروڑوں کی جائیداد کی مالک ہے، کس چیز کی کمی ہے اسے کے لیے۔"

بیگم کمالی کو نہ ان کی لاتعلقی اچھی لگی تھی اور نہ ہی صاف گوئی۔

"پیسے میں بڑی طاقت ہے یوسف اور آپ کب سے مڈل کلاس والے ڈائیلاگ بولنے لگے۔"

ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے اس بے حد معمولی نقوش والی عورت کو دیکھا، جو اس وقت بھی بے حد قیمتی زیوری اور لباس کے باوجود ذرا بھی قابل توجہ نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ ساری عمر ساتھ گزارنے کے باوجود ہی ایک کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلے پر کھڑی اجنبی عورت۔

"تم نہیں سمجھو گی، مگر میں جانتا ہوں کہ قسمت کروڑپتیوں کی اولاد کو بھی لاوارثوں کی طرح چھڑواتی ہے، پیسہ خوش بختی کی دلیل نہیں ہے، قسمت کا بھید کچھ دوسرا ہی ہے۔"

اپنی بات ختم کر کے وہ سیل فون پر کوئی نمبر ٹرائی کر رہے تھے، سو ان دونوں ماں بیٹی کو خاموش ہونا پڑا۔

"معلوم نہیں کہاں ہے، صبح سے چار پانچ بار ٹرائی کر چکا ہوں۔"

عجیب سی پریشانی کے ساتھ انہوں نے شاید خود ہی سے کہا تھا۔

"کون؟ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"ہوں۔" انہوں نے چونک کر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا، جس سے نگاہ بچاتے ہوئے زندگی گزارتے چلے آئے تھے۔

"[illegible] کی بات کر رہا ہوں، معلوم نہیں کہاں ہے مل ہی نہیں رہا، مستقل فون بند ہے۔"

”زرتاج آنٹی سے فون کرکے پوچھ لیجیے، انہیں تو خبر ہوگی۔“ زوبیہ کے لہجے میں اتنی دیر بعد پہلی بار کچھ دلچسپی کا جھلکی۔

”نہیں، میرا خیال ہے مجھے خود جانا چاہیے۔“ وہ کہتے ہوئے ابھی سوچ رہا ہو، تھوڑی دیر بعد نفس سے اٹھ کر اس کی طرف جاؤں گا، زرتاج اور اس کا وہ شوہر کبھی بھی سالار کے بارے میں صحیح جواب نہیں دینے والے۔ چلتا ہوں میں۔“

تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھے اور پیچھے پیچھے۔

”زوبیہ کے ساتھ کچھ دیر تو بیٹھ جایا کریں، وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے، مشورہ کرنا چاہتی ہے تسلی سے۔“ بیرونی دروازے سے باہر نکل کر جب وہ پورچ کی طرف اترتی سیڑھیوں پر تھے، بیگم کمالی ان سے کہہ رہی تھیں۔

”مشورہ میں اسے دے چکا ہوں، تم نے بھی سن لیا ہوگا، پہلے بھی وہ خود مختار تھی، آج بھی ہے۔“ ذرا رک کر انہوں نے ناگواری سے مڑ کر دیکھا۔

”اگر اپنی زندگی سے اس نے کچھ سبق لیا ہے تو شاید بہتر فیصلہ کر ہی لے گی، ورنہ۔۔۔“ ہاتھ سے ایک خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور نیچے اتر گئے۔

”سارے زمانے کا درد آج کل دل میں سما گیا ہے، ورنہ تو کسی طرف دیکھنا گوارا نہیں تھا۔ اب یہ حال ہے کہ اپنی اولاد سے زیادہ سالار کی فکر ہے۔ میں کہتی ہوں آخر ہمارا کیا واسطہ، صرف بہن کی سوتیلی اولاد اور بہن خود دس سوتیلوں کے برابر۔“

غصہ میں تیز تیز بولتے ہوئے وہ زوبیہ کے پاس آ بیٹھیں، زندگی کی ساری سوئیاں پیچھے کی طرف ہٹتی دیکھنے لگی۔

”سالار رہو نہ ہو، یہ ہمارا مسئلہ کب ہے، صاف جواب دے چکا ہے کہ وہ تم سے شادی نہیں کرنے والا، پھر بھی ان کی محبت ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے اس سے۔ اب دیکھو کیسے بے تاب ہو کر نکلے ہیں اور یقیناً تھوڑی دیر بعد ضرور زرتاج کے گھر بھی پہنچ جائیں گے۔“

جب سے کمالی صاحب نے صاف لفظوں میں ایسے کسی امکان کو رد کیا تھا جو زوبیہ کی سالار کے ساتھ وابستگی کی طرف اشارہ کرتا تھا، ان کی دلچسپی یکسر ختم ہو چکی تھی۔

”سالار کا پیسہ زرتاج کھائے یا پھر کوئی اور۔ ہمیں کیا فائدہ ہو رہا ہے جو۔۔۔“

بیزاری سی بیزاری، غرور سے تنی گردن، زوبیہ آنکھوں میں الجھن لیے ان کے خاموش ہونے کی منتظر تھی۔ مگر۔۔۔

”پاپا نے کس کروڑپتی کی اولاد کو لاوارثوں کی مانند چھوٹتے ہوئے دیکھا ہے، ممی؟“

اس نے دفعتاً ہی ان کی بات کاٹی، بیگم کمالی نے بہت حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب!“

”وہ ہی تو آپ سے پوچھ رہی ہوں۔“ اس کی آنکھیں ان کے چہرے پر جمی تھیں۔

”مجھے کیا پتا۔“ ان کی آواز لڑکھڑائی اور الفاظ گم۔

”آپ کو کیوں نہیں پتا ہوگا، سب سے پہلی بیوی ہیں آپ ان کی۔“ وہ اپنا مسئلہ اس وقت مکمل طور پر بھولی تھی۔

”بیوی ان کی صرف میں تھی اور تم ان کی اکلوتی اولاد اور جو کچھ پوچھنا ہے، وہ اپنے باپ سے پوچھنا۔“

زوبیہ کی مستقل بھی نگاہ سے خائف ہو رہی وہ تھوڑا رخ موڑ کر بیٹھیں۔ وہ پھر بھی ان کی ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج چھٹی نہیں تھی۔

مگر دن ہزار چھٹیوں سے بھی زیادہ آرام دہ، مطمئن، مزے والا۔

نبیل نے بڑے اطمینان سے کٹے ہوئے سیب کی ایک قاش اٹھا کر منہ میں ڈالی اور ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے چینل بدلا۔

لاؤنج میں عجیب سی بے ترتیبی پھیلی تھی۔

یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے برتن اور گلاس جن میں ادھ کھایا کھانا ابھی بھی پڑا تھا۔

اس کے کچھ قریبی دوست ابھی ابھی اٹھ کر گئے تھے۔ آج بڑے دن بعد وہ انہیں اندر لانے اور یہاں لاؤنج میں بٹھانے کی ہمت کر سکا تھا، بلکہ وہ خود بھی آج بہت دن بعد یہاں آکر بیٹھنے کی جرأت کر پایا تھا۔

”چلے گئے تمہارے دوست۔“ زرتاج سامنے آکر کھڑی ہوئیں۔

”ہوں!“ اس کی ساری توجہ ٹی وی کی طرف تھی۔

”اور یہ کیا حال بنا رکھا ہے، برتن تک نہیں اٹھائے ہیں ملازموں نے۔“

زرتاج کی نفاست پسند طبیعت کو گوارا نہیں ہوا تھا۔

”رہنے دو، بعد میں اٹھا لیں گے۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تو وہ ہلکے سے مسکرا دیں۔

”آج بہت خوش ہو۔“

”تم نہیں ہو کیا۔“

”ہوں تو سہی، لیکن تھوڑی سی فکر مند بھی۔“ قریب گرے کشن کو اٹھا کر اس کو قریب صوفے پر رکھتے ہوئے وہ وہیں بیٹھیں۔

”اوں ہنہ!“ نبیل نے بیزاری سے سر کو جھٹکا۔ ”کم از کم آج کوئی بدشگونی کی بات نہیں، آج میں بہت خوش ہوں، ورنہ اب تو بس مرنے کی کسر رہ گئی تھی۔“

گزشتہ دنوں کو یاد کرتے ہوئے اس نے ایک ہلکی سی جھرجھری لی۔

”بہرحال اب جو بھی ہوا اچھا ہوا، گارڈز وغیرہ میں آج بدل رہا ہوں، آئندہ کبھی اگر وہ واپس آیا بھی تو یہاں گھسنے نہیں دیا جائے گا۔“ لہجے میں وہی غرور جو گزرے ہوئے اچھے دنوں کی دین تھا۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، وہ صرف گیا ہے، مرا نہیں اور اسے یہاں آنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا، کوئی الٹی سیدھی حرکت مت کرنا، ہم پہلے ہی بہت کچھ بھگت رہے ہیں۔“ زرتاج مضطرب تھی۔

”سالار کے جانے میں کوئی تو راز ہے، ابھی تو وہ زری کی ایف آئی آر کھلوا کر بیٹھا تھا، یاد ہے نا اس روز پولیس نے کتنے مشکوک انداز میں تفتیش کی ہے ہم سے۔“

”تم بہت فکریں پالتی ہو، تمہاری خوب صورتی ماند پڑنے لگی ہے شاید اسی لیے۔“ چینل پر چینل بدلتے ہوئے وہ ہلکے سے ہنس پڑا۔

”سب سے بڑی میری فکر تو تم ہو نبیل، جسے میں پال رہی ہوں۔“ زرتاج کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔

”روما“ وہ اپنے اوپر کیے ہوئے طنز پر بری طرح برا مانتا تھا، مگر آج خلاف توقع ہنستا چلا گیا۔

نبیل پر ڈالی۔
"بہرحال، سالار کا تو میں معلوم کر ہی لوں گی اور اگر نہیں تو اس کی گمشدگی کی ایف آئی آر بھی کٹنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اپنے اس "پالتو" کا جو بچاؤ کر سکتی ہو کر رکھنا۔"
ایک کھلی وارننگ دے کر وہ واپس پلٹ کر باہر نکل آئی تھیں۔
زرتاج جانتی تھیں کہ پیچھے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔
"تم نے میرے گرد مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر دیے ہیں نبیل! کیا ضرورت تھی اس طرح ری ایکٹ کرنے کی؟ یوسف بھائی کی طرف سے آج آخری امید بھی ختم ہوئی، صرف تمہاری وجہ سے۔"
ایک بڑا ہنگامہ برپا کر لینے کے بعد وہ خاموش بیٹھا تھا۔ چھوٹے سے چھوٹے سے بڑی مچھلی کا شکار کرنے کا خواہش مند، نچلے سے بھی نچلے ترین درجے پر گر کر اپنا مفاد، اپنی ہوس، اپنی غرض پوری کرنے والا۔
سوسائٹی کے "کنفرم کمینوں" میں سے ایک۔
زرتاج کے بڑے سارے گیٹ سے باہر نکلتی ہوئی گاڑی ایک لمحے کے لیے رکی تھی۔ یوسف کمال نے شیشہ نیچے کرتے ہوئے گیٹ پر کھڑے گارڈ کی طرف دیکھا۔
"راجو کہاں ہے؟"
"سر! وہ سالار صاحب کے ساتھ گیا ہے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھایا تھا۔" وہ مؤدب سا ہو کر آگے آیا۔
"ہوں۔" ایک بڑا نوٹ بطور بخشش لے کر گارڈ نے ادب سے سر جھکایا تھا۔
"چلو!" انہوں نے اپنے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔
"سو اگر راجو بھی ساتھ ہے تو کیا واقعی یہ نبیل کا ہی کیا دھرا ہے۔"
وہ روزی کے کیس میں الجھے تھے، سوچ میں کہیں ہی گھومتا تھا۔
"لیکن ابھی تو وہ ٹھیک سے چل بھی نہیں پا رہا۔ ڈاکٹر سے بھی کچھ دنوں بعد اپائنٹمنٹ تھا۔" وہ فکر مندی سے پھر کوئی نمبر ملانے لگے۔
"کوئی تو سرا ملے آخر۔"

☼ ☼ ☼

آسمان سے ٹوٹ کر پانی برسا تھا۔ بارش ہی بارش، جیسے آج کے بعد پتا نہیں کب برسنے کا موقع ملنا تھا۔ پانی کی آنکھوں کے آگے تنی چادر، چند فٹ سے زیادہ کچھ دیکھنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔
سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر، جگہ جگہ کھڑی بند گاڑیاں اور پانی میں شپ شپ نہاتے بچوں کے غول۔
آسمان پر بادل تھے کہ تہ در تہ جھکتے ہی چلے آ رہے تھے۔ گہرے سرمئی اندھیرے میں ڈوبتی ہوئی سہ پہر اور بھی خاموش ہوئی۔
"میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اس وقت منزل پر پہنچنا بڑا مشکل ہو گا، اچھا ہوتا ہم کچھ دیر کہیں رک کر انتظار کر لیتے اب دیکھیں ایئرپورٹ سے نکلے کتنی دیر ہو چکی ہے، ورنہ یہ راستہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں تھا۔"
"ہوں۔" اتنی دیر سے وہ جیسے صرف اس کی تسلی کے لیے کسی کسی بات پر ہوں ہاں کر رہا تھا۔
"آپ پہلے بھی کبھی لاہور آئے ہیں؟" اس بار سوال ایسا تھا کہ جواب دینا لازمی ہوا تھا۔
"آتا رہتا ہوں۔"

"جی، غائب ہی۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔
شاید عام حالات میں وہ اس کی مسکراہٹ پر اچھا خاصا برا مان لیتا مگر اس وقت محض ایک گہری سانس لے کر سیٹ کی پشت سے سر ٹکایا تھا۔
"آپ کی طبیعت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔"
"ہوں۔"
"کوئی ایکسیڈنٹ وغیرہ۔"
"ایسا ہی سمجھ لو۔"
اس نے مختصراً" قصہ تمام کرنا چاہا، تو چند لمحوں کے لیے واقعی خاموشی چھا گئی۔
سڑک پر کھڑے پانی کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم تھی۔ باہر نیم اندھیرے میں چپ کھڑی کتنی ہی عمارتیں قریب سے گزرتی چلی گئیں۔
"کرایہ تو آپ ڈبل ہی دیں گے نا؟" گو مسافر کی شرافت پر اب تک اسے بھروسا ہو چکا تھا، لیکن پروفیشنل ازم کا بھی کچھ تو تقاضا تھا۔
"جو تم سوچ رہے ہو، اس سے بھی کہیں زیادہ، مگر پلیز اپنی اسپیڈ تو بڑھاؤ۔"
وہ ہلکے سے مسکرایا۔
"آپ فکر ہی مت کریں، بیس سال ہو گئے ہیں گاڑی چلاتے ہوئے... بس ابھی پہنچے۔"
اس بار اس کا پورا ایکسپائر ٹرو بڑھا رہا تھا۔
"یہ برسات اور ایسے میں تو روز ہی آتی ہیں تو پھر یہ ہی کیا۔ کیوں بھائی؟" اس نے ہنس کر برابر میں بیٹھے شخص سے پوچھا جس کے منہ سے اتنی دیر میں ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔
اس بار بھی اس نے جواب دینے کا تکلف نہیں کیا۔
"کیا یہ شخص بول نہیں سکتا؟" وہ پوچھے بغیر نہیں رہا۔
"نہیں۔"
"اور سن بھی نہیں سکتا کیا؟"
"وہ بھی نہیں۔"
"اور کوئی اور بھی خرابی ہے؟"
"ہاں۔ غصے میں جلدی آ جاتا ہے، خاص طور پر جب کوئی زیادہ بولے تب۔" اس نے اپنے لہجے میں دانستہ تھوڑی سی فکرمندی شامل کی۔
"کمال ہے اور آپ ایسے خطرناک آدمی کو ساتھ لیے پھرتے ہیں۔"
اس بار اس کی آواز میں شگفتگی کے بجائے خوف نمایاں تھا۔
"خطرناک کی کیا بات ہے، میں نے بتایا نا کہ اگر کوئی مستقل ہی بولتا رہے تب اسے غصہ آتا ہے، ورنہ کسی کو کچھ نہیں کہتا، سکون سے رہتا ہے، اب دیکھ لو تمہیں کچھ کہا اس نے۔"
"تو پہلے سے بتانا تھا نا آپ نے، میں خوامخواہ میں اتنی دیر سے..."
اس بار اس نے اپنی بات پوری کرنا بھی ضروری نہیں سمجھی۔
بڑی دیر بعد اسے خاموشی کی نعمت نصیب ہوئی۔ آگے سیٹ پر بیٹھا راجو بہت دن بعد چپکے سے مسکرا دیا۔
جانے پہچانے راستے نظر آنے لگے تھے، آگے چند موڑ اور بس۔

ان کے انداز میں "حد ادب ملحوظ" [illegible] کی [illegible] بھی [illegible] تھی۔
سالار کی نگاہ اتنی دیر میں پہلی بار گیتی کے چہرے سے ہٹ کر نانی ستارہ کی طرف اٹھی۔
"آپ ایسا نہیں کر سکتیں' کوئی بھی ایسا نہیں کر سکتا' کسی کو بھی حق نہیں ہے کہ وہ گیتی کو مجھ سے جدا کرے۔
اس لیے کہ قدرت نہیں چاہتی کہ ایسا ہو۔"
ایک ایک لفظ پورے یقین کے ساتھ اس کے لبوں سے نکلا اور کمرے کی فضا میں جامد ہوا۔ ایک بھید بھرا سا
سناٹا پورے کمرے میں پھیلا۔
"یہ کیا تماشا ہے بالی صاحب! عین وقت پر اس طرح بدمزگی؟" ملک کے ساتھ آئے کسی خیر خواہ نے بالی صاحب
جیسے دوسرے معزز کی طرف دیکھا تو جیسے سب ہی اپنے حواسوں میں واپس آئے۔
"سالار' وہ ہی ماسٹر نا' جو گیتی کو پڑھانے آتا تھا؟"
"ہاں' وہ ہی' مگر اتنے عرصے بعد آج کے دن؟"
"بڑا خرچا ہوا ہے جی' اب ایسی بے عزتی۔" ہال میں یہاں سے وہاں تک پھیلی سرگوشیاں اور تبصرے۔
تگینہ کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔
"جو اب تک نہیں آیا تھا تو آج بھی نہ آتا سالار۔" اس نے بڑی بے بسی سے سالار کو دیکھا۔
بالی صاحب کے اشارے پر کچھ لوگ سالار کو باہر نکالنے کے لیے آگے بڑھے تھے۔
"ایک منٹ!" اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا۔ "کیا تم [illegible] بھی [illegible] خاص [illegible]۔"
"میں چلا جاؤں گا' لیکن گیتی کو ساتھ لے کر۔ چل رہی ہو تم؟" وہ [illegible] اس کے قریب آیا۔
"تم سے پوچھ رہا ہوں' چل رہی ہو میرے ساتھ؟"
ایک طلسم کا خاتمہ ہوا۔
ایک دم گھونٹ حبس کا خاتمہ۔
نانی ستارہ کی مضبوط گرفت سے ہاتھ چھڑا کر وہ اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔
وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔
سالار نے بہت نرمی سے اس کے یخ ہاتھ کو تھاما۔
"یہ کیا بے ہودگی ہے؟ تم اس طرح کیسے لے جاسکتے ہو اسے؟" نانی ستارہ کا جلال عروج پر پہنچا۔ "گیتی! اپنی جگہ
پر بیٹھو گیتی! نکاح کی رسم ہونا ہے۔"
نانی کی قہر آلود نگاہ گیتی پر جمی۔
وہ ہی نظر جس کے آگے اچھے اچھوں کا دل بیٹھ جاتا تھا' گیتی نے آج ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھا۔
"میں یہ شادی نہیں کروں گی نانی۔"
"کیا؟ دماغ خراب تو نہیں۔"
وہ ایک اشارہ کرتیں تو سالار کو گھر سے کیا' گلی سے بھی نکالنے والوں کی کمی نہیں تھی مگر۔۔۔
"بس' بات ختم۔"
ملک' پھولوں کا ہار اپنے گلے سے اتار کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "میں نکاح کرنے آیا تھا یہاں۔۔۔ اور بیوی وہ ہی اچھی
لگتی ہے جس کے دل پر کسی دوسرے کی چھاپ نہ ہو۔ مزا نہیں ہے ایسے ساتھ میں۔"
اس کے دل میں کتنا غصہ تھا' اندازہ کرنا مشکل تھا' مگر اس کی بات معقولیت لیے ہوئے تھی' مگر رنگ میں بڑا
بھنگ پڑا تھا۔

بالی صاحب جیسا آدمی بوکھلا کر ملک کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔
اس کا بڑا پیسہ لگا تھا۔
نانی ستارہ نے اپنی ذاتی ذلت' آج سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس روز بھی نہیں جب فیروزہ چوبارہ
چھوڑ کر چپ چاپ چلی گئی تھی۔
نانی دلدار جان کا خاندان' صورت حال کا مزا لینے کے لیے قریب چلا آیا تھا۔
"ہائے سارا زیور' سارا کچھ ہی واپس جائے گا چچ چچ۔۔۔ نظر لگی ہے صاف صاف۔"
اونچی آوازیں آہستہ آہستہ ہلکی پڑیں اور پھر خاموشی۔ ملک صاحب اور بالی دونوں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے
[illegible] کو بے یقینی سے دیکھا۔
"بس یا کچھ اور۔" سالار نے سنجیدگی سے ان کی طرف دیکھا تھا۔
مٹ جیسے شخص نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری اور انکار میں سر ہلایا۔
کسی نے بھی انہیں وہاں سے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ بالی خاموش سا ہو کر سالار کے قریب آکھڑا ہوا' اس
کے انداز میں بڑی مرعوبیت تھی۔
"ہماری جو ذلت ہونا تھی ہو گئی۔ اب تم چلے جاؤ یہاں سے اور خبردار جو کبھی۔۔۔" نانی کے غیظ و غضب کے
[illegible] تگینہ ہاتھ جوڑ کر کھڑی تھی۔
"[illegible] سالار [illegible] میں نے بڑی دعائیں مانگی تھیں اس کی خوشی کے لیے۔۔۔ مجھ گناہ گار
[illegible]۔"
روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی' نانی ستارہ کا چہرہ بے تاثر تھا۔ استاد فراغت بیگ نے کانپتے ہاتھوں سے گیتی
[illegible] اور پھر سالار کو اس کے برابر۔
"بسم اللہ کیجیے قاضی صاحب!" تگینہ نے پہلی بار ماں ہونے کا حق استعمال کیا۔

(باقی آئندہ ماہ)

راشدہ رفعت

سارے خاندان' برادری کی مخالفت مول لے کر خادم حسین نے گاؤں کی زمینیں بیچ کر شہر کا رخ کیا تھا حالانکہ زمینیں سونا اگلتی تھیں لیکن اس کے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ شہر جا کر بچوں کو اچھی تعلیم دلواؤں گا۔ خود تو وہ باوجود خواہش کے دس جماعتوں سے زیادہ نہ پڑھ پایا کہ میٹرک میں اچھے نمبروں کے باوجود ابا نے شہر کے کالج میں داخلے کی اجازت نہ دی تھی مگر اب وہ خود چار بچوں کا باپ تھا اور اپنے ہر فیصلے میں خود مختار تھا۔

بے شک اس کی رفیقہ حیات سیدھی سادی دیہاتی عورت جو شوہر کے آگے حرف آخر جانتی تھی' سامان اسباب سمیٹ کر اس کے ہمراہ شہر آن بسی۔ خادم حسین نے شہر آ کر آڑھت کا کام شروع کیا۔ چند برسوں میں ہی اللہ نے کام میں اتنی برکت ڈالی کہ زمینیں بیچنے کا رہا سہا ملال بھی ختم ہو گیا۔ خوب صورت دو منزلہ گھر تو بے شک گاؤں کی زمینیں بیچ کر خریدا تھا مگر اس کی آرائش و زیبائش' قیمتی ساز و سامان' گاڑی' نوکر چاکر غرض سب کچھ جدید شہری تقاضوں کے مطابق تھا۔

بچے بھی شہر کے بہترین اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ گاؤں سے جو بھی رشتہ دار ان سے ملنے آتا' قسمت پر رشک کا اظہار کرتا' ہاں! مگر ایک بات کا سب اعتراف کرتے کہ دولت کے باوجود دونوں میاں بیوی کا مزاج نہ بدلا تھا' وہ مزید منکسر المزاج ہو گئے تھے۔ حلیہ بھی صرف اتنا بدلا تھا کہ خادم حسین شلوار قمیص کے اوپر واسکٹ لینے لگا تھا اور ہاجرہ برقعہ چھوڑ کر چادر پہننے لگی تھی۔

وہ لوگ اگر دوسرے رشتہ داروں کی طرح دیہاتی نہ لگتے تو بالکل شہری بھی نہ لگتے۔ اپنی اقدار سے نہ انہوں نے ناتا توڑا تھا نہ اپنے بچوں کو شہر کی آزاد فضاؤں میں شتر بے مہار چھوڑا تھا۔ لڑکوں نے تو خیر ہوش ہی شہر کی فضا میں سنبھالا تھا' سو خادم حسین ان کی طرف سے فکر مند ہی رہتا کہ کہیں بگڑ نہ جائیں' ان کی وہ کڑی نگرانی کرتا۔ ہاں اپنی زہرہ کی طرف سے وہ بالکل بے فکر تھا۔

اس کی بڑی بیٹی زہرہ جیسے ماں باپ دونوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی' دس برس کی عمر میں ماں باپ کے ساتھ شہر ہجرت کرنے والی زہرہ اس چکا چوند روشنیوں والے میں شہر میں رہتے بھی گیارہ' بارہ برس ہونے کو آئے تھے مگر ابتدائی دس برس جو اپنی بے بے کے زیر سایہ گاؤں میں گزارے تھے اس کے اندر سے نہ نکل پائے تھے۔

خادم حسین کی مرحوم ماں بہت متقی عورت تھی پابند صوم و صلوۃ' تہجد گزار' پرہیزگار اور زہرہ بالکل اپنی دادی کا پرتو تھی' صورت میں بھی اور سیرت میں بھی' خادم حسین کو جیسا نور اپنی ماں کے چہرے پر جھلکتا ملتا' زہرہ کو دیکھتا تو بے ساختہ ماں یاد آ جاتی۔ زہرہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی مگر اس کی معصومیت نے اسے عجیب ہی حسن عطا کیا ہوا تھا اور یہ زہرہ کا حسن ہی تھا کہ اس کے گریجویشن کرتے ہی شہر کے امیر کبیر اور معزز گھرانے سے اس کے لیے پیام آ گیا۔ ہاشم احمد کاروبار کی دنیا کا جانا پہچانا نام تھا۔ ایک مشترکہ دوست کے ذریعے خادم حسین اور ہاشم احمد کی جان پہچان

تھی۔ اسی دوست کے گھر ایک تقریب میں ہاشم احمد کی بیوی نے زہرہ کو دیکھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔

خادم حسین کو اپنی خوش بختی پر یقین نہ آتا تھا' ایسا شان دار بر اس کی بیٹی کو اور کہاں سے ملنا تھا۔ ارسلان ہاشم خوبرو تھا' ولایت کا پڑھا ہوا اور پھر شہر کے امیر کبیر گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ رسمی طور پر سوچنے کی مہلت مانگنے کے بعد اس نے زہرہ کے لیے آیا ہوا پیام قبول کر لیا۔

ہاں کرنے کی دیر تھی کہ لڑکے والوں کی جانب سے شادی پر اصرار شروع ہو گیا۔ خادم حسین اتنی جلدی شادی کے حق میں نہ تھا۔ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو یوں اچانک کسی کے حوالے کرنا آسان تھوڑی ہوتا ہے لیکن بیٹیاں تو بادشاہوں کی بھی ہوں انہیں وداع کرنا ہی پڑتا ہے' سو یہ ہی سوچ کر زہرہ کو ارسلان کے سنگ رخصت کر دیا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں تو ارسلان زہرہ کے مبہوت کر دینے والے حسن میں گم رہا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے زہرہ کی شخصیت میں

دکھائیں' پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔

"برادری میں کسی کو یہ بات نہیں پتا کہ بہو کا ایک نکاح پہلے بھی ہو چکا تھا لیکن یہ بات نہ تجھ سے ڈھکی چھپی ہے نہ ہم سے' تیری بھابھی کلثوم نے بتایا تو تھا کہ دلہن کا نکاح چند مہینوں کے لیے کسی دوسرے بندے سے رہا ہے مگر رخصتی سے پہلے ہی اس کے ماں باپ نے طلاق لے لی تھی۔ اس وقت تو تو کچھ نہ بولا' بہو کی تصویر دیکھ کر ریجھ گیا تھا۔ تیری ہی خواہش تھی کہ شہری لڑکی سے تیرا بیاہ ہو' اپنے گاؤں کی ساری لڑکیاں تو تجھے گنوار لگتی تھیں' پھر اب کیا مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے میری بھولی ماں کہ بھرجائی کلثوم نے ہم سے غلط بیانی کی تھی' اس کی بھانجی کا نہ صرف نکاح ہوا تھا بلکہ رخصتی بھی ہوئی تھی۔ ایک میں ہی الو کا پٹھا ملا تھا اسے بے وقوف بنانے کے لیے۔" داور شاہ غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ کنیز بیگم ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے داور! کسی نے تیرے کان بھرے ہیں۔ تجھے غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ کلثوم کو کیا ضرورت تھی ہم سے غلط بیانی کی۔" کنیز بیگم نے اسے سمجھانا چاہا تھا۔

"نہیں ہوئی ہے مجھے کوئی غلط فہمی۔" داور شاہ چیخ ہی تو پڑا۔ اتنے میں کمرے میں کنیز بیگم کا چھوٹا داماد جو داور کا لنگوٹیا یار بھی تھا' داخل ہوا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں پھوپھی! داور کے تیور اتنے بگڑے ہوئے کیوں لگ رہے ہیں۔" پریشانی زبیر کے چہرے پر بھی نمایاں تھی۔

"مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے اپنے دوست سے پوچھ بلکہ سمجھا اسے' شام کو ولیمہ ہے' ساری برادری اکٹھی ہو گی۔ جانے کس نے اس کے کان بھر دیے ہیں۔" کنیز بیگم فکر مندی سے کہتی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے داور! مجھے بتا۔" زبیر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"مسئلہ؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

"مسئلہ یہ ہے زبیر صاحب کہ بھابھی کلثوم نے مجھے بے غیرت سمجھ کر اپنی بھانجی میرے سر پر تھوپ دی۔ وہ چار چھ مہینے کسی اور کی بیوی بن کر رہ چکی ہے۔" داور شاہ نے غصے سے کہا تھا اور زبیر بھی اس انکشاف پر ساکت رہ گیا۔

"تجھے کوئی۔"

"بس یار! اب اماں کی طرح تو بھی یہ مت کہہ دینا کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ بھڑکا تھا۔

"بات تو سن داور!" زبیر نے سمجھانا چاہا۔

"او بس کر یار! اب سننے کے لیے بات ہی کیا رہ گئی ہے۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ شادی پہلی بار ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت ذات میرے لیے کوئی نئی چیز ہے۔ پہلی بار کوٹھے کی دہلیز تیرے ساتھ ہی پار کی تھی' یاد ہے' ہم دونوں کی تب عمر کیا تھی' صرف انیس سال۔ ان دو برسوں [illegible] [illegible] ہوتے گے۔ او باتیں [illegible] ہے کہ رو رو کے ماں باپ اور خالہ کے سارے زیور [illegible] پاس [illegible] دیا۔ منت کر رہی تھی کہ میں اسے نہ چھوڑوں' ساری عمر میری جوتیاں سیدھی کرتی گزار دے گی لیکن داور شاہ اتنا بے غیرت نہیں ہے۔ میں کسی کا جھوٹا پانی نہیں پیتا' ایسی عورت کے ساتھ زندگی کیسے بسر کر سکتا ہوں۔"

داور شاہ غصے کے عالم میں پھنکار رہا تھا۔

"تو جا کر اباجی کو بتا دے کہ اس کے میکے والوں کو فون کر دیں کہ اپنے گھر کا گند واپس لے جائیں۔" اس نے خاموش بیٹھے زبیر کو مخاطب کیا۔

"تو فکر نہ کر داور! جیسا تو نے کہا ہے ویسا ہی ہو گا۔ اتنا بڑا دھوکا اور وہ بھی ہمارے ساتھ۔" شدید غصے سے زبیر کی پیشانی کی رگ بھی پھڑکنے لگی تھی اور چند گھنٹوں بعد خادم حسین جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ آکر بیٹی کو ساتھ لے گیا تھا۔

سلوئی علی بٹ

کہانی کا آغاز اس شخص سے ہوتا ہے جو شدید دکھ، پریشانی اور ذہنی اذیت کی کیفیت میں ہے۔ وہ اس کیفیت سے نکلنے کے لیے کسی کو فون کرنے کے لیے نمبر ڈائل کرتا ہے۔

ایک ماں اپنے بچے کی خاطر دوسری شادی کرتی ہے لیکن اس کا شوہر بچے کو رکھنے سے انکار کر دیتا ہے مجبوراً وہ بچے کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

کہانی کا تیسرا رخ ایک وہ ادھیڑ عمر عورت ہے جو ایک قبرستان میں رہتی ہے اور ایک قبر پر پھول چڑھانے کے لیے خریدتی ہے۔

ماہم اور شاہم کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ماہم کی شادی اس کے چچا زاد بھائی منصور سے ہوئی ہے اور اس نے اپنی چھوٹی بہن شاہم کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ منصور شاہم کو پوری شدت سے چاہتا ہے لیکن [illegible]
[illegible]
جاتی ہے۔ کاشا ایک تنہائی پسند مزاج نوجوان ہے۔ [illegible]
اس کی چھوٹی بہن شاہم ایک نوجوان ارسل کو چاہتی ہے۔ ارسل [illegible] رشتے پر رضامند نہیں [illegible] کے مشورے پر ارسل [illegible] کو چھوڑ کر ایک فلیٹ لے کر اس میں رہنے لگتا ہے۔ [illegible] مجبور کرتے ہیں۔

ماہم منصور کی محبت، اپنے بچوں، شوہر، عزت سب کو بھلا کر کاشا کو فون کر کے ملنے کے لیے کہتی ہے۔

مکمل ناول

کاشا کو ماہم سے صرف اس لیے دلچسپی ہے کہ منصور نے اس سے شادی کی ہے اور وہ منصور کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ [illegible] سب کچھ ہے۔ وہ بہانے بنا کر کاشا سے ملتی ہے۔ منصور جانتا ہے لیکن خاموش رہتا ہے لیکن ایک دن ماہم کھل کر سامنے آجاتی ہے اور طلاق کا مطالبہ کردیتی ہے۔

منصور ایک دم سکتہ میں آجاتا ہے ماہم روتی ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا اس لیے اس کا مطالبہ پورا کرادیتا ہے اور خود شہر سے باہر چلا جاتا ہے۔ شاہم کو گھر کے ملازمین سے پتا چلتا ہے کہ ماہم طلاق لے کر جاچکی ہے۔

۳
تیسری قسط

"آج ہم دونوں کی آخری رات ہے' کل تم اپنی بیوی کو پیارے ہوجاؤ گے۔" غنی نے بے زاری سے ٹی وی آف کرکے ریموٹ دوسری طرف اچھال دیا۔

"کیوں پہلے میں پیارا نہیں تھا' جو اب ہو جاؤں گا۔" کاشا لیپ ٹاپ پر گلوبل ویلیج کی ویب سائٹ کھولے بیٹھا تھا۔ اس کا سارا دھیان اس طرف تھا۔

"یار! مجھے تو ابھی سے یہ گھر سونا لگنے لگا ہے۔" غنی اپنی جگہ سے اٹھ کر کاشا کی کرسی کے قریب آگیا۔

اسے دوپہر میں کاشا نے فون کیا تھا کہ میں کل نکاح کررہا ہوں' جلدی آجا' سارے کام تم نے نپٹانے ہیں۔ غنی فون سن کر دوڑا دوڑا آیا تھا۔ کاشا کا ارادہ تھا کل کے بجائے آج ہی نکاح پڑھوالیتا۔ غنی اس کی پہلی شادی کو مس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"کاشا! سب کچھ بہت اچانک نہیں ہوگیا۔" غنی بہت افسردہ تھا۔ اتنے عرصے سے ان کے مابین شادی کی باتیں چلتی آرہی تھیں۔ غنی کو اب سب اچانک لگ رہا تھا۔

ماہم نے رات کو اسے اپنے اور منصور کے رشتے کے ختم ہونے کی خبر دی تھی۔ صبح اس نے ماہم کو وہاں سے پک کرکے صلاح مشورے کے بعد اس کے لیے ہوٹل میں ایک کمرہ کی بکنگ کروادی تھی۔

گلبرگ والے ماہم کے بنگلے کی صفائی کے لیے نوکر بھیج دیے تھے۔ کل کورٹ میرج کرکے انہیں سیدھا وہیں شفٹ ہونا تھا۔

"اچانک کہاں! بہت سال ویٹ کیا ہے' تب کہیں۔" کاشا نے اسکرین پر غور کرتے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیوات کاشا! چل اٹھ' تیری شادی کی خوشی میں رت جگا کرتے ہیں۔" غنی نے لاڈ سے اسے کرسی سے کھینچا۔

"[illegible] کل [illegible] [illegible] کی [illegible]۔" اس نے شرارت سے آنکھ [illegible]۔

"برطانوی [illegible] ہے تو۔" غنی نے اسے زور کا ٹھوکا جڑا۔

"ویسے شادی کے حساب سے آج رات تیری مہندی کی رات ہے' اگر تجھے تکلیف نہ ہو تو میں میز بجا کر دو چار ٹپے' ماہیے گاؤں؟" وہ پورے زور سے کاشا کے کندھے دبانے لگا۔ کاشا کا دھیان ابھی اس کی مداخلت سے ہٹا جارہا تھا۔

"فضول کام کے بجائے شرافت سے میرے کندھے دباتا جا' ساری تھکن اتر جائے گی۔" وہ مزید پھیل گیا جیسے غنی کوئی مالشیا ہو۔

"جس نے تجھے تھکن چڑھائی ہے' اسی سے اتروا جاکے۔" وہ پرامان کے قالین پہ جا بیٹھا۔ کاشا اس کی صورت پر ہنسنے لگا تو اٹھ کر قریب آگیا۔

"اچھا ٹھیک ہے' ادھر میرے ہی کمرے میں جاگیں گے' باتیں کریں گے۔"

"رائٹ' مگر میرا ذہن الجھا ہوا ہے' میں نے پوچھنا

تھا' میں بھی مذہب کے متعلق کوئی زیادہ انفارمیشن نہیں رکھتا' مگر طلاق۔۔۔ یا بیوگی کے بعد عورت۔۔۔ جو مدت۔۔۔ کیا کہتے ہیں اسے؟ ہاں عدت پوری کرتی ہے' ماہم نے وہ سب نہیں کرنا۔" غنی نے بہت مشکل سے اپنی سوچ مکمل کی۔

"فارگیٹ اٹ یار' آئی ڈونٹ نو آل اباؤٹ ویز فارملٹیز' اینڈ آل ریڈی اسٹارٹ لوز کرچکا ہوں' ناؤ نو مور' مجھے کیا لینا دینا مذہب اور اس کی پیچیدگیوں سے۔"

کاشا جیسے بندے سے اسی لادینیت کی توقع رکھی جاسکتی تھی۔

غنی کا علم بھی محدود تھا' وہ بحث میں نہ پڑا۔

"کاشا! تم ماہم کے ساتھ کیا کروگے؟"

غنی کو کاشا کے ارادے درست نہیں لگتے تھے۔ اس کے ماں بننے تک منصور سے علیحدگی ہوگئی تھی۔ غنی کا ماہم کے متعلق خیال تھا کہ یہ جو بیچ کا وقفہ ہے [illegible] [illegible] [illegible] خود [illegible] جائے گی۔ [illegible] آتش اس کے سنبھلنے کے لیے کافی ہوگی۔ کاشا اس کا ذکر بار بار کرنے کا عادی نہیں تھا۔ مگر غنی اچھی طرح جانتا تھا کہ کاشا ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا [illegible] اس سے نہیں۔

"[illegible] اسے بیوی بناتا ہے' اگلے اسٹیپ میں [illegible] کروں گا' آخر میں وہ قابل برداشت ہوئی تو۔۔۔ [illegible] ورنہ یو نو' میں خود کو اریٹیٹ (تنگ) کرنے والی [illegible] کو الگ پھینک دیتا ہوں۔" کاشا نے سچائی بتادی تھی۔

اس کی اکثر صاف گو تلخ سچائیاں سن کر غنی کو سوچنا [illegible] کہ یا تو میں کاشا کو جان نہیں پایا یا پھر وہ خود کو کسی پہ [illegible] آشکار ہونے نہیں دیتا۔ اسے کاشا سے اتنی [illegible] امید بھی نہیں تھی۔ وہ اس سے عورت کے [illegible] موضوع پر زیادہ بحث و مباحثے پر نہیں اترتا تھا۔ کاشا [illegible] کھیل کا گرو تھا۔ وہ عورت کی ظاہری' باطنی ایسی

دھجیاں اڑاتا تھا کہ اس کے کان تک سرخ ہوجاتے تھے۔"

وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے والا تھا۔ وہ بھی ایسی عورت کے ہمراہ جو اس کے لیے سب کچھ چھوڑ کر آرہی تھی۔ اسے ماہم کے اس عمل پہ غصہ کے ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ کاشا کے عزائم نے اسے اندر تک دہلا دیا تھا۔

اس نے کاشا کو سمجھانے کا ارادہ کیا۔ مگر پہلے اس کا موڈ خوش گوار کرنا ضروری تھا۔ اس نے کاشا کا پسندیدہ مشروب نکال لیا۔

"کاشا! ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔" اسے شاید مناسب الفاظ کی تمہید نہیں ملی تھی۔ اصل میں انہیں عادت ہی نہیں تھی۔ ایک دوسرے سے سوچ بچار کرکے مصلحت برتنے کی' مگر اس وقت جو وہ کہنا چاہتا تھا اور جس سے کہنا چاہتا تھا' بڑا حوصلہ درکار تھا۔

"دنیا کی ہر عورت معمولی فرق سے ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔" کاشا نے بند آنکھوں سے جواب دیا۔

غنی کچھ چپ سا ہوگیا۔ اس نے سوچتے ہوئے ذرا کی ذرا نظر اس پر ڈالی اور ایک لمبا سا گھونٹ بھر کر اسے منہ میں گھما کے حلق سے نیچے اتارا۔ ان دونوں کی سائیکی بہت سارے مقامات میں انہیں ایک جگہ پر لا کر کھڑا کردیتی تھی۔ اسی طرح چند مقامات پر وہ ایک دوسرے سے منہ پھیر کر انجان بن جاتے۔ جیسے ابھی کاشا بند آنکھوں سے غنی کے منہ سے کچھ انوکھا سننے کا منتظر تھا۔ خاموشی کا وقفہ لمبا اور بامعنی تھا۔ کاشا نے اس کی جانچ پڑتال میں مداخلت نہ کی۔

"مجھے لگتا ہے تو اپنی محرومیوں کا بدلہ ہر ایک سے لیتا ہے' تجھے۔۔۔ تجھے ہر عورت میں اپنی۔۔۔ اپنی ماں۔۔۔ ہی نظر آتی ہے۔"

اس نے سر کو شرمندگی سے جھکا کر کاشا کی سماعتوں کے لیے دھماکا کیا تھا۔

اس نے یٹ سے سرخ ہوتی آنکھیں کھول دیں۔

ابھی اس نے چند گھونٹ ہی بھرے تھے اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی لگ رہی تھیں۔ وہ کتنی دیر تک غنی کو تکتا رہا یہاں تک کہ کنپٹی کی رگ چھپکلی کی کٹی دم کی طرح پھڑکنے لگی۔

آٹھ سال قبل جب غنی اور کاشا کی دوستی ہوئی تھی۔ اس نے اس سے والدین کے متعلق استفسار کیا تھا۔ کاشا نے بتایا تھا کہ میرے سگے باپ کے مرنے کے بعد میری ماں نے اپنے آفس کے باس سے شادی کرلی اور پھر امریکہ شفٹ ہوگئی' میں اپنی نانی اور نانا کے پاس رہا۔ اپنی ماں کا یہ مختصر سا تعارف اس نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں کروایا تھا۔ تب پہلی بار غنی اس منہ پھٹ' نڈر بے باک نوجوان سے تھوڑا خوف زدہ بھی ہوا تھا۔ اتنے سال گزر گئے ان کے مابین ہر موضوع زیر بحث رہا۔ غنی نے دانستہ یا نادانستہ کبھی اس کی ماں کا نہ پوچھا۔ وہ کب فون کرتی ہیں' کرتی بھی ہیں یا نہیں۔ ان کا رابطہ کس طرح ہوتا ہے؟ وہ بالکل بے خبر تھا۔ ایک بات وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ کاشا کی اس عیاشی اور عیش پرستی کا سارا دارومدار اس کی ماں کے اس کے اکاؤنٹ میں بھیجے جانے والے امریکن ڈالرز پہ ہے۔

"تجھے کیسے پتا' میری ماں کیسی عورت تھی؟" اس نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں استفسار کیا' اس کی ساری ٹھنڈک غنی نے اپنے اندر سرائیت کرتی محسوس کی۔

"دنیا کی ہر عورت قابل احترام ہے' اچھی ہو یا بری اور پھر۔ پھر کاشا تیری ماں تھی نہیں' ابھی ہے۔" غنی نے اسے دھیمے سے یاد کروایا۔

"نہیں غنی! میری ماں ہے نہیں' تھی۔ وہ میرے لیے اسی روز مرگئی تھی جب میرا باپ مرا تھا یا شاید اس دن جب اس نے میری کفالت کے لیے گھر سے قدم باہر نکالا تھا یا جب اس نے ایک امیر آفیسر سے بیاہ کا خواب سجانا شروع کیا یا۔۔۔ یا تب غنی! جب وہ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے امریکہ چلی گئی۔" ہونٹ بھینچے وہ کسی بھنور میں پھنسا ہوا لگ رہا تھا۔

غنی کو امید نہیں تھی کہ ذرا سا چھیڑنے پر وہ اس قدر کھل جائے گا۔ اس کے اندر کی تلخ یادوں کے گدلے تالاب کے پانی میں اس نے پتھر پھینکا تھا۔ اس نے دوبارہ گلاس بھرا اور اس کے لبالب بھرے چھلکنے کا منظر بغور دیکھا۔

"میری ماں انیس سال کی ایف۔ اے پاس تھی' جب اس کی شادی میرے باپ غلام حسین ہیڈ کلرک سے ہوئی۔ ماں کچی عمر کی لڑکیوں کی طرح خوب صورت اور نازک اندام تھی۔ باپ میرا قبول صورت تیس برس کا پکی عمر کی سوچ رکھنے والا آدمی تھا۔ ماں نے شوہر کی محبت سے فائدہ اٹھا کر اپنے مزید پڑھنے کی خواہش کی تکمیل کرنی چاہی' وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں مرد یہ حساب کتاب لگاتا ہے کہ اب اولاد پیدا ہوئی تو کب اس قابل ہوجائے گی کہ ہمیں بٹھا کر کھلا سکے' مگر اس نے میری ماں کی پڑھائی کی خواہش کے سامنے اپنی خواہش دبا لی۔ جب انہوں نے بی۔ اے [illegible] میرا باپ بہت خوش [illegible] زید نہ [illegible] بچہ پیدا ہوا اس کی دیکھ بھال [illegible] اسے کون سا ڈگری کروانی تھی۔

جب میں پیدا ہوا تو ماں کا رزلٹ بہت شان دار نمبروں سے آؤٹ ہوچکا تھا۔ تھوڑا عرصہ وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے پڑھائی کی رٹ لگادی۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا' اس بار میرے باپ اور اس میں بحث و مباحثہ ہوا۔ جھگڑا اس بات پہ تھا کہ وہ پرائیویٹ ایم اے کرسکتی ہے۔ میں بھی پلتا رہا اور اس کا شوق بھی پورا ہوتا رہا۔ ماں ایم اے کے پیپرز دے کر مجھے اور میرے باپ کو مکمل وقت دے رہی تھی۔ تب ہی ایک دوپہر ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرا باپ چند لوگوں کے کندھے پہ چارپائی پر واپس آیا۔ ہیڈ کلرک غلام حسین جس بس میں کھڑا ہو کر سفر کرتا تھا۔ وہ گدھا گاڑی کو بچانے کے چکر میں فٹ پاتھ پہ چڑھ گئی اور دوسری طرف رواں سڑک کے ٹرک سے ٹکرا گئی۔ میں دو سال کا یتیم ہوگیا۔ میری ماں بیوگی کا داغ لیے اکیلی نہیں

رہتی تھی۔ وہ مجھے لیے نانی کے گھر آگئی۔ یہیں سے شاید میری بربادی کی اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ میرے دو ماموں تھے جنہوں نے میرے باپ کے گھر کے اثاثہ جات ماں سے لے کر گھر کو ہڑپ کرلیا۔

میں بڑا ہو رہا تھا۔ میری ضروریات کے لیے ماں کو ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ نانی کی منتیں واسطے کرنے پڑتے۔ ان ہی مشکل دنوں میں ماں نے میری بہتر کفالت کے لیے نانی کی اجازت سے نوکری کرلی۔ وہیں میرے اسٹیپ فادر کا آنا جانا ہوا۔ اسے رنڈوا ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا' وہ بہت امیر کبیر آدمی تھا۔ بس ماں پر دل ٹھہر سا گیا' ورنہ اسے عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ بھی ایک سچا کھرا اور سخت اصول پسند۔ اس نے ماں کو اپنی ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور پرسنل سیکریٹری جاب آفر کی۔ زیادہ پیسہ اور آگے بڑھنے کی دھن میں وہ وہاں چلی گئی۔ اندر ہی اندر چکر چلنے لگا۔

میں نرسری کلاس میں محلے ہی کے ایک اسکول [illegible] جانے [illegible] ہوتے تھے [illegible] طرف [illegible] تھا بہت ہی شریف آدمی ماں کا اکیلا دوست اور غمگسار تھا۔ اس انتہائی کے عرصہ میں اس شخص نے ماں کو [illegible] لیا۔ ان دنوں وہ بہت خوش تھی' رات کو جب میں [illegible] کے ساتھ چیٹ کرلیتا' وہ مجھ سے ڈھیروں خیالات [illegible] کرتی۔

"میرا [illegible] بڑے والے اسکول جایا کرے گا' گاڑی میں بیٹھ کے' مہنگے والے کپڑے بھی دلوا دیں گی۔" وہ اپنے خوابوں میں مجھے بھی اس امیر کبیر کے [illegible] میں کھیلتا دیکھتی تھی۔

میری بہتر زندگی کی خاطر اس نے اس تینتالیس سالہ [illegible] سے شادی کرلی' جس کی دو جوان بیٹیاں تھیں اور [illegible] اپنی ماں کا اکلوتا' دونوں اطراف سے بچوں کا معاملہ [illegible] نہیں ہوا تھا۔ ماں تو بس میری انگلی تھامے اس [illegible] بنگلے کا گیٹ پار کرجانا چاہتی تھی۔ اس کی آنکھ تو [illegible] کھلی' جب اس کے دو گھنٹے قبل بننے والے امیر [illegible] اصول پسند شوہر نے مجھے اپنی گاڑی میں

بٹھانے سے انکار کردیا۔ اس نے نہایت بے دردی سے کہا۔

"یہ بچہ ساتھ نہیں جاسکتا۔"

یہ جملہ آج تک میرے کانوں میں گونجتا ہے' بہرحال قصہ مختصر وہ روتی دھوتی اس کے ساتھ چلی تو گئی پر اس کا سارا دھیان میرے پیچھے لگا رہتا۔ ماں میرے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اور وہ ماں تھی' چار ماہ کی دوری میں ماں نے کوئی چار سو چکر نانی کے گھر کے لگائے۔ تب اس کم گو شخص نے بیچ کا رستہ نکال لیا۔ اس نے بکھیڑا ہی سمیٹ ڈالا۔ سارا بزنس وائنڈ اپ کرکے کروڑوں اکٹھے کیے اور امریکہ بسنے کی تیاری کرلی۔ ماں بہت روئی تڑپی' وہ نہ مانا۔ اس کے پیش نظر اپنی بیٹیوں کا مستقبل تھا۔ جنہیں وہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھانے کا خواہاں تھا' میں جاتا بھاڑ میں۔

وہ آخری بار مجھ سے ملنے آئی' میں سو رہا تھا' وہ مجھے سوتا چھوڑ کر چلی جاتی' مگر اس کی ممتا کی کشش نے مجھے جگا دیا۔ ماں نے آخری بار مجھے گلے سے لگایا' میرے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو چوما' بالوں میں انگلیاں پھیریں' بوسے پہ بوسہ دیتی گئی' میں جو اس کے بغیر رہنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ حیرانی سے۔۔۔ ٹکر ٹکر ان حرکتوں کو دیکھتا رہا' ماں سانس بھر [illegible] کرکے چلی گئی۔

"مت جاؤ' پلیز اسٹاپ اٹ ماما۔" میں نے روکا تھا۔

اس کے شوہر نے نانی کا بڑا گھر اور میرا ماہانہ خرچ بھی باندھ دیا تھا۔ ماں بھی' چند دنوں بعد آجاتی' مگر کئی دن گزرے' دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدل گئے' کوئی نہ پلٹا۔ نانی بہت خرانٹ عورت تھی۔ ماموں کی موجودگی میں' میں کمرے سے باہر نہ آتا۔ نانا مجھ سے پیار کرتے تھے۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی جو پچھلی طرف سے باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اس کے شیشے سے ماتھا' ناک اور منہ لگائے آتی جاتی گاڑیوں کو گنا کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ ان ہی میں سے ایک گاڑی ہمارے گھر کے سامنے رکے گی اور ماں اس میں سے نکلے گی۔ میں باہر کے گیٹ میں ایک پاؤں اندر دھرے دوسرا باہر

نکالے ماں کا رستہ تکا کرتا۔ سال بیتتے چلے گئے مگر اس کی واپسی نہ ہوئی۔ میں تیرہ برس کا ہو گیا تھا' اب بھی جب روتا' ماں کو پکارتا۔ تب ایک بار نانی نے چڑ کر کہا۔

"اچھا ہوا' تیری ماں جا کے نہیں لوٹی' تو اسے بہت تنگ کرتا تھا' اس نے تجھے سزا دی ہے۔" نانی کے لفظ سزا پر میرا ذہن اٹک کر رہ گیا۔ میں پھر کبھی بھی نہ رویا' ماں کے لیے نہ ہی کسی اور کے لیے۔"

اتنے سالوں کی زبانی مسافت طے کر کے وہ سانس لینے کو رکا اور کافی توقف کر کے دوبارہ گویا ہوا۔

"غنی! تم نہیں جانتے' نہیں غنی' تم کیا جانو' سزائیں کیا ہوتی ہیں؟"

اس کا لہجہ بھاری' درد سے بوجھل اور نم ہو گیا تھا۔ وہ سر جھکا کر انگوٹھے اور انگلی سے آنکھوں کی نمی رگڑنے لگا۔

غنی کا اس مضبوط اعصاب کی شخصیت کے بکھرنے کا عمل دیکھنا بہت تکلیف دہ تھا۔ اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے وہ اس کے پاس سے اٹھ گیا۔

کچن کاؤنٹر پہ دو فل سائز مگ میں کافی پھینٹتے اس کے ہاتھ بھی ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ کاشا نے اسے کبھی اپنی گزری زندگی کی جھلک بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ اس کی شرارت سے بھرپور چمکتی آنکھیں' مسکراتے بھنچے ہونٹ زندگی جینے کی تمنا لیے ہوئے تھے۔ ان آنکھوں کے پرے' درپردہ کتنے آنسو۔ چھپے تھے' اسے دیکھنے کے لیے بڑا حوصلہ درکار تھا۔ کافی تیار کر کے مگ ٹرے میں رکھنے تک وہ سوچ چکا تھا کہ اسے اب ماہم کی حمایت نہیں کرنی' اسے ماہم اور اس کی بے وقوفیاں کاشا سے زیادہ عزیز نہیں تھیں۔

"کاشا! کافی۔"

"تھینکس فار اٹ' ابھی ایک آئٹم باقی ہے۔" اس نے ٹیبل پر دھری بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

"ابھی رات بھی باقی ہے۔" اس نے کھڑکی سے جھانکتے اندھیرے کو دیکھا۔

"غنی! خواہش اور شوق دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ شوق بے مول ہوتا ہے' پورا ہو تو بھلا' ورنہ نہ سہی' مگر خواہش بے مول نہیں ہوتی جس نفس یا دل میں یہ جڑ پکڑ لے' اپنی تکمیل تک اسے کھوکھلا کر کے رکھ دیتی ہے۔ میری ماں غلط نہیں تھی' ہاں غلطی ضرور کی تھی' اس نے اپنی خواہشات کے لیے غلط سیڑھی کا استعمال کیا' مجھے نفرت ہے دنیا کی ہر عورت سے اپنی ماں سمیت' جو زندگی بھر کبھی پلٹ کر نہیں آئی۔ وہ آتی بھی کیوں؟ دوسرے شوہر سے اس کی ایک بیٹی اور بیٹا ہیں' میں اکیلا بہت بھاری تھا۔ اس نے جو کچھ شروع میں کیا تھا میرے لیے' مجھے خوشیاں مہیا کرنے کے لیے کیا مگر اس کے باوجود کہ بعد میں جو ہوا اس میں اس کا نہیں' اس کی قسمت کا قصور تھا' میں معاف نہیں کر سکتا تھا۔"

"ماہم غلط ہے یا بری؟" غنی اپنے ارادے پر زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

"ہم بری عورت [illegible]۔ جو عورت اپنے بے انتہا جان نچھاور کرنے والے شوہر' تین معصوم بچوں اور دنیا کی ہر آسائش حاصل کر کے بھی اپنے پچھلے یار کو نہ چھوڑے' وہ بری ہی ہوتی ہے۔"

اس کا لہجہ مدھم اور تھکا سا تھا۔ آنکھوں کی مخصوص چمک بھی ماند تھی۔

"کاشا مرد بھی تو برا ہوتا ہے' تو عورت ذات کو ہی کیوں گھسیٹتا ہے۔"

"ہاں ہوتا ہے' مگر میں نے مرد کی برائی پہ کبھی دھیان نہیں دیا' جب آبزرو کیا' تجھ ہی سے شیئر کروں گا۔" اس نے مگ تھماتے کہا۔

"کیا مطلب' پچھلے آٹھ سالوں سے تیرا عورت نامہ سن سن کر میرے کان پک گئے' اگلے آٹھ برس تو مجھے مرد کا سیاہ سفید سمجھائے گا' یعنی میرا دماغ بھی چاٹ لے گا۔" غنی دہائی دیتے چلایا۔

"لے پھر سن' آخری رات اور گر کی بات۔" کاشا کافی کا مگ چھوڑ کر آگے ہو کر بیٹھ گیا۔ جیسے واعظ کرنے لگا ہو۔

"عیاش مرد کو ایک شریف عورت سے شادی کرنی [illegible] ایسی عورت جسے نہ کبھی کسی مرد نے چھوا ہو نہ اس نے کبھی آنکھ چرا کر مرد کو دیکھا ہو' سیل پیک' مہر بند۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ برابر جوڑے۔

"اور بد کردار عورت کو ایک شریف مرد ڈھونڈتا ہے' کیونکہ بد کردار کو چاہے حجرے میں بٹھا دو' وہ [illegible] کرنے سے باز نہیں آئے گی۔ شریف مرد کولہو کے بیل کی مانند ایک ہی دائرے میں گول گول چکراتے زندگی گزارنے کا قائل ہوتا ہے۔ اس کا اخلاق اعلا اور [illegible] محدود۔ صرف بچوں اور اپنی عورت تک کی ہوتی ہے۔"

غنی نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر سر پر رکھ لیے۔ سر جھکائے وہ کاشا کی باتوں پر مسلسل مسکراتا جا رہا تھا۔

"آپ کا [illegible] کہنا بجا ہے۔ مگر پھر آپ یہ سب کیوں [illegible] ہیں؟"

"یہ حساب کتاب کی بات ہے' تمہیں سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"مطلب؟"

"ایک سے لے کر نو کروڑ کے ہندسوں میں سات آتے ہیں' مجھے ماہم تک یہ سات زیرو ہی لے [illegible]"

[illegible] نے خود کو گھورتے غنی کو زبردستی گلاس پکڑا [illegible]

"ماں' باپ تیرے شریف لوگ تھے' یقیناً" یہ ساری بدمعاشیاں اپنے دو مشٹنڈے ماموں سے ادھار [illegible]۔" غنی بڑے دور کی کوڑی لایا تھا۔ کاشا کو [illegible] کرنے میں قطعاً "عار نہیں تھا۔

"یہی بات کئی سال ادھر' تھوڑے سے ردوبدل [illegible] نانا نے بھی کہی تھی۔"

☼ ☼ ☼

[illegible] یہ گھر اور اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ فرار کی [illegible] میں اسلام آباد چلا گیا۔ میٹنگ تو تھی' مگر اتنی ضروری بھی نہیں کہ اسے نپٹانے کے لیے اس کا جانا لازم ہوتا۔ واپسی پہ ماہم سراپا سوال تھی۔ اسے منصور کے منہ سے نکلی اچانک حقیقت پہ یقین نہیں آیا تھا۔ وہ دیوانہ وار چیخنے چلانے لگی تھی۔ منصور نے اسے بہت مشکل سے سنبھالا۔ چیختی چلاتی وہ منصور کی بانہوں میں ہی نڈھال ہو کر گر گئی۔ اس نے ڈاکٹر کو فون کیا تھا۔ وہ اب اپنے کمرے میں پرسکون انجکشن کے زیر اثر سو رہی تھی۔

وہ بھی آخری پہر پژمردہ خالی کمرے میں لوٹ آیا۔ اگر اسے کبھی جانا پڑ بھی جاتا تو اس کا سارا دھیان ماہم کی طرف لگا رہتا۔ وہ بیسیوں فون اور سیکڑوں ایس ایم ایس کرتا۔ اسے ماہم کے بارے میں عجیب عجیب وہم ستاتے رہتے۔ وہ رات کو اکیلی بستر پہ سوئے گی' شاید اسے نیند ہی نہ آئے' جاگتی رہے' اسے تنہا کمرے میں ڈر نہ لگے۔ محبت نے اسے وہمی بنا دیا تھا یا اس کے اپنے دل کا چور تھا کہ وہ خود اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ ماہم نے کبھی بھی اسے نہیں روکا تھا نہ ہی کبھی ایسے جذباتی جملے بولے تھے' جیسا وہ سوچتا تھا۔ جب کبھی وہ رات کو دیر سے آتا تو وہ اس کے انتظار کے بجائے خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہوتی۔ وہ اپنے دل میں آئے بال کو ٹال جاتا۔

اس عورت کی تکلیف' آنسو اس کی برداشت سے زیادہ صبر آزما تھے۔ اس کی خوشیوں کے لیے اس نے پانچ برس جدوجہد کی تھی' اس کی ساری محبت' ساری توجہ کا صلہ اس نے گہرے گھاؤ کی صورت دیا تھا۔ ایسا ناسور جس نے آخری سانس تک رستے ہی رہنا تھا۔

"جو مرد اپنا سب کچھ کھو کر بھی نہ روئے' وہ بزدل ہوتا ہے۔"

اپنی بے بسی پہ روتے اس نے خود کو دلیل دی تھی۔ بیڈ کا وہ کونا اسے کسی گرم تپتے صحرا کی مانند لگ رہا تھا۔ بیڈ پہ تکیوں کے آگے رکھے کشن بھی بالکل ویسے ہی جڑے تھے۔ جب وہ ماہم کو زیادہ زچ کرتا یا بلاوجہ کی

چھیر چھاڑ کیے جاتا وہ اسے یہ ہی کشن اتنا کریاد کرتا۔

ڈریسنگ ٹیبل پہ اس کا کلون اسپرے، لوشن، اسکرب، نائٹ مساج کریمیں، ہیر برش، ڈرائیر ویسے ہی دھری تھیں۔

بیڈ کے وسط میں بیٹھا وہ شدت سے ضبط کرتے بھی رو دیا تھا۔ روتے ہوئے اس نے ڈریسنگ کے خالی اسٹول کو دیکھا۔ وہ ہمیشہ اسے شیشے میں سے تکا کرتا۔ تب وہ تنگ آکر کھڑی ہو جاتی۔

"واٹس پرابلم منصور! گود میں فائل دھری ہے لیپ ٹاپ سامنے رکھا ہے، ٹی وی چل رہا ہے، ان چیزوں پہ دھیان دو، وائے آر یو ڈسٹربنگ می؟" وہ سخت خفا ہوتی۔

"میں نے کب ڈسٹرب کیا، میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔"

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کے بے حد معصومیت سے جواب دیتا۔

"تم نہیں، تمہاری نظریں تو کر رہی ہیں۔"

وہ پھر بھی باز نہ آتا تو وہ زچ ہو جاتی۔

"واٹ کین آئی ڈو یار! ہاتھ تاؤں تو تمہیں اعتراض، اب نظروں پہ بھی پابندی لگادو۔"

"واٹ ربش منصور!" وہ سرخ چہرہ لیے رخ پھیر جاتی۔

اس کا قہقہہ کافی دیر کمرے میں گونجتا رہتا۔

اس نے بیڈ پہ ہاتھ پھیر کر غیر محسوس کو محسوس کرنا چاہا تھا۔ جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر اسے محبت ہوئی تھی۔ وہ اسے محبت اور رسوائی دے کر سوز پہ تنہا کر گئی تھی۔

رشتوں اور محبت میں جمع حاصل نہیں ہوتا نہ ہی وہ قائل تھا۔ اگر کر بھی لیتا تو اس کے حصے میں صرف خسارہ ہی خسارہ نکلتا۔

لاحاصل محبت پہ بے بسی مرد کو بھی رلاتی ہے۔

وہ بھی رو رہا تھا لاحاصل، خالی ہاتھ کرب اور درد کی شدت سے بے تحاشا گڑگڑاتے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

ڈیڑھ بجے اس کی آنکھ کھلی اور سب سے پہلی نگاہ وال کلاک پہ گئی۔ ایک لمحے میں ساری غنودگی ہرن ہو گئی۔ اس نے اپنے برابر سوئی ماہم کو دیکھا۔ جو گہری نیند میں محو خواب تھی۔ اس نے جھٹکے سے اس پر سے کمبل کھینچا۔

"اٹھو ماہم، ماہم!" اس کی تیز غصیلی آواز پہ وہ کسمسا کے رہ گئی۔

"ویک اپ۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا۔ اس کے حواس یکدم مجتمع ہو گئے۔

"واٹس پرابلم کاشف!" وہ جمائی لیتے بولی۔

"آئی سیڈ تو یو کہ مجھے صبح ساڑھے گیارہ بجے ارجنٹ کہیں جانا ہے، مجھے اٹھا دینا اور تم ابھی تک لم لیٹ ہو۔" اس نے بری طرح اسے گھورا۔

"رات کافی دیر ہو گئی تھی، تم آرام کر لیتے..."

اس سے کاشا کے تیور ابھی نوٹ نہیں کیے تھے۔

"مسز ماہم! یو آر مائی وائف، بٹ ایم ناٹ یور۔ حکم عدولی کرنے اور مشورہ دینے والے لوگوں سے سخت نفرت ہے، اینڈ لسن ون تھنگ میں اپنا دھیان نے کا عادی نہیں ہوں۔"

اس کے لہجے میں کراہت اور تنبیہہ اتنی واضح تھی کہ ماہم ہکا بکا رہ گئی۔ وہ کاشا کی پہلی صبح کی دلہن اس قسم کے رویے کی توقع نہیں رکھتی تھی۔

کل ہی کاشا اور غنی نے اسے ہوٹل سے پک کیا تھا۔ منصور کے گھر سے نکل کر اس نے کاشا کے ساتھ کی گئی پلاننگ کے مطابق ہوٹل میں جانا تھا، جہاں وہ رات ٹھہری تھی۔ کاشا نے اس کا گلبرگ والا گھر کھلوالیا تھا، جو منصور نے اسے بطور تحفہ دیا تھا۔ اس نے اپنے گھر کے ملازم وہاں بھجوا کر صفائی ستھرائی کروائی تھی۔ اس نے چند سال قبل بھی ماہم کو یہ من گھڑت کہانی سنا کر چھوڑا تھا کہ میرے پیرنٹس تم سے شادی پہ راضی نہیں ہیں اور تم سے شادی کرنے کی

صورت میں مجھے جائیداد سے عاق کر دیا جائے گا۔ میں کنگال، تمہیں زندگی کی بنیادی ضروریات بھی فراہم نہیں کر سکوں گا۔ اب پھر اس نے یہ ہی ڈرامہ کیا تھا۔

وہ ماہم کے ساتھ اس کے گھر شفٹ ہو گیا تھا۔ ماہم کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ کل شام اس نے صرف غنی کی موجودگی میں اس سے کورٹ میرج کی تھی۔

"میں باتھ لینے جا رہا ہوں، میرا کوئی سا بھی ڈریس نکال دو اور جا کر ناشتا تیار کرو۔" شرٹ کے بٹن کھولتا وہ واش روم میں گھس گیا۔

ماہم کے دماغ پہ اس کا یہ نیا حکم کسی ہتھوڑے کی مانند لگا تھا۔ وہ ابھی کاشا کی رات کی قربت کے سحر سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ وہ کوئی الھڑ مٹیار نوخیز کلی تو تھی نہیں مگر خود کو تصور یہ ہی کر رہی تھی، اس نے کاشا سے بہت سے نخرے اٹھوانا تھے، بہت انجوائے کرنا تھا اس کے ساتھ گھومنا پھرنا، ہنی مون پلان، آزادی، محبت، دراصل اتنے سال کی دوری اور ہجر وصل کو محسوس کرنا تھا۔

اس نے کچن کا کام حسب خواہش اور ڈیلی روٹین کی بوریت کو چینج کرنے کے لیے کیا تھا۔ خاص فرمائش اس نے کبھی کسی کی پوری نہیں کی تھی۔ اب وہ پہلی صبح کی دلہن ناشتا بنا رہی تھی، نوکروں کی موجودگی میں۔ کام کرتے اس کا فشار خون بلند سے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ نئی زندگی کی اولین صبح اور کاشا کا سلوک۔

اس نے صرف کاشا کے لیے ناشتا تیار کیا اور ڈائننگ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ وہ ایسا کر کے اس کے برے رویے کا اسے احساس دلانا چاہتی تھی۔

خوشبو کے معطر جھونکے سے اس کی آمد ہوئی۔

"گڈ ہو نیک سروس۔" کرسی گھسیٹتے وہ بہت خوش گوار موڈ میں بولا۔

اس نے جگ سے دودھ کا گلاس بھرا اور دو سانس لے کر پی گیا۔ جوس کا گلاس بھر کر وہ سلائس پہ مکھن لگانے لگا۔ ماہم اس کی صرف اپنے آپ پر توجہ کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

"پاپا نے بنایا ہے شوگر ون اسپون۔"

سلائس کے ساتھ جوس کے سپ لیتا وہ بہت منہمک تھا۔

"کاشا کے لیے ناشتا بنانا یا اس کا اسے کچھ پوچھنا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" یہ دلیل اس نے بڑے صبر سے اپنے حلق سے اتاری اور چائے بنانے لگی۔

اس نے دس منٹ میں بڑی تسلی سے سب پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ ماہم کے لیے یہ دس منٹ بہت اذیت ناک تھے۔ اس کا ذہن بھٹکنے لگا تھا ماضی میں، اس نے بمشکل ہر سوچ جھٹلائی۔

"تم بریک فاسٹ نہیں لے رہیں۔" اسے وہ نظر آ ہی گئی تھی۔

ماہم نے خفگی سے ٹیبل پہ نظریں جما دیں۔

"کچھ ٹیپیکل وومن کی نیچر ہوتی ہے، وہ شوہروں کے سامنے نہیں کھاتیں اور ان کے پیچھے ہر شے چٹ کر جاتی ہیں۔" وہ بہت نارمل کہہ رہا تھا۔

ماہم جو اس کے منتیں کرنے اور منانے کی امیدوار تھی، کاشا کبھی سے الجھ کے رہ گئی۔

"پلیز کاشف آپ..."

"دوپہر کا کھانا تیار کر لینا، رات کے ڈنر پہ ہم غنی کی طرف انوائیٹڈ ہیں۔"

اس کی سنے بغیر اس نے اپنی کہی۔

"میں کوکنگ کروں گی؟" اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"میں نے کوئی موکل نہیں چھوڑے اس کام کے لیے، تم اس گھر کی واحد عورت ہو اور ریسپونسیبلٹی بھی تمہاری ہی ہے۔"

"یہ نوکر جو ہیں۔" "یہ میں نے ستھرائی کے لیے بلوائے تھے۔ ابھی بھجواتا ہوں غنی کو واپس۔"

"یہاں یہ سب کون کرے گا؟" وہ رو دینے کو تھی۔

"ظاہر ہے تم خود۔" بے اعتنائی سے کہتے اس نے چائے کا آخری بڑا سا گھونٹ لیا۔

"لیکن میں یہ سب نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟ پانچ سال میرڈ لائف کے گزارے ہیں' گھر داری کی پریکٹس ہی نہیں ہوئی؟" ٹیبل پہ بازو جمائے اس نے ماہم کی کھلی آنکھوں میں جھانکا۔
ماہم کو لگا جیسے اس کے منہ پر کھینچ کے طمانچہ مار گیا ہو۔ ماضی کا آئینہ صرف ایک رات میں اس کے چہرے کے سامنے کردیا گیا تھا۔
"سیکورٹی گارڈ اور صفائی کے لیے فل ٹائم ملازمہ کا ارینج ہو جائے گا' مگر شیف اور لانڈری کے چونچلے نہیں ہوں گے' اچھا ہے تم بزی رہو گی۔"
وہ اپنی مرضی سے سب ترتیب دے کے اٹھ گیا۔
ماہم گنگ تھی۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ بہت کچھ اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ اس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ اس کی حالت سے بے خبر جا چکا تھا۔ وہ خالی نظروں سے خالی برتنوں کو تکتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

شاہم تین دن تیز بخار میں جلتی رہی تھی۔ منصور نے اپنا دکھ بھول کر پوری طرح اس کا خیال رکھا تھا۔ اس نے اسے عدم تحفظ کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ ماہم کے علاوہ بھی ان دونوں کا ایک رشتہ تھا اور وہ اس رشتے کی حیثیت سے اس گھر میں رہ سکتی تھی۔ ماہم نے بچوں کی پروا نہیں کی تھی' پھر اس کا شمار کس گنتی میں ہوتا تھا۔ اس کی اذیت اپنی جگہ' مگر وہ ایک بار اپنی بڑی بہن کا گریبان پکڑ کر اس سے یہ ضرور پوچھنا چاہتی تھی کہ اتنی رسوائی اس نے کس کی خاطر کمائی؟ منصور کے ان مول جذبوں کا سودا کس بھاؤ کیا؟ اتنا سب کچھ گنوا کر وہ اس کا حاصل وصول پوچھنا چاہتی تھی۔ اسے منصور کا سامنا کرتے بھی شرم آنے لگی تھی۔ وہ کتنی نرمی اور اپنائیت سے اس کا حال احوال دریافت کرتا اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ٹوٹنے کے آثار اور آنکھوں میں شکست خوردگی تو تھی' مگر وہ خود کو جوڑے رکھنے پہ آمادہ بھی لگتا تھا۔
اس نے خود کو صرف کمرے تک محدود کرلیا' ہنسنا بولنا بالکل چھوڑ دیا۔ وہ لوگوں کا سامنا کرنے سے بھی ڈرتی۔ اسے لگتا کہ ابھی کوئی اس سے سوال کردے گا' دنیا کے تضحیک آمیز رویے میں اس کے کردار کی وضاحت کا سوال بھی اٹھے گا۔ وہ ارسل کو کیا کہے گی' اس کا سامنا کیونکر کرسکے گی۔
اس آخری رات ارسل تین دن کے لیے کراچی گیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی اسے کال کی' اپنی خیریت بتانے اور اس کی دریافت کرنے کے لیے' مگر شاہم نے موبائل کا سوئچ آف کردیا۔ اس نے لینڈ لائن نمبر پہ بھی بارہا کوشش کی' لاتعداد میسج چھوڑے۔ اسے بابا جانی کے حکم پر وہاں رکنا پڑا تھا' ورنہ وہ اگلے ہی دن ریٹرن ٹکٹ سے لوٹ آتا۔ اس سے رابطے کی ہر ممکن کوشش کرکے ناکام ہو گیا تھا۔
رات نو بجے کی فلائٹ سے اس کی واپسی ہوئی تھی۔ کھانے کی طلب اس کی تمام [illegible] سے مٹ چکی [illegible] پورٹ سے گھر تک کے سارے راستے [illegible] بار بار ڈائل کرتا رہا تھا۔ اب [illegible] نیم دراز تھکن زدہ ارسل کو سارے دن [illegible] بجے ہی [illegible] رنگ کیا تھا۔ اسے باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یہ سائرہ رحمان کی گاڑی تھی۔ اسے ماں کا سامنا کیے کئی دن ہو گئے تھے' وہ انہیں سلام کرنے کی غرض سے بیٹھا رہا۔
"ماں ہوتے ہو' نظر ہی نہیں آتے۔"
ماں کے قدموں کی آہٹ پہ اس نے موندی آنکھیں کھول دی تھیں' مگر ان کا پوچھنا اسے جزبز کرگیا۔ وہ تین دن باہر رہا تھا' وہ بے خبر تھیں یا بھول چکی تھیں۔
"جی' آپ کو کوئی کام تھا۔" اس نے بھی بتانا مناسب نہ سمجھا۔
"مجھے تم سے صرف ایک ہی کام ہے۔ بائی دا وے تمہیں کمرے میں نیند نہیں آتی جو یہاں سو رہے ہو۔" سائرہ رحمان نے طنزیہ گفتگو کا آغاز کردیا۔
"میں سو نہیں رہا تھا۔" اس نے بہت آہستگی سے

کہی۔
"پھر یقیناً تم سوچ رہے ہو گے کیونکہ اب تم سوچنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہو؟" ارسل کو ان کا لہجہ تو سمجھ میں آرہا تھا مگر الفاظ نہیں۔
"سوری ماما! میں آل ریڈی بہت ڈسٹرب ہوں۔" وہ بڑے تحمل سے کہتا اپنی جان چھڑانے کے لیے اٹھ گیا۔
"آف کورس مائی سن! تمہاری ماما کو تم سے پوری ہمدردی ہے۔ بٹ آئی وش کہ تم اتنا سوگ نہ مناؤ' فارگیٹ اٹ' اچھا ہے اس لڑکی کو اپنا فیملی ممبر بنانے سے قبل ہی اس کے چیپ فیملی بیک گراؤنڈ کی اصلیت پتا چل گئی۔"
سائرہ رحمان کو اپنے ذرائع سے ماہم کی خبر مل چکی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ارسل بھی آگاہ ہو چکا ہوگا۔
"آئی کانٹ انڈر اسٹینڈ' آپ کس لڑکی کا کہہ رہی ہیں۔" ماں کی ساری گفتگو اس کی عقل سے بالاتر تھی۔
"[illegible] تمہیں اتنا بھی انجان [illegible] سمجھو' اس ماہم کے [illegible] کون نہیں جانتا۔"
"ماہم۔۔۔ ماہم آپی۔۔۔ آپ کیسے جانتی ہیں انہیں؟" وہ جو جانے کے لیے اٹھ گیا تھا' پورا کا پورا ان کی طرف گھوم گیا۔
"آپی۔۔۔ ماہم؟ وہ اس قابل ہے کہ اسے اتنے احترام سے پکارا جائے؟ سارے زمانے میں اس کی بے حیائی کے چرچے ہو رہے ہیں' ہر ایک تھو تھو کر رہا ہے اور تم اسے آپی جیسے القابات سے پکار رہے ہو' اسے تم۔۔۔"
"پلیز اسٹریٹ وے بتائیں کیا ہے؟"
ماں کی اس گوہر افشانی پہ اس کا دل اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا۔
"یو رئیلی ڈونٹ نو ارسل؟ اتنی محبت کرتے ہو اس لڑکی سے کہ اس کی خاطر ماں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اس کے گھر کی تمہیں خبر نہیں۔ ظاہر ہے وہ اپنی بہن کا کردار اچھالے گی تھوڑی' اس پہ بھی بہن کا رنگ۔۔۔"

"پلیز فار گاڈ سیک ماما۔" وہ دبے لہجے میں چیخا۔

"اس شاہم کی بڑی آپی' اپنے کسی پرانے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔" سائرہ رحمان نے تمسخرانہ مسکراتے بریکنگ نیوز دی۔

"نن۔۔۔ نہیں۔" وہ رکتی سانسوں سے اپنی جگہ جم گیا۔ اسے یقین تھا سائرہ رحمان جھوٹ نہیں بول سکتیں۔

"اب میری بات کان کھول کے سن لو ارسل! تمہاری شادی صرف اور صرف ایمن سے ہوگی۔ میں نیکسٹ ویک تمہارا نکاح کر رہی ہوں ڈیٹس اٹ۔"

انہوں نے بہت غلط وقت پہ غلط بات بول دی تھی۔ ارسل نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ وہ تو ابھی بے یقینی کی ناہموار مسافت پہ کھڑا تھا۔

"دس از ٹو مچ ماما! آپ صرف ماں ہونے کے ناتے میری زندگی کا فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ میں آپ کو بہت دفعہ ریفوز کر چکا ہوں۔"

"اتنی گری ہوئی حرکت [illegible] تم اس [illegible] میں ہو؟ میں بھی دیکھتی ہوں تم کیسے اپنی مرضی کرتے ہو' کیسے وہ ذلیل اس گھر میں آتی ہے۔"

"میں بھی آج آخری بار بتا رہا ہوں ماما' میری زندگی کی ہم سفر صرف اور صرف شاہم ہوگی' صرف شاہم' ورنہ زندگی کو بے معنی میں خود کر دوں گا' بی کاز شی از مائی لائف اینڈ آلسو کمٹ منٹ۔"

وہ بپھرتے قدم اٹھا کر ماں کے قریب آکر بہت دھیمے سے چبا چبا کے بولا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ ارسل۔" وہ بیٹے کی اتنی دیدہ دلیری پہ اپنی آواز پست نہیں رکھ سکتی تھیں۔

وہ انہیں شاک میں چھوڑ کر چلا گیا۔ شاہم کی نظر اندازی' وہ اس کا فون ریسیو نہیں کر رہی تھی' لینڈ لائن پر آنے سے اس نے انکار کر دیا تھا' اس نے کتنے پیغام چھوڑے' مگر جواب ندارد' اس سب کی وجہ اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے کمرے میں آکر اس کے سیل فون پہ کال کی' بیل جاتی رہی' فون نہیں اٹھایا' اس نے میسیج لکھا۔

"شاہی! اگر تم نے میری کال ریسیو نہ کی تو میں اسی وقت تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔" میسیج کر کے وہ اضطراری کیفیت میں چند لمحے [illegible]۔

شاہم نے میسیج پڑھا۔ ارسل واپس آگیا تھا۔

اب وہ اسے مزید انداز نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بیمار رہی تھی' ابھی بھی اس کی ذہنی حالت سنبھلی نہیں تھی۔ وہ لوگوں سے' رشتوں سے بدکنے لگی تھی۔ سب سے زیادہ خوف اس کے حواسوں پر ارسل کا طاری تھا۔ اس کی ماما اس کے لیے راضی نہیں تھیں۔ بابا اس سے کتنی شفقت سے ملتے تھے' ان لوگوں کی نظر میں وہ ایک اچھی فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔ اب ماہم کی اس حرکت کا کیا ردعمل ہوگا' ارسل اسے چھوڑ دے گا' اسے بھی موردِ الزام ٹھہرائے گا؟ اس پہ بھی شک کیا جائے گا؟ ارسل سے بچنا بھی تو محال تھا' وہ اپنے بننے کے مطابق آ بھی سکتا تھا۔ اس نے دل کی دھڑکن کو سارے جسم میں' [illegible] محسوس کرتے اس کا نمبر [illegible]

گیا۔

"آر یو فائن شاہی! تم ایسا کیوں کر رہی ہو۔ نہیں۔۔۔ تمہیں ذرا سا بھی احساس ہے میرا' تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے' [illegible] ہو رہی ہو' تم کیا کیا ہو [illegible] شاہی۔"

وہ اس کی بیلو سے [illegible] گیا تھا۔ وہ رونے لگی تھی' اس کے پاس بولنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں تھا۔

"شاہی! میں تمہاری وجہ سے کتنا پریشان ہو رہا ہوں کہ اب اگر تم روئیں تو بلیو می میں بھی رو دوں گا' پلیز شاہی۔۔۔ پلیز۔" وہ اتنی بے بسی سے بولا تھا کہ وہ چپ کر گئی۔

اس نے فون پہ اس سے ماہم کے متعلق استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ماہم کا قصہ اس کے نزدیک اتنی اہمیت کا حامل بھی نہیں تھا کہ وہ شاہم کو کریدتا۔

"تم صبح تو بجے آ رہی ہو' میں انتظار کروں گا شاہی۔ اللہ حافظ۔" موبائل بیڈ پہ پھینک کر اس نے آنکھوں

میں ٹھہری نمی کو دونوں ہتھیلیوں میں جذب کیا تھا۔

☆☆☆

کاشا کے معمول میں ماہم کے آجانے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے [illegible] ۔ پتا اور اسے بتائے بغیر گھر سے نکل رات کے کس پہر آتا' اسے کچھ خبر نہ ہوتی۔ شروع کے چند دن اس نے کاشا کی راہ دیکھی' پھر اس نے انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ گھر میں صرف ایک کل وقتی ملازمہ تھی۔ وہ اس سے کب تک جی بہلاتی۔

اسے کاشا سے بہت سی شکایات تھیں' وہ اسے وقت نہیں دے رہا تھا۔ وہ اس کی بیوی بن کر بھی اس کے والدین' بزنس اور فرینڈز کو نہیں جان پائی تھی۔ وہ اسے ایک بار بھی باہر گھمانے نہیں لے کر گیا تھا۔ اگر وہ ضرورت سے اکتا کر اسے کال کرتی تو نمبر مسلسل بزی جاتا یا پھر وہ کال ریسیو نہ کرتا۔ وہ شاک میں تھی۔ کاشا کے اس روپ کا وہ پہلے والے کا موازنہ کرتی رہتی۔ شادی سے پہلے وہ ایسا نہیں تھا۔ وہ ملاقاتیں' لیٹ نائٹ باتیں' محبت بھری سرگوشیاں' قہقہے' ہنسی مذاق' بے قراریاں۔۔۔ وہ سب کیا تھا؟ کیا کاشا نے اس کے ساتھ فراڈ کیا تھا؟ وہ تو بہت منہ پھٹ اور بدتمیز تھا۔ جو دل و دماغ میں وہی منہ پر دے مارتا' دوغلا پن اس میں نہیں تھا۔ وہ کبھی کسی سے ڈری نہیں تھی' اب اسے کاشا سے خوف آنے لگا تھا۔

اس نے اپنی زندگی کا یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا' جو اس کے لیے جان کا عذاب ثابت ہو رہا تھا۔

واحد ملازمہ کے ساتھ اسے خود بھی گھر کے بہت سے کام نپٹانے ہوتے تھے۔ بہت سالوں سے اسے کام کرنے کی عادت نہیں رہی تھی۔ وہ بہت تھک جاتی' بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آنے لگتی' وہ گہری نیند میں تھی کہ اسے کسی نے جھنجوڑ کے اٹھا دیا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ غصے سے بھرا کاشا اس کے سر پر کھڑا تھا۔

"بہت نیند آتی ہے تمہیں۔" اس کی غصیلی آواز بہت اونچی تھی۔

سہمتے ہوئے اس نے وال کلاک دیکھا جہاں رات کے دو بج رہے تھے۔

"دو بجے ہیں' زیادہ ٹائم نہیں' روز تمہارا سونا نوٹ کرتا ہوں' کون سے پہاڑ توڑتی ہو کہ اپنی ریسپانس بلٹی بھی بھول جاتی ہے' گھر لوٹے شوہر سے چائے' کھانے کا پوچھنے کے بجائے جاہل عورتوں کی طرح سر جھاڑ منہ پہاڑ سر شام ہی خراٹے لینے لگتی ہو۔" وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"اب ویدے مٹکانا بند کرو اور کھانا لاؤ۔۔۔ اور ہاں دوبارہ جگانا نہ پڑے۔" وہ ماتھے پہ بل ڈالے کہہ رہا تھا اور ماہم اس کے الفاظ کی سنگینی برداشت کر رہی تھی۔ خمار آلود نگاہیں اس پر سے ہٹ نہ پائی تھیں۔

"اسٹاپ اٹ۔" وہ پلٹی' کاشا واش روم کے دروازے میں کھڑا تھا۔ "نائٹ سوٹ ہینگ نہیں کیا' میرے کام کے معاملے میں اپنے دماغ کو ذرا ٹھکانے پہ رکھا کرو' ورنہ مجھے نٹ پیچ کسنے بھی آتے ہیں۔"

وہ کپڑے ہینگ کرنا صرف آج بھولی تھی۔ کاشا نے اس کے ہاتھ سے کپڑے تقریباً چھین کر دروازہ پورے زور سے بند کیا۔

وہ مضمحل وجود گھسیٹتی کچن میں آگئی۔ کھانا گرم ہونے تک کاشا کی بے عزتی اس کے کانوں میں گونجتی رہی تھی۔ کاشا اتنی جلدی پینترا بدلے گا' یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

وہ کھانا لائی تو وہ شاور لے کر بیڈ پہ لیٹا کوئی فائل اسٹڈی کر رہا تھا۔

"کاشف کھانا۔" اس نے دھیرے سے متوجہ کیا۔

"ہوں۔۔۔ کھانا۔۔۔" کچھ توقف کر کے اس نے سوچا۔ "ایسا کرو واپس لے جاؤ' مجھے بھوک نہیں۔"

ماہم کو بے عزتی پہ غصہ تھا' وہ چپ نہ رہ سکی۔

"کاشف! آپ کو بھوک لگی تھی' شاید اسی لیے آپ نے مجھے جگایا تھا۔" تمسخرانہ اسے دیکھتے رہنے کے بعد کاشا نے فائل بند کر دی۔

"تم بہت معصوم ہو۔۔۔ لائیک ایکٹریس۔" سرخ چہرہ لیے اپنے ہاتھ مروڑتی ماہم کا جی چاہا چیخ چیخ کر رونے

"تم میری جائز اور قانونی بیوی ہو' کوئی بھی شوہر رات کے اس پہر بیوی کو صرف کھانا منگوانے کے لیے نہیں جگاتا۔ یا تمہیں ابھی تک میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہے۔" اس کا لہجہ واضح مذاق اڑاتا ہوا تھا۔

"جی ہاں' بہت غلط فہمیاں تھیں جنہیں آپ ایک ایک کر کے دور کرتے جا رہے ہیں۔" وہ تنک کر بولی۔

"جاؤ اور اچھے بچوں کی طرح ٹرے رکھ کر جلدی سے واپس آجاؤ۔" اس نے پچکارا۔

"آپ بہت بدل گئے ہیں کاشف!" پلکوں کو جھپکاتے آنسو روکتے اس کے منہ سے گلہ نکل گیا۔

"چینج مجھ میں نہیں' تمہارے لائف اسٹائل اور سوچ میں آیا ہے۔ تم جانتی ہو تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے' تم ابھی بھی اپنی پچھلی زندگی میں جیتی ہو۔ جس میں تمہارے لاڈ' نخرے' چونچلے اٹھائے جاتے تھے' تم اپنا ماضی جس شخص کے ساتھ گزار چکی ہو' وہ کاٹھ کا الو تھا' جس پر رشتوں اور محبت کا بھوت سوار تھا۔ میرے ساتھ ایسا کوئی سائیکو پرابلم نہیں ہے اور یاد کرو' تمہیں تو مرد کے پوجنے سے... اس کی... اس کی زن مریدی سے چڑ تھی نا۔ ایکچوئیلی تمہاری فطرت ان دو غلی عورتوں سے مطابقت رکھتی ہے جن کی اسٹیٹمنٹ مرد کے معاملے میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ تمہاری توقعات مجھ سے کیا ہیں؟ آئی ڈونٹ کیئر' میں اپنی لائف اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق جیتا ہوں' اس میں کسی کے اضافہ یا کمی سے کوئی فرق نہیں پڑتا' اب... اب شکایت کی ہے پھر نہ کرنا' شروع میں مشکل ہوگی لیکن امید ہے بہت جلد عادی ہو جاؤ گی اینڈ سنو مجھے ٹسوے بہاتی عورتیں زہر سے بھی زیادہ بری لگتی ہیں' میں ان اوچھے ہتھکنڈوں سے متاثر ہونے والا نہیں' ٹھیک دو منٹ میں تم بیڈ پہ ہو ورنہ میں تمہارا کیا حشر کر سکتا ہوں' تم سوچ سکتی ہو' اب جاؤ۔"

فائل بیڈ کراؤن پر رکھ کے' سر کے نیچے ڈبل تکیہ درست کرتے اس نے پر سکون ہو کر آنکھیں موند

☆ ☆ ☆

منصور کی دیکھ بھال اور بیٹے جیسی اپنائیت کی بدولت ہی سے شاہم بہت جلد سنبھل گئی تھی۔ ان دونوں کے بیچ ماہم کا ذکر پھر دوبارہ نہیں ہوا تھا۔ منصور بہت کم گو ہو گیا تھا اور شاہم بہت سنجیدہ' گھر میں چار سو خاموشی کی دبیز تہہ سی بچھ گئی تھی۔ شاہم نے باہر جانا بہت کم کر دیا تھا۔ وہ منصور کو اپنی طرف سے کسی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ ارسل سے بھی صرف ایک بار ملنے گئی تھی۔ ارسل نے بالکل نہ پوچھا کہ اس نے چار دن اس کے ساتھ اتنا برا رویہ کیوں اختیار کیے رکھا۔ وہ اسے اپنے بزنس ٹور اور ادھر ادھر کی باتیں بتاتا رہا۔ شاہم نے شاید پہلی بار اسے اتنی خاموشی سے سنا تھا' بنا ٹوکے۔ جب وہ بول بول کے تھک گیا تو شاہم نے بڑا حوصلہ کیا۔

"ارسل! ان چار دنوں میں ہم برباد ہو گئے' سب کچھ اجڑ گیا' ختم ہو گیا... ماہم... ماہم بھی ہمیں چھوڑ گئی۔"

"پلیز میں اس بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتا' بھول جاؤ ماہم آپی کو تم کوئی فیل نہ کرو' مجھے نہ تم سے کچھ پوچھنا ہے نہ ہی سننا ہے' صرف اپنی کہو یا میری۔" اس نے شاہم کے دونوں کندھے تھام کے بڑی محبت سے اس کے جھکے سر کو دیکھا۔

یہ سر وہ ہمیشہ فخر سے بلند دیکھنے کا متمنی تھا۔ جس مرحلے سے وہ گزر رہی تھی' تکلیف اس کی ذات کو تھی' وہ اس سے صرف محبت کا دعوے دار نہیں' محبت کرتا بھی تھا۔ وہ کیوں جان بوجھ کر مزید کرید کر دکھ سے دوچار کرتا۔ وہ ماہم کے اس فعل کا اسے قصوروار نہیں ٹھہراتا تھا۔ ماہم کے کردار اور اس کی حرکت کا موازنہ شاہم کی ذات سے نہیں کرتا تھا۔ اسے شاہم سے کسی بھی قسم کی وضاحت نہیں مانگی تھی۔

"یو... یو آر گریٹ ارسل... آئی... آئی... ایکسٹریملی تھینک فل ٹو یو' رئیلی۔" جھکے سر کو اٹھایا

تو آنسو آنکھوں سے گالوں پہ بہہ گئے۔

"تمہیں کس فاروات؟" اس نے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں سے چن لیا۔

"اے رو مت' میرا دل رک جائے گا۔ بس... خود اب مسکرا دو۔" وہ مسکرا رہا تھا' وہ بھی روتے میں زبردستی مسکرانے لگی۔

اس نے ارسل سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب روز' روز اس سے ملنے نہیں آسکتی' وہ منصور کی وجہ سے بہت احتیاط برتنے لگی تھی۔ ارسل سے کال پہ اس کا رابطہ تھا۔ یا پھر وہ صرف ضروری کام سے منصور کو بتا کر اور اجازت لے کر جانے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میری بلیک شرٹ نہیں مل رہی۔" کاشا کچن میں کاؤنٹر کے پاس آ کے کھڑا ہوا۔ سخت جھنجلایا ہوا تھا۔

"کون سی بلیک والی؟" برگر میں کالی مرچ ڈالتے اس نے رک کر پوچھا۔

"کتنی بلیک شرٹس ہیں میری' تمہارا دھیان کام کی طرف ہو تو۔" اسے غصہ آنے لگا تھا۔

ماہم نے اندازہ لگایا تو کتنی ہی بلیک شرٹس اس کے ذہن میں گھوم گئیں۔ اب وہ کیسے قیاس کرتی۔

"جو کل' میں نے پرسوں اتاری تھی۔" اس نے [illegible] کر کے بتایا۔

"وہ... وہ واشنگ مشین میں ہے' میں نے دھلائی نہیں کی' آپ کوئی اور پہن لیں' ایک بوتیک ہے پورا آپ کی شرٹس کا۔" ماہم نے اس کا غصہ ٹالنے کے لیے ذرا مسکرا کے کہا۔

"میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا' صرف دو کام تمہارے ذمے ہیں' کھانا بنانا اور کپڑے دھونا' وہ بھی تم ڈھنگ سے انجام نہیں دیتیں' کس قسم کی کام چور اور گنوار عورت ہو۔" اس نے وہیں کھڑے کھڑے بے عزتی کر دی۔

"پلیز کاشف میں..."

"چھوڑو یہ سب اور بیڈ روم میں میری شرٹ لے کے آؤ۔" وہ پیر پٹختا واپس مڑ گیا۔

وہ اس کے لیے سوپ تیار کر رہی تھی۔ ککر میں گوشت ڈال کر' بند کر کے چولہے پہ چڑھا دیا' شرٹ کے چکر میں الجھ کر وہ اس کے کھانے سے غفلت نہیں برت سکتی تھی' ورنہ ایک اور فساد برپا ہو جاتا۔

وہ شرمندہ سی ہاتھ میں میلی شرٹ پکڑے کھڑی تھی۔

"اس کی بدبو سونگھنے کے بجائے جاؤ اور اچھی طرح دھلائی کرو۔" اس نے رعب سے حکم صادر کیا۔

صرف شب میں بھگوتے اسے رونا آ رہا تھا۔ کبھی کوئی ان آنکھوں میں آنسو دیکھنے کا روادار نہیں تھا جو اب روز ہی اپنی بے بسی اور بے عزتی پہ خون کے آنسو روتی تھیں۔ کاشا کی وارڈ روب میں لاتعداد شرٹس تھیں۔ ایک بار کے پہنے کپڑے کی باری ہفتوں بعد آتی اور کبھی بالکل ہی نہ' بالکل نئے سوٹ اٹھا کر وہ نوکروں کو تھما دیتا۔

پندرہ منٹ لگا کے اس نے رگڑ رگڑ کے دھلائی کی۔ اسے کہاں اتنے کام کرنے کی پریکٹس رہی تھی' اس کی انگلیاں دکھنے لگیں' شرٹ سوکھنے ڈال کر ملازمہ کو کچن میں کھڑا کر کے وہ دوبارہ اندر آئی۔ کاشا گھر میں ہوتا تو اسے آس پاس رہنے کا حکم تھا۔ تاکہ اسے آوازیں دے کر بلانا نہ پڑے' وہ صرف ایک آواز دیتا' دوسری بار چلاتا تھا۔ ماہم جوں جوں اس کی مزاج شناس ہو پاتی جا رہی تھی اس سے ڈرنے اور بچنے لگی تھی۔

"جی..." وہ یک لفظ بولی۔

"ایسا کرو' میرا جا کلیٹی کلر کا نیا سوٹ ہے' اسے نکالو اور جما کے پریس کرو۔" اس کے نئے آرڈر پر ماہم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جو ابھی شرٹ کا رونا ڈالا تھا' ختم' اس کا جی چاہا کاشا کو کھری کھری سنائے۔

"اب یوں بت بنی مجھ پہ کیا منتر پڑھ کے پھونک رہی ہو' جاؤ جو کہا ہے کرو۔" اس کے ٹوکنے پر وہ ہٹ گئی۔

کاشا بہت بڑی مصیبت کا نام تھا۔ وہ جو شروع میں اس کے سارا دن باہر رہنے اور لیٹ آنے پر خفا ہوتی

تھی۔ اب دعائیں مانگتی تھی کہ کاشا صبح منہ اندھیرے کا نکلا' رات کے آخری پہر ہی لوٹے۔ اپنی بیزاری ظاہر کرنے والی وہ خود تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا؟ جس پہ وہ اس سے اکڑتی یا جھگڑا کرتی۔

اس کا شوہر کے اصل روپ سے اب واسطہ پڑا تھا' جو بہت ہولناک تھا۔ جسے سوائے برداشت کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

اگلے دو گھنٹے کاشا نے اس کی خوب پریڈ کروائی۔ خوش قسمتی سے سوپ اچھا بن گیا تھا۔ جسے اس نے چپ چاپ پی لیا۔ وہ یوں ہی کسی کام میں کیڑے نہیں نکالتا تھا۔ بس تھوڑا سا بھی غلط ہو جاتا تو اس کی شامت آ جاتی۔ اس کی تیاری آخری مراحل میں تھی اور ماہم دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی۔

"جوتے۔" آئینہ کے سامنے کھڑے اسپرے کرتے اس نے کہا۔

"سب پالش ہیں' کون سے لیں گے؟"

شو ریک میں ترتیب سے رکھے سب جوتے پالشڈ تھے۔ "قمیص کے ساتھ جو گرز نہیں پہنے جاتے' کوئی بھی چپل نکال دو۔" ماہم نے اس کے پیروں کے آگے چپل رکھ دی۔

"اس پہ برش پھیرو۔"

چپل پہن کر وہ کہہ رہا تھا۔

صاف ستھری چپل پہ برش پھیرتے ماہم کا جی چاہا اس کے پیروں پہ کوئی وزنی سی چیز دے مارے۔

☆ ☆ ☆

منصور بچوں کے بہت قریب اور محتاط ہو گیا تھا۔ شاید یہ بچے ہی تھے جن میں وہ خود کو مگن کر کے سب کچھ بھلا سکتا تھا۔ بچوں کی گورنس بھی' نوکر چاکر' ماجدہ' اماں حاجراں تھیں' مگر وہ کسی پہ اعتبار نہیں کرتا تھا۔ صبح بچوں کو ناشتا خود کروا کے آفس جاتا' شام کو وقت پہ گھر آ جاتا' چھٹی کے روز وہ سارا دن ان کے کام میں مصروف رہتا۔ ان کو نہلانا دھلانا' کھیلنا اور کچھ اوپری کام' بیٹی میں تو اس کی جان تھی۔ وہ رات کو خود اس کے لیے فیڈر بناتا' اماں حاجراں نے کہا بھی کہ بچی گورنس کے پاس رہنے دو' مگر وہ نہ مانا۔

شاہم کوشش کرتی کہ منصور کی موجودگی میں کم سے کم باہر آئے۔ زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں بند رہتی۔ وہ جب منصور کو بچوں کے کام کرتے ان کی چیزیں سمیٹتے' ان کے لیے فکرمند ہوتے دیکھتی تو اسے شرمندگی ہوتی۔ اس کا دل کہیں چھپ جانے کو کرتا۔ منصور کا رویہ اس کے ساتھ رتی برابر بھی نہیں بدلا تھا۔ وہ رات کو اب کھانے کی ٹیبل پہ ضرور ہوتا۔ اس سے روز مرہ روٹین اور ادھر ادھر کی گپ شپ بھی کرتا' یوں لگتا تھا جیسے سب کو بہلانے کے چکر میں وہ خود کو بہلا رہا ہے۔ کسی شام وہ بالکل چپ چاپ سا اسٹڈی روم میں بیٹھا رہتا یا لان میں دھری کرسیوں پہ یک ٹک گھاس کو دیکھتے گھنٹے بتا دیتا۔

منصور کی حالت پہ شاہم کا دل کڑھتا۔ اسے منصور سے ہمدردی اور ماہم سے نفرت سی ہوتی جا رہی تھی جو اس سب کی ذمہ دار تھی' اکیلی ذمہ دار تھی۔

وہ سو رہی تھی' جب دعا کے مسلسل رونے سے اس کی آنکھ کھلی۔ رات کے اس سناٹے میں اس کے بلکنے کی آواز بہت اونچی تھی۔ منصور دعا' عمیر اور حمزہ کو اپنے ساتھ ہی سلاتا تھا۔ شاہم نے بے چینی سے کروٹیں بدلیں' کانوں پہ تکیہ بھی رکھا۔ اس کی نیند اڑ چکی تھی اور دعا کے رونے کی رفتار تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

ڈریسنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھتے' بال سمیٹ کر وہ باہر آ گئی۔ منصور کے کمرے کا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ دعا اور گورنس کے بولنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

"دعا کیوں رو رہی ہے؟" ذرا جھانکتے ہوئے وہ اندر داخل ہو گئی۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں' میڈیسن دی ہے مگر سو نہیں پا رہی۔" منصور نے اسے کندھے سے لگائے' تھپکیاں دیتے' جھنجلاتے ہوئے اسے بتایا۔

"سر! آپ مجھے دے دیں' میں اسے سنبھال لوں گی۔" گھبرائی ہوئی گورنس نے ہاتھ آگے بڑھا کر دعا کو لینا چاہا۔

"نہیں' مجھے اس کے بنا نیند نہیں آتی' پھر اس کی طبیعت بھی خراب ہے' رہنے دو' تم۔" منصور نے صاف انکار کر دیا۔

"صاحب جی! اگر کہیں تو کوئی دیسی ٹوٹکا آزما لیں۔" ماجدہ نے نیا مشورہ دیا۔

"فار گاڈ سیک! ایک تو بچی رو رہی ہے اوپر سے تم دونوں میرا دماغ چاٹ رہی ہو' جاؤ آپ لوگ یہاں سے' میں خود ہی سب ہینڈل کر لوں گا۔" وہ دونوں بغلیں جھانکتی باہر نکل گئیں۔

"بش بش... میری بیٹی! ابھی آرام آ جائے گا' کیا ہوا بابا کی جان کو۔" وہ اسے بڑے پیار سے پچکار رہا تھا۔

اس کے رونے میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔

"پلیز منصور بھائی! آپ اسے مجھے دے دیں' میں چپ کروا دوں گی اسے۔" منصور نے بہت بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ خود بھی اسے سنبھالتے بہت نڈھال ہو چکا تھا۔

"پلیز! اسے کوشش کرنے دیں' سنبھالنے دیں۔" اس نے دعا کو شاہم کی پھیلی باہوں میں ڈال دیا۔

شاہم نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بازوؤں کو دائیں سے بائیں جھلانا شروع کر دیا۔ منصور کچھ دیر کھڑا رہا' پھر صوفے پہ ہی لیٹ گیا۔

دعا شاہم کی گود میں جا کر چپ ہو گئی تھی۔ شاہم نے اسے فیڈر دے دیا۔ وہ سو گئی تو شاہم نے منصور کو پکارنا چاہا' مگر وہ بھی صوفے پہ ہی سو چکا تھا۔ اس نے احتیاط سے دعا کو بستر پہ لٹا دیا۔ جیسے ہی اس نے اس پہ کمبل ڈالا' وہ پھر سے کسمسانے لگی۔ شاہم اس کے اٹھ جانے کے خیال سے اس کے ساتھ ہی نیم دراز ہو گئی اور اس کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

دعا کے سونے پر وہ وہاں سے اٹھ جاتی' مگر اس کی آنکھ صبح ساڑھے سات بجے کھلی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ منصور ابھی بھی صوفے پر گہری نیند میں تھا۔ وہ ساری رات اس کمرے میں رہی ہے۔ اس پہ بری طرح گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ جلدی جلدی احتیاط سے چپل پہن کر جانے کے لیے اٹھ گئی۔ منصور کے قریب سے گزرتے بالکل اچانک ہی وہ رک گئی۔ اس بے خبر سوئے ہوئے وجود کو وہ یوں ہی دیکھتی رہی۔

منصور کی آنکھوں کی چمکتی روشنی' ہونٹوں پہ کھیلنے والی مسکراہٹ' ماہم سے چھوٹی چھوٹی شرارتیں' کتنا ہی کچھ اس کے ذہن میں گھوم گیا۔ ماہم کی موجودگی میں وہ اس کمرے میں آتے ہوئے جھجکتی تھی اور اب ایک رات یہاں بیت گئی تھی۔ اس نے مڑ کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ بیڈ پہ پڑا اس کا کمبل اٹھا کر احتیاط سے اس کے اوپر ڈال دیا اور باہر نکل آئی۔

ملازم ابھی تک سو رہے تھے اور پھر ملازموں کے کمرے نیچے ہی تھے۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ دبے قدموں چلتے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس رات کے معمولی سے واقعہ نے شاہم میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ اپنے آپ ہی منصور کے آفس جانے کے بعد بچوں کا دھیان رکھنے لگی۔ گھر سے باہر جانا یوں بھی اس نے ترک کر دیا تھا۔ ان کی چیزوں' کپڑوں' کھانے پینے کا خیال سب وہی کر رہی تھی۔ وہ تو کبھی ان کے قریب بھی نہیں گئی تھی۔ اب بہت گھل مل گئی تھی۔ اگر اسے کچھ کرنے میں دشواری ہوتی تو وہ ماجدہ اور گورنس کی مدد لے لیتی۔ زیادہ کوشش کرتی کہ وہ ان کے سارے کام خود سے کر لے۔

اسے اب احساس ہوتا تھا کہ اسے یہ ذمہ داری بہت پہلے اٹھا لینی چاہیے تھی۔ چھٹی کے روز وہ بچوں کے کسی کام میں مداخلت نہ کرتی' سب کچھ منصور ہی کرتا۔ اسے تو شاید پتا بھی نہیں تھا کہ شاہم نے اس کا کتنا بوجھ بانٹ لیا ہے۔

اس کی اپنے بھانجوں عمیر اور حمزہ سے بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی' جو دونوں تین سال کے تھے۔ وہ بھی سارا وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے۔ اس کے ساتھ کھیلتے کودتے۔ شاہم کو زندگی کا یہ نیا رخ اصل معنوں میں سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس کی جوں جوں بچوں سے

محبت بڑھتی جارہی تھی اس کے دل میں ماہم کے حوالے سے تشنگی بھی بڑھ رہی تھی۔

اسے یاد نہیں تھا کہ ماہم نے کبھی اپنے اولاد سے لاڈ کیا ہو ان کا منہ چوم کر سینے سے لگایا ہو۔ انہیں لے کر کہیں گھومنے پھرنے گئی ہو۔ وہ عمیر اور حمزہ کے لیے بہت سے نت نئے کھلونے اور اسکیچ بک لائی تھی۔ پوسٹر کلرز سے برش میں رنگ بھرتے انہوں نے اپنی انگلیاں اور ہاتھ بھی بھر لیے تھے۔ شاہم نے شرارت سے ان کے گالوں پہ بھی برش سے پینٹ پھیر دیا۔ اب ان دونوں بھائیوں کی باری تھی۔ انہوں نے رنگ شاہم کے نہ صرف منہ اور ہاتھوں پہ بلکہ کپڑوں پہ بھی گرا دیا۔ شاہم گرین کلر کی شیشی اور برش پکڑے لاؤنج میں ان کو پکڑ رہی تھی۔ وہ دونوں قہقہے لگاتے، تالیاں بجاتے، چیختے ہوئے اس سے بچنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ سارے لاؤنج میں شور تھا۔

اسی پل منصور اندر داخل ہوا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟" لاؤنج کی صورت حال پہ وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔

"پاپا جی آنٹی (آنٹی)" وہ دونوں باپ کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ شاہم بھی رک گئی تھی۔

"یہ کیا حلیہ بنایا ہے شاہم!" منصور کا اشارہ اس کے کپڑوں اور چہرے پہ لگے پینٹ کی طرف تھا۔

تقریباً یہ ہی حال بچوں کا بھی تھا۔

"یہ حلیہ میں نے نہیں، آپ کے ان چیتوں نے میرا بنایا ہے۔ اب میں بھی ان پہ گراؤں گی۔" اس نے ان دونوں کو کھینچنا چاہا۔

وہ مزید باپ سے چمٹ گئے۔

"نو پاپا... نو..."

"ایک سیکنڈ... ایک سیکنڈ۔" منصور نے تھوڑا جھک کر بچوں کے گرد بازو لپیٹ لیا۔

"دیکھو پلیز، میرے معصوم بیٹوں سے بدلہ تو مت لو ویسے تم لگ بہت خوف صورت رہی ہو۔"

منصور نے مصنوعی بے چارگی سے مسکراہٹ دباتے کہا۔

اتنے عرصہ بعد گھر میں بچوں کی ہنسی، آواز اور شور سن کر اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ عمیر اور حمزہ اس سے زیادہ شاہم کی طرف کیوں لپکتے تھے جبکہ شاہم اس کے سامنے آنے سے یا بچوں سے کھلنے ملنے سے ذرا کتراتی ہی تھی۔

"نو پرابلم، آپ کے بیٹوں کا بدلہ آپ سے تو لیا جاسکتا ہے نا، بڑے آئے حمایتی۔" اس نے برش کو پینٹ میں ڈبو کر منصور کے چہرے پر پھیر دیا۔ یہ سب اس نے اتنا اچانک کیا کہ منصور اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکا۔

"واٹ نان سینس شاہم!" وہ ہونقوں کی طرح چلایا۔

"اوہ رئیلی۔" وہ کھلکھلائی۔

عمیر اور حمزہ بھی اس کی ٹانگیں چھوڑے ہنسی میں آنٹی کے ساتھ تھے۔

"یو آر لکنگ سو گڈ منصور بھائی!" اس نے لوٹ پوٹ ہوتے اس کی تعریف کی۔ منصور بھی ان کے ساتھ خود پر ہی ہنسنے لگا۔ بہت عرصہ کے بعد وہ کھل کر بے تحاشا [illegible]۔

"اوکے یار! آج ڈنر کا ڈنر بچوں کے ساتھ باہر کریں۔"

منصور نے خوشی کے عالم میں شاہم سے پوچھا۔

"ہاں، اکچوئیلی ان دونوں کی اور دعا کی کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے، آپ چینج کرلیں، میں ان کا منہ ہاتھ دھلوا دوں اور اپنا بھی، ہم بھی چینج کر کے آتے ہیں۔" وہ ان دونوں کو ساتھ لے چلی گئی۔

منصور کے لیے وہ شام بہت حیرت انگیز تھی، جو اس نے شاہم کے ساتھ گزاری تھی۔ اس نے گھر سے چلتے ہوئے کہا کہ ماجدہ کو دعا کو اٹھانے کے لیے ساتھ لے جاتے ہیں مگر اس نے دعا کو گود میں اٹھا کر صاف انکار کر دیا۔ عمیر، حمزہ کے لیے کپڑے خریدے تھے۔ ان کے کھلونے، رنگین بکس، کڈز بکس، بلاکس اور خوب صورت سی بے بی سائیکل وہ دونوں جس چیز پہ انگلی دھرتے اشارہ کرتے وہ خریدتی جاتی۔

دعا چھ مہینے کی ہو گئی تھی۔ اس کے دودھ کا ڈبہ

تبدیل کرنا تھا۔ منصور کا دھیان نہیں تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے فون کر کے سب پوچھا تھا۔ منصور یہ بھی نہیں جانتا تھا۔

دودھ کے ڈبے، سیریلیک اس کا ایک فیڈر گم ہو گیا تھا۔ اس کے پیمپرز بھی ختم تھے۔ کچھ ضروری میڈیسن کھانسی، نزلہ، زکام کے لیے۔ ساتھ ہی اس نے منصور کو بھی یاد دلایا تھا کہ اس نے کافی عرصہ سے اپنے لیے شاپنگ نہیں کی۔ اس نے منصور کی شاپنگ میں اس کی مدد بھی کی۔ ڈنر کے بعد انہوں نے آئس کریم کھائی۔ عمیر اور حمزہ کی شرارتیں، دکانوں کی چیزوں سے چھیڑ چھاڑ، مارکیٹ میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنا، بلاوجہ ہی کسی شاپ میں جا گھسنا، ہر بیس منٹ بعد ان کا گم جانا۔

منصور کے لیے جہاں یہ شام حیرت انگیز تھی وہیں یادگار بھی بن گئی تھی۔

وہ پہلی بار کسی عورت اور اپنے تینوں بچوں سمیت اتنے [illegible] اور دوستانہ ماحول میں باہر وقت گزار رہا تھا۔ واپسی پہ عمیر پچھلی سیٹ پہ سو گیا۔ دعا بھی اس کی گود میں سو چکی تھی۔ حمزہ اگلی سیٹوں کی بیک تھامے بیچ میں پھنسا کھڑا تھا۔ جیسے ہی گاڑی سگنل پہ رکی، ایک بچہ موتیا اور گلاب کے گجرے اور بالے پکڑے گاڑی کے قریب آگیا۔ یہ وہ ہی بچہ تھا جس سے کبھی منصور ماہم کے لیے گجرے لیا کرتا تھا۔ اب عرصہ ہوا اس نے اس سے کچھ نہیں خریدا تھا۔ پھر بھی وہ جب بھی اسے دیکھتا تو ضرور اس کی گاڑی کے پاس آرکتا۔

"گجرے یا بالے لے لو صاب۔" اس نے کھڑکی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"نہیں یار، کچھ نہیں چاہیے۔" اس نے ذرا کی ذرا سب دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"ایسا مت بولو صاب! صبح سے زیادہ نہیں بکا، ہو رہے تک مرجھا جائیں گے۔" اب اس کے کہنے میں بے چارگی تھی۔

"ایک بار بول دیا نا، نہیں چاہیے مجھے۔" منصور نے اب کوفت سے کہا۔ یہ پھول والا اس کے لیے ایک

اور اذیت تھا۔ اس کے پھولوں سے بھی اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں مگر اس وقت وہ کچھ بھی یاد کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"بیگم صاحب کے واسطے خرید لو، مولا آپ کی جوڑی سلامت رکھے، ان کی کلائیوں میں بڑے جچیں گے صاب۔"

اس نے خاموشی سے سب سنتی شاہم کے متعلق اندازہ لگایا۔

شاہم نے گھبراہٹ سے باری باری دونوں کو دیکھا۔ منصور بھی بوکھلا گیا تھا۔

"یہ لو پیسے رکھو، مگر کچھ خریدنا نہیں ہے۔"

منصور نے جان چھڑانے کے لیے جلدی سے والٹ سے سو کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

اسی لمحے سگنل کھل گیا تھا۔ زیادہ رش نہیں تھا۔ پیچھے سے ایک، دو گاڑیوں نے ہارن دیا اور دوسری سائیڈ سے ہو کر نکل گئیں۔

"ایک منٹ چھینا نہیں صاب!"

وہ پیسے پکڑ کر اسے انگلی سے رکنے کا اشارہ کرتے شاہم کی طرف آیا۔

"اب کیا ہے؟" منصور نے اسے گھورا۔

"میں جان گیا جی، بیگم صاحبہ آپ سے ناراض ہیں، آپ اپنے ہاتھ سے انہیں گجرے پہنا دو، مان جائیں گی جی۔"

وہ دونوں اس بچہ کی اس بات پہ ہکا بکا رہ گئے۔

گھر پہنچنے تک ان کے بیچ خاموشی چھائی رہی۔

☼ ☼ ☼

کاشانے رات کو آتے ہی اسے چائے کا آرڈر دے دیا، وہ چائے بنانے چلی گئی، واپس لوٹی تو کمرے کی حالت زار دیکھ کر جز بز ہوئی۔ موزے اتار کر بیڈ پر پھینکے گئے تھے، بوٹ کی مٹی سے سارا کارپٹ گندا ہو گیا تھا۔ شرٹ صوفے سے نیچے لٹک رہی تھی، موبائل، گلاسز اور کی چین ڈریسنگ ٹیبل پہ اچھالنے سے اس پہ رکھی دو، تین بوتلیں نیچے گر گئی تھیں۔ جرس کے سگریٹ

کی بو سارے کمرے کو آلودہ کیے ہوئے تھی۔ اسے کاشف کے اس طرح کے کاموں سے بہت نفرت تھی۔ وہ اکثر رات کو بھی پی کر آتا تھا۔

"کاشف چائے۔" اس نے دبا کر ذرا اونچا کہتے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"رکھ دو، سر میں انڈیلوگی کیا۔" ڈرنک مکس کرتے دیکھے بغیر اس نے لتاڑا۔

"کاشف! تم اس طرح کے کام گھر سے باہر کیا کرو، پلیز۔" چائے اس نے ٹیبل پہ اتنے زور سے پٹخی کہ وہ کناروں سے چھلک گئی۔

"اور اگر میں تمہیں ہی گھر سے باہر کردوں تو؟"

کاشف نے سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے گھورا۔ اسے شاید یاد نہیں تھا کہ یہ گھر ماہم کے نام ہے، وہ اس کے ساتھ رہ رہا ہے۔

وہ تمتماتا چہرہ لیے خاموش کھڑی رہی، جی تو چاہا اسے یاددہانی کروائے کہ "میں مالکن ہوں۔"

"مجھے گھن آتی ہے۔" اس نے کراہیت سے کہا۔

"تمہیں... تمہیں مجھ سے گھن آتی ہے؟"

وحشیانہ تیور لیے وہ اس کی طرف بڑھا۔

ماہم خوف سے پیچھے ہٹی، وہ اسے پہلے ہی چھیڑ چکی تھی، اب وہ اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے آج تک کسی کو اتنی اجازت نہیں دی تھی کہ کوئی اس کی سرگرمیوں میں مداخلت کرتا، خاص طور پر ایک عورت۔

"تمہیں اپنے یار کی قربت سے بھی نفرت تھی، اب مجھ سے بھی گھن آنے لگی، کل کسی تیسرے کو کرلینا، یہ ہی کرتوت ہیں تمہارے، میں سمجھاتا ہوں تمہیں کہ اگر شوہر میرے جیسا فارغ دماغ ہو تو اس سے کیسے بی ہیو کرتے ہیں، اتنے مہینوں سے پیار کی زبان سے سمجھاتا آرہا ہوں، مگر تمہارے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے، کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔" اس نے پورے زور کا تھپڑ اس کے گال پہ مارا۔

"آج کی مار تمہیں پوری لائف کے لیے کیئر فل بنادے گی، تمہیں مینرز سکھاتا ہوں۔" اس نے بازو سے پکڑ کر گری ہوئی ماہم کو اٹھایا اور دوسرا تھپڑ مار کر پھر گرادیا۔

وہ درد سے بلبلا رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔ وہ اس سے اپنا بچاؤ نہیں کرسکتی تھی، وہ وحشی بن گیا تھا۔

"تم میری ایکٹیویٹیز میں مداخلت کروگی؟ مجھے سکھاؤگی؟ اچھے اور برے کا ڈیفرنس بتاؤگی؟" وہ اسے مارنے کے ساتھ چلا بھی رہا تھا۔

"گیٹ لاسٹ فرام ہیئر، ادروائز آئی ول کل یو ریئلی۔" (چلی جاؤ یہاں سے ورنہ تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔)

اسے بالوں سے پکڑ کر اس نے باہر دھکا دیا۔ خود بیڈ کراؤن کی درازیں باہر کھینچ کھینچ کر کھنگالنے لگا۔ وہ شاید ریوالور ڈھونڈ رہا تھا۔

ماہم بکھرے بال، روتے ہوئے، درد درد وجود کو گھسیٹتی خوف سے باہر بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

شاہم نے آہستہ آہستہ [illegible] ذمہ داری سنبھال لی۔ [illegible] ایک عرصے سے [illegible] اور بے ترتیبی کا مرکز بنا ہوا تھا، سب کچھ بدلتا ہوا لگا۔ چہروں پہ مسکراہٹیں بکھرنے لگیں۔ چپ کے قفل ٹوٹ کے آوازوں اور شور میں بدل گئے۔ اس سب میں شاہم کا ہاتھ تھا۔ اسے منصور کی محبت خود پر قرض لگنے لگی، جسے اسے چکانا تھا۔ عمیر اور حمزہ کو اس نے اسکول میں پلے گروپ میں داخل کروادیا تھا۔ دعا کی دیکھ بھال وہ خود کرتی۔ اب وہ بھی خالہ کی اتنی عادی ہوگئی تھی کہ رات کو بھی اس کے ساتھ ہی سوتی۔

منصور اس کی تعریف کرنے کے ساتھ حیران بھی ہوتا۔ ابھی سال بھر پہلے تک وہ ایک شوخ و چنچل سی، لاپروا، اپنے آپ میں مست و مگن رہنے والی، اب ایک بازو میں دعا کو اٹھائے دوسرے ہاتھ سے عمیر اور حمزہ کے منہ میں نوالے بنا کر ڈال رہی ہوتی۔ عمیر اور حمزہ کی ریں ریں اور اس کی دھمکیاں، دعا کی ننھی قلقاریاں سب بہت مکمل اور خوشگوار لگتا۔ اس نے ارسل سے ملنا بہت کم کردیا تھا۔ کبھی کبھار ہی جاتی، فون پر رابطہ رہتا۔ اب ارسل سے وہ اپنی باتیں اور [illegible] کے بجائے عمیر اور حمزہ ڈسکس کرتی رہتی۔

"شاہی! تم بچوں سے بہت اٹیچ ہوگئی ہو۔"

وہ ارسل سے ملنے آئی تھی اور تب سے اسے ان ہی کے قصے سنا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سب سن رہا تھا۔

"یار! بچے ہوتے ہی بہت سویٹ ہیں۔" اس نے اپنی رو میں کہا۔

"ہاں مگر اپنے ہوں تو..."

"یہ بھی اپنے ہی ہیں۔" اس نے ارسل کی شرارت پہ مسکراتے اسے چپت لگائی۔

"شاہی... آئی تھنک ہمیں اب شادی کرلینی چاہیے۔"

وہ کافی دنوں سے ایسا ہی سوچ رہا تھا۔

"کیوں، اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

"واٹ، جلدی! جب بالوں میں سفیدی آجائے گی [illegible] مناسب رہے گا، لڑکیاں پارلر میں میک اپ [illegible] جاتی ہیں، تم بالوں کو کلر کروانے جانا [illegible]" وہ خفا ہوگیا تھا۔

"ڈونٹ بی سلی ارسل! ابھی اتنی مشکلوں سے تو ہم [illegible]"

"سنبھل تو گئے ہو نا، تمہارے جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اِن دا لاسٹ، ہم نہیں [illegible] تمہارے بغیر ہی سیٹ کرنی ہے۔" اس نے [illegible] بتایا نہیں تھا، وہ سائرہ رحمان سے جھگڑ کر اسی [illegible] میں شفٹ ہوگیا تھا۔ مطیع الرحمان نے [illegible] سمجھایا، مگر وہ نہ مانا۔ وہ اب تک اسی لیے [illegible] کررہا تھا کہ ماں کو ایک دن راضی کرلے [illegible] اب اس نے ماں کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا۔ [illegible] بابا جانی کی ہاں اور موجودگی کی ضرورت [illegible] کے ساتھ ہی تھے۔

"ارسل! میں اتنی سیلفش نہیں ہوسکتی، اس سے... اس بروکن فیملی کو میری ضرورت ہے، جو انہیں سہارے کا آسرا دے سکے، میں نے انکار کب کیا ہے؟ مجھے کچھ وقت دو... پلیز ارسل!"

اس کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔

"میں تمہیں ساری زندگی بھی دے سکتا ہوں، مگر میرے... میرے اندر کہیں بہت دور خطرے کا ایک الارم سا بجنے لگتا ہے، کچھ ہو نہ جائے، کچھ..."

شاہم نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"ایسا نہ کہو ارسل! مجھ میں اب ہمت نہیں مزید کچھ برداشت کرنے کی، میں نے بہت مشکلوں سے خود کو جوڑ رکھا ہے، ذرا سی بھی... ضرب مجھے چور چور کردے گی، نہیں بولو ارسل!" وہ رونے لگی تھی۔

اسے یاد تھا پہلے بھی جب ان دونوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا اور پھر ماہم والی ٹریجڈی ہوگئی تھی۔

"شاہی! چپ ہوجاؤ، سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

☼ ☼ ☼

"میں نے ارسل کو انکار کیوں کیا؟"

رات کو بستر پہ بیٹھی وہ سوچ رہی تھی۔

"بچے اور منصور بھائی کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں کہ میری شادی میں رکاوٹ بن سکیں اور پھر ارسل کیا میں... اس کی نیچر سے آگاہ نہیں، اس نے میری مجبوری کو ہمیشہ انڈر اسٹینڈ کیا ہے، میں بزی ہوں، کال اٹینڈ نہیں کرتی، مہینے بعد ملنے جاتی ہوں، اس کے پچاس ایس ایم ایس پر ایک جواب دیتی ہوں، اس نے کبھی شکوہ تک نہیں کیا، پھر وہ کیوں شادی کے بعد روک ٹوک لگائے گا، میں خود سے ہی ہر بات سپوز (فرض) کیے ہوں۔"

وہ دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی۔ اس نے ارادہ کیا کہ میں صبح ارسل کو فون کرکے "ہاں" کہہ دوں گی، تب بھی وہ ایسا نہ کرسکی، کوئی ان دیکھی چیز یا خدشہ اس کی راہ روک لیتا۔

اس رات وہ منصور کو اس کے بیڈ روم میں کھانے کے بعد کافی دینے گئی تو اس نے روک لیا۔

"وہ لڑکا جس کا نام۔۔۔ ہے ہی ارسل تھا۔ ایک دفعہ آیا بھی تھا' اسے دوبارہ بلاؤ۔ مجھے اس سے ضروری بات کرنی ہے۔" کافی کا کپ اس نے سائیڈ پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ منصور بھائی! میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی' میں۔۔۔ بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"وہ جان گئی تھی کہ وہ ارسل سے کیا بات کرے گا۔ اس نے انکار اور وجہ ایک بتا دی۔

"بہت کچھ کھو کے میں نے زندگی سے سیکھا ہے کہ کسی کے جانے سے رکنا تو در کنار' زندگی بھر کے لیے ٹھہرتی بھی نہیں' اپنی تلخیوں اور خوشیو رواں دواں رہتی ہے' شاید۔۔۔ شاید ہم ٹھہر جاتے ہیں اپنے دکھ سے لپٹے اور جب ہمیں احساس ہوتا ہے تو ہم اس کے پیچھے سرپٹ دوڑتے ہیں' تاکہ اس کو جا لیں' بہت۔۔۔ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ۔ جو پھر سے اس کی برابری کر لیتے ہیں' بدنصیبی ہوتی ہے ان کی جو ہانپتے کانپتے کا ساتھ نہیں دے پاتے۔" وہ نہیں دو سالیا تھا۔

"مگر شاہم! تم۔۔۔ تم بدنصیبی کو اپنا مقدر مت بناؤ' ہم میں سے کسی کو تو منزل ملے' کوئی تو سنارے پہ لگے' کسی کی جھولی میں تو خوشیوں کی سوغات ہو۔" وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

وہ خاموشی سے سنتی رہی اور پلٹ گئی۔

یہ ہی خاموشی اس کے لبوں پہ ٹھہر گئی۔

اب منصور نے بھی کہہ دیا تھا' اسے ارسل کو منصور کے کہنے پہ ہی ایک بار تو بلانا چاہیے تھا۔

اس نے ارسل سے بالکل ذکر نہ کیا۔ اس کی حالت بہت عجیب تھی' بچوں سے الگ ہونے کا تصور اس کے لیے سوہان روح تھا۔ وہ کسی خود ساختہ احسان تلے دبی ہوئی تھی۔

وہ کچن میں کھانے کی تیاری چیک کرنے آئی تو اندر سے آتی اماں حاجراں اور ماجدہ کی باتیں سن کر یاہر ہی رک گئی۔

"دیکھو' اب کیا ہوتا ہے؟ منصور تو شاہم کی شادی جلدی کرنا چاہتا ہے۔" اماں حاجراں بہت دبے اور تھکے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"وہ ایک بار گھر بھی آیا تھا' بہت خوب صورت ہے۔ شاہم کی جوڑی اچھی لگے گی اس کے ساتھ۔" ماجدہ شادی کے تذکرے پہ بڑی خوش تھی۔

"پر اگر۔۔۔ شاہم کے ساتھ منصور اپنے بارے میں بھی کچھ سوچ لیتا تو بہتر تھا' ابھی اس بچی نے کتنی مشکلوں سے سب جوڑا ہے۔ یہ چلی گئی تو سب پھر بکھر جائے گا۔"

اماں! حاجراں بہت فکر مند ہو رہی تھیں۔ انہیں منصور سے بہت محبت تھی۔ وہ بھی ان کی بہت عزت کرتا تھا۔

"اماں! آپ منصور صاحب سے بات کر کے دیکھیں' دوسری شادی کی۔ بچوں کو گورنس کی نہیں ماں کی ضرورت ہے۔"

"بہت بار کی ہے بات' پر وہ نہیں مانتا اور مانے گا بھی نہیں۔ اس خاندان کے مردوں کی ریت ہے' بیوی کے بعد خیر تنہا بچوں کی پرورش کر لیتے ہیں' پرائی عورت کا سایہ اپنے بچوں پر نہیں پڑنے دیتے۔"

"یہ بھی تو سوچو' تین معصوم بچوں کو سنبھالنا آسان کام نہیں۔"

شاہم مزید دیوار کے ساتھ لگ گئی۔

"ایک حل ہے اس مسئلے کا۔ اگر۔۔۔ اگر شاہم' منصور سے شادی پہ راضی ہو جائے۔"

شاہم نے ایک دم دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"بالکل اماں! صرف شاہم بی بی ہی ان کی ماں بن سکتی ہیں' کوئی پرائی عورت نہیں۔" ماجدہ نے بھی اماں کی بات پہ اتفاق کیا۔

شاہم منہ پر ہاتھ دھرے واپس چلی گئی۔

شاہم کو وہ لان میں بیٹھی خالی آنکھوں سے عمیر اور حمزہ کو کھیلتے اور لڑتے جھگڑتے دیکھتی رہی۔ وہ ہر پانچ منٹ بعد منہ بسورتے ایک دوسرے کی شکایت لیے اس کے پاس آ جاتے تو اس کا ارتکاز ٹوٹ جاتا۔

رات کو مدھم روشنی میں کھڑکی میں کھڑے ایک سی

آواز اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

"اگر شاہم منصور سے شادی پہ راضی ہو جائے۔"

"تک ہی گر تم نے دفن نہ کیا تو میں تین دن بھوک ہڑتال کروں گا۔"

تین دن لاؤنج میں اس کے پیچھے بھاگتا' آفس جاتے وقت اس کے گرد بازو لپیٹ کر اس کے ماتھے پہ بوسہ دیتا' پل پل اس کا دھیان رکھتا۔

اب اس کے ذہن میں دوسرا منظر ارسل کا جھلک رہا تھا۔ اس کے ساتھ لڑتا جھگڑتا' بلاوجہ ہی باتیں بڑھاتا' اسے اپارٹمنٹ میں پہلی بار جانا بھی یاد آیا۔

"یہ سب تمہارے لیے۔" ارسل کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

ارسل نے اس کو انگوٹھی بھی پہنائی تھی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر سیف کی طرف آ گئی۔ اسی کے اندر دراز میں اس نے انگوٹھی رکھی تھی۔ دراز کھول کر اس نے انگوٹھی نکالی اور اسے کتنی دیر تکنے کے بعد انگلی میں ڈال لی' اپنے ہاتھ کو سینے سے لگائے وہ رو رہی تھی۔

"آئی لو یو سو مچ ارسل!" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"وہ تم ٹھیک کہتے ہو' ہمیں اب شادی کر لینی چاہیے۔"

وہ ارسل سے مل کر اس سے یہ سب کہنا چاہتی تھی۔ اسے وقت نہیں مل رہا تھا۔ وہ عمیر اور حمزہ کو سلانے بیٹھی تو ان کی ڈائری میں نوٹس لکھا دیکھا۔ اسکول میں پیرنٹس ڈے تھا۔ انہیں بلایا گیا تھا۔

اس نے رات کو منصور کو بتا دیا۔

"ان کے اسکول میں فرائی ڈے کو پیرنٹس ڈے ہے۔"

"فرائی ڈے کو۔" اس نے ذہن میں اپنی مصروفیات کا حساب لگایا۔

"اس روز میں بہت بزی ہوں' تم۔۔۔ ایسا کرنا تم چلی جانا' ویسے بھی وہاں زیادہ تر خواتین ہی ہوں گی۔" اس نے یہ ذمہ داری بھی شاہم پہ ڈال دی۔

"جی بہتر۔" وہ سرہلا کے اٹھ گئی۔

اس نے سوچا' وہ ان کے اسکول سے فارغ ہو کر ارسل کی طرف بھی چلی جائے گی' اسے شادی کے لیے "ہاں" کر کے سرپرائز دے گی۔

مگر سرپرائز تو اسے عمیر اور حمزہ نے دے دیا تھا۔ ایسا سرپرائز جس نے بہت نہیں سب کچھ بدل دیا۔

"ٹیچر میٹ مائی مدر۔" حمزہ نے اپنی ٹیچر سے اس کا انٹروڈکشن کروایا۔ وہ کتنے ہی پل حمزہ کے چہرے سے نظریں ہٹا نہ پائی۔ جبکہ وہ چار سال کا بچہ نادم سا لگ رہا تھا۔

"نائس ٹو میٹ یو میم' بریلینٹ بٹ ویری نٹی بوائز۔" اسی وقت اسے کسی دوسری ٹیچر نے آواز دے لی۔

"ایکسکیوزمی میم۔" وہ اس طرف چلی گئی۔ شاہم گومگو کی کیفیت میں بیٹھ گئی اور حمزہ کے ہاتھ کو پیار سے تھام لیا۔

"آنٹی! حمزہ نے جھوٹ بولا' آپ کو برا تو نہیں لگا؟" عمیر ڈرتے ڈرتے بولا۔

"نن۔۔۔ نہیں' آنٹی کی جان۔" آنٹی بھی تو ماں جیسی ہی ہوتی ہے۔ اس نے اس کو سینے سے بھینچ لیا۔

واپسی پہ وہ ارسل کی طرف نہیں جا سکی۔

اس لمحے نے اس کو بدل دیا تھا۔ وہ جو فیصلہ ایک عرصے سے نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ ان بچوں نے کر دیا تھا۔ وہ جو بات سوچنے سے بھی ڈرتی تھی۔ وہ ان بچوں نے اپنے منہ سے ادا کر دی تھی۔

ان دونوں کا ندامت سے جھکا سر اور حمزہ کی آنکھوں کے آنسو' اس کے ذہن میں یہ منظر اٹک کر رہ گیا۔ شاہم سے اجازت مل جانے پر انہوں نے اپنے سب فرینڈز سے اسے ماما کہہ کر متعارف کروایا۔ شاہم کے آگے پیچھے اڑتے پھرتے وہ بہت خوش تھے۔ خود وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔

اب وہ اکثر راتوں کو روتے گزارتی تھی۔ روتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی انگوٹھی اتار دی۔ ہتھیلی سے آنسو پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیف کے پرسنل لاکر میں اس نے انگوٹھی رکھ

دی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کے اس نے چہرہ صاف کیا پھر بالوں کو پیچھے ہٹاتی وہ باہر نکل آئی۔ منصور کے دروازے پر دستک دیتی وہ ہر احساس سے عاری تھی۔

"تم۔۔۔ اس وقت؟" آنکھ ملتے اس کی حیرت بجا تھی۔

"میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

"ہاں تو۔۔۔ میں نے تو کہا تھا کہ ارسل کو۔۔۔"

"میں ارسل سے نہیں، آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

اس نے اس کی سوئی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

☼ ☼ ☼

آٹھ بج گئے تھے۔ وہ آویزے پہن کر جلدی جلدی چوڑیوں سے بازو بھرنے لگی۔ میرون اور سلور ستاروں کا کام والا بھاری سوٹ کاشا اس کے لیے لایا تھا۔ اپنے لیے شاپنگ کرتے اسے پسند آگیا اور اس نے خرید لیا۔ وہ ڈنر پہ غنی کی طرف انوائیٹ تھے۔ غنی نے صبح ہی فون کر کے کہہ دیا تھا۔ کاشا تقریباً روز ہی اس کی طرف جاتا تھا۔ وہ شادی کے بعد ایک بار ہی گئی تھی۔ کاشا نے اس سے کہا تھا کہ وہ تیار رہے، آٹھ بجے پک کرنے آؤں گا۔

لیٹ ہو جانے کے پیش نظر اس نے جلدی تیاری مکمل کرلی تھی۔ خود کو آئینے میں ہر زاویے سے جانچ کر اس نے کلون اٹھا کر اسپرے کیا۔ لمبے بال پشت پر کھلے چھوڑ دیے تھے۔ چہرے پہ آئے بالوں کو ہٹا کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

بیڈ پہ پڑا بھاری میرون دوپٹا اس نے کندھے پہ ڈال لیا، اب وہ مکمل تیار تھی۔ کاشا کا انتظار تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے رات کا کھانا نہیں بنایا تھا۔ بے چینی سے ٹہلتے اس نے موبائل کے بجائے لینڈ لائن نمبر سے اسے کال ملائی۔ بیل جا رہی تھی، مگر کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس کے بار بار کال کرنے پر بھی جواب موصول نہ ہوا۔ جیسے ہی گھڑی نے نو کا وقت بتایا، فون کی گھنٹی بجی۔

"وہ بھی ابھی آپ اور کاشا پہنچے نہیں ابھی تک۔" غنی کے انداز میں انتظار کی کوفت تھی۔

"میں بالکل ریڈی ہوں، کاشف کا پتا نہیں وہ کہاں رہ گئے ہیں؟ انہوں نے کہا تھا آٹھ بجے آجائیں گے۔ میں بھی ان ہی کو ویٹ (انتظار) کر رہی ہوں۔"

"اسے کال کرلیں۔" غنی بہت جھنجلایا ہوا تھا۔

"کال کی تھی، وہ ریسیو نہیں کر رہے۔" اس نے اپنی بے بسی بتائی۔

"اچھا، میں ٹرائی کرتا ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے فون بند کردیا۔

اپنی بڑھتی ہوئی بے چینی کو کم کرنے اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے فیشن میگزین اٹھالیا۔ صفحے پہ صفحے الٹتے اس کا ذہن باہر سے آتی کسی مانوس آواز کا منتظر تھا۔ میگزین سے اکتا کر اس نے ٹی وی آن کرلیا۔ بے ہنگم سی میوزک کا فل والیوم کر کے وہ خود کو زبردستی ٹی وی دیکھنے پر مجبور کرنے لگی۔

رات کے [illegible] بج گئے تھے، نہ غنی کی کال دوبارہ آئی تھی نہ ہی کاشا آیا۔

وہ بے بسی، مایوسی اور لاچاری سے ٹی وی بند کر کے ریموٹ دور اچھال کر اٹھ گئی۔ کمرے کا دروازہ زور سے بند کر کے آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

اس نے غور سے اپنی آنکھوں میں دیکھا جن میں شکست خوردگی کی تحریر صاف پڑھی جاسکتی تھی۔ کاشا کی بے حسی پر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہر چیز تہس نہس کر ڈالے، اپنا بھی حشر نشر کرلے، مگر وہ ایسا صرف سوچ سکتی تھی۔ کچھ بھی کرنا اس کے بس میں نہیں تھا، بے اختیار ہی اس کی آنکھوں سے آنسو گالوں پر بہہ گئے۔ پھر وہ نیچے کارپٹ پہ بیٹھ کر زور، زور سے رونے لگی۔ جب سے کاشا سے جڑی تھی تب سے ان آنسوؤں کو ضبط کرتی چلی آرہی تھی۔ جو آج بہت ضبط کے باوجود بھی نہیں رکے تھے۔

"میں ان آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

بہت دور سے آتی آواز کی مدھم سی سرگوشی اس کے کان کے قریب ہوئی۔

اس نے یک دم سر اٹھایا۔ دائیں، بائیں، ہر طرف مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اس آواز کو بھلا وہ کیسے پہچاننے میں غلطی کر سکتی تھی۔

وہ کون تھا؟ جو اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

یہ کون ہے؟ جو پل پل اسے رلاتا ہے۔

جو اس نے کھویا تھا اس میں بھی اس کی رضا تھی۔

"ان آنکھوں میں اپنے لیے روشنی چاہیے، بہت محبت ہے ان سے۔"

سرگوشی اب اونچی آواز میں بدل گئی تھی۔

"نن۔۔۔ نہیں۔ میں رو نہیں رہی، کچھ نہیں ہوا مجھے، کاشف کو کوئی۔۔۔ ضروری کام ہوگا" وہ ایسا نہیں ہے۔"

الٹے ہاتھ کی پشت سے گال رگڑتی وہ اس آواز کی گونج سے زیادہ اونچا بول رہی تھی۔ وہاں کون تھا؟ جسے وہ [illegible] رہی تھی، شاید خود کو۔

اس نے ایک ایک کر کے سارا سنگھار اتار دیا۔ [illegible] میں کافی دیر منہ پہ پانی کے چھپاکے مارتی رہی۔ تولیہ صوفے پہ پھینک کر یوں ہی ٹھنڈی خالی بیڈ کو [illegible]۔

کاشا کا رویہ اول روز سے ایسا تھا، مگر اس حرکت سے اسے بے انتہا دکھ پہنچا تھا۔ اس کے اندر بے چینی [illegible] رہی تھی۔ نیند اسے کہاں آنا تھی؟

وہ باہر آئی، بیرونی برآمدے کی سیڑھیوں پہ ہولے سے [illegible] گئی وہ کاشا کی منتظر تھی۔ بہت سی یادیں اس کے ذہن میں چل رہی تھیں، جو سارا کا سارا ماضی [illegible]۔ وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے حال کو مزید تکلیف دہ نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ یہ قبول نہیں کرنا چاہتی تھی کہ کاشف سے شادی کا فیصلہ غلط تھا اور اب وہ پچھتا رہی [illegible] جب حقیقت ایسی ہو کہ جسے جان کر ہمارا بھرم [illegible] چھن جائے تو اپنی پوری کوشش کرنی چاہیے [illegible] ممکن ہو، اس حقیقت سے نظریں [illegible]۔ وہ بھی ایسا ہی کرنے لگی۔ ماضی بار بار بھی یاد [illegible] سوال بن کر سامنے آکر تن جاتا۔

کاشا کی گاڑی نے پونے دو بجے مین گیٹ کراس کیا تھا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ اس نے گھٹنوں میں دبا سر اٹھا کے اسے گاڑی کو لاک کرتے دیکھا۔

وہ مدھر دنا کی دھن کی وسلنگ کرتا آرہا تھا۔ اس نے ابھی ماہم کو نہیں دیکھا تھا۔ جیسے ہی اس پر نظر پڑی اس کا موڈ آف ہوگیا۔

"آج یہاں بستر لگالیا ہے؟" وہ روزانہ کی طرح نارمل تھا۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" اس نے بہت ہمت اور سنجیدگی سے پوچھا۔ کاشا کی مار اور غصہ وہ بھولی نہیں تھی۔

"واٹ؟" اس کی مسکراہٹ یک دم غائب ہوگئی۔ چہرے سے سختی جھلکنے لگی۔

"ہم غنی کی طرف انوائیٹڈ تھے کاشف!" اس نے بہت ضبط سے خود کو چیخنے سے روکا۔ ورنہ کاشا کی اس بے خبری پر اس کا جی چاہا تھا کہ اس کا وجود ملیامیٹ کر دے۔

"اوہ۔۔۔ فارگیٹ اٹ یار، غنی کی کال آئی تھی، میں نے ایکسکیوز کرلیا تھا، ایکچوئلی مجھے لیلیٰ مل گئی تھی، اب وہ اتنے عرصہ بعد ملی تھی، غنی کا کیا ہے، کل چلے جائیں گے۔"

وہ اس کا وقت کسی اور کو دے کر آرہا تھا اور اس نے یہ چھپانے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔

"لیٹس گو ان سائیڈ یار۔" ابرو کو نیچے لٹکا کر ماہم کی حیرت کا نوٹس لیے بغیر وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"ہو از لیلیٰ؟" لاؤنج سے گزرتے اس نے پوچھا۔

"شی از مائی گرل فرینڈ، شادی کی خواہش مند تھی، لیکن اس کے فادر نہیں مانے، اپنے بھتیجے سے کزن سے شادی کر کے امریکہ سیٹل ہو گئی، اب ڈائیورس لے کر پھر سے پاکستان شفٹ ہو گئی ہے۔"

وہ تفصیل بتاتے بتاتے ہوئے کمرے میں آگیا۔

"ڈائیورس ہو گئی۔۔۔ تو اب کن چکروں میں ہے۔" اس نے دانت پیس کر استفسار کیا۔ کہنا تو چاہتی تھی کہ تم کن چکروں میں ہو مگر اسے کاشا کی۔

بھڑک جانے کا خدشہ تھا۔
"جن چکروں میں کبھی تم تھیں۔" اس کی برجستگی قابل توصیف تھی۔
"کیا مطلب؟" اس نے الجھن سے اسے پرکھا۔
"کچھ نہیں یار' ڈنر تو تم نے کرلیا ہوگا' میں بھی کرکے آرہا ہوں' بس ایک کپ اچھی سی چائے پلادو' بٹ وڈ آؤٹ شوگر' میں شاور لوں گا۔" اس نے سستی سے انگڑائی لی جیسے بہت تھکا ہارا ہو۔
ماہم کو علم تھا' وہ بات ٹال گیا ہے' اب سیدھی طرح نہیں بتائے گا۔
وہ خود کو برداشت سکھاتی مڑی۔
"اسٹاپ ماہم!" اگلے ہی قدم پہ کاشانے اسے روک لیا۔
"واٹ از دس؟" اس کے کھلے بالوں کو ہاتھوں میں پکڑے وہ استفسار کررہا تھا۔
"بال ہیں اور کیا؟"
"تمہارے بال اتنے لمبے ہیں۔" اب ابرو کی آنکھوں اور لہجے میں ناگواری تھی۔ ماہم سمجھی تھی کہ اب تعریف کرے گا' کیونکہ اس نے ہمیشہ ہر کسی کے منہ سے اپنے بالوں کے لیے توصیف ہی سمیٹی تھی' مگر یہ کاشف حسین عرف کاشا تھا' جسے یہ بھی ابھی معلوم ہوا تھا کہ اس کی بیوی کے بال لمبے ہیں۔
"تمہارا اشارٹ کٹ نہیں تھا۔" بہت پرانی بات کی تھی اس نے۔
"کئی سال ادھر کی بات ہے۔" اس نے بے دلی سے اپنے بال اس کے ہاتھ سے چھڑا لیے۔
"مجھے عورتوں کے لمبے بال پسند نہیں' پہلی فرصت میں سیلون سے خوب صورت سا ہیر کٹ لو' میں دوبارہ تمہارے سر پہ یہ چھانگا مانگا نہ دیکھوں' انڈر اسٹینڈ' جاؤ چائے بناؤ' انہیں سمیٹ کر' اریٹیشن ہونے لگی ہے مجھے۔"
وہ بول رہا تھا اور ماہم دم سادھے اسے سن رہی تھی۔ وہ درپردہ اس کی بے عزتی کررہا تھا یا اپنی پسند کے سانچے میں ڈھلتے اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ کبھی وہ کاشا کی اس طرح کی باتوں کو ہضم کرکے آرام سے نظرانداز کردیا کرتی تھی' اب اسے چھوٹی چھوٹی باتیں اس کی نیندیں حرام کرتی تھیں' وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
"گھور کیوں رہی ہو؟" صوفے پہ بیٹھے بوٹ اتارتے ہوئے بھی اسے خبر تھی کہ وہ کھڑی اسے گھور رہی ہے۔
"نہیں سوچ رہی ہوں' آپ بہت سچے ہیں یا بے حس ہیں۔"
"یا' رئیلی' سچ بتاؤں یار! میرے حلقہ احباب میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو صرف مجھے سوچ سوچ کر کڑھتے رہتے ہیں۔"
وہ بوٹ اتار کر اس کے بالکل سامنے آکھڑا ہوا۔
"کیونکہ۔۔۔ وہ میرا کچھ بگاڑ تو سکتے نہیں۔۔۔ تم ہو تو میری بیوی' تم ان ہی میں سے ایک۔"
"پلیز کاشف! میں آپ کی ہر برائی پہ خاموش رہی۔ مگر۔۔۔ مگر یہ بال نہیں۔" اس نے آنکھوں میں آنسو لیے فی میں سرہلایا۔ وہ یہ ہی تھا' اس کا شوہر تھا۔
"برائی۔۔۔" وہ مصنوعی حیرت سے طنزیہ مسکرایا۔
"سمعون ورز (ان کی طرح) تم مجھے ابھی اچھی طرح سے جان نہیں پائیں' میں تمہیں اپنی بڑی بڑی اچھائیاں بتاتا ہوں۔" اس نے ماہم کی کمر میں اپنا بازو ڈال کے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "میں نے پندرہ برس کی عمر میں سوسائیڈ (خودکشی) کی' بدقسمتی کہ بچ گیا' ساڑھے سولہ سال کی عمر میں' میں نے اپنی گرل فرینڈ کے چوکیدار پہ قاتلانہ حملہ کیا' کیونکہ اس نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا' بٹ بدقسمتی کہ وہ بچ گیا' سترہ سال میں لگتے ہی میں نے فل پلاننگ سے لاکھوں کا کیش پہلی اور آخری بار چرایا' اب تم بتاؤ کس اچھائی پہ خاموش رہ سکتی ہو' کس پہ نہیں۔" وہ اس کے کان کے قریب بول رہا تھا۔
"کسی پہ بھی نہیں۔" غصے سے اس کی سانس پھول گئی۔

"میں پہلی بار زبان سے سمجھا رہا ہوں' دوسری بار ہاتھ استعمال کرتا ہوں اور آخری چانس ریوالور کو دیتا ہوں' دونوں نسخے آزما لیے ہیں' تم پہ تو فل کورس' تم تیسرے کی ہمت نہیں کرو گی۔"
"تم مجھے مار ہی دو کاشف! جہاں بہت کچھ معاف کیا ہے وہاں اپنا خون بھی معاف کرتی ہوں۔" وہ رونے لگی۔
کاشانے اسے غور سے سنا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے اس کا سر اپنے کندھے سے لگالیا۔
"نہیں میری جان! روتی کیوں ہو' بس اب تم نے مجھے پرمیشن (اجازت) دے دی ہے' میں جلد تمہارا کام کردوں گا۔"
ماہم کے آنسو رک گئے' بلکہ اس کا سارا جسم ہی کاشا کی بانہوں میں ساکت ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

"تم ایک قدر جذباتی اور بے وقوف ہو؟ میں نہیں جانتا تھا۔" منصور نے شاہم کو رات کسی نئی بات پر بات کرنے کے لیے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔
"یہ جذباتیت نہیں' سمجھ داری اور وقت کی ضرورت ہے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔
"مجھے' میرے بچوں اور اس گھر کو تمہاری اور تمہاری ہمدردی کی قطعاً" ضرورت نہیں۔" منصور نے سختی سے کام لیا۔
اسے رات نیند نہیں آئی تھی۔ اسے شاہم سے یہ سب کلیئر کرنا تھا۔ وہ آفس بھی نہیں گیا۔
"I canont amagine (میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا) تم اس حد تک جاسکتی ہو' سو اسٹوپڈ۔" وہ ابھی بھی استعجاب کے عالم میں تھا۔ شاہم کی ان دیدہ دلیری بہت پریشان کن تھی۔
"کیا اس گھر میں بسنے والوں کو ایک عورت کی ضرورت نہیں؟" وہ وہیں اٹکی تھی۔
"ہے' بالکل ہے' مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ عورت تم ہی ہو۔" منصور کو اس کی ہٹ دھرمی پہ غصہ آنے لگا۔
"کیوں؟ وہ عورت میں کیوں نہیں ہوسکتی' میں عمیر' حمزہ اور دعا کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس نے خفت سے سر جھکالیا۔
"میرے معصوم بچوں کو مہومت بناؤ' جب ان کی ماں ان کے بغیر جی سکتی ہے تو تم کیوں نہیں' اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے مجھے کہ ایک ہی جگہ سے دوسری بار ڈسوالوں' ایک بہن دھوکہ دے کر گئی' اب دوسری کو بھی موقع دوں' ایک بار گھر ٹوٹ کے جڑا' اسے پھر توڑ دوں؟"
وہ تلخی سے اونچا بول رہا تھا۔
"آپ کا گھر آپ کی بیوی اور میری بہن نے توڑا' جو تین بچوں کی ماں تھی' مگر جوڑا میں نے۔۔۔ آپ کو بکھیرا اس نے' جسے آپ نے پل پل محبت کا مان بخشا' مگر سمیٹا میں نے' بچوں کو جنم اس نے دیا' ممتا میں نے۔۔۔ ماں کہلوانے کا حق وہ رکھتی تھی مگر انہوں نے ماں پکارا مجھے' کیوں۔۔۔؟ اس سب کا جواب ہے آپ کے پاس۔۔۔؟"
منصور نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔
"یہ ہی کہیں گے کہ عنقریب شادی کرلوں گا' میں یقین نہیں کرتی' آپ کی عنقریب کبھی نہیں آئے گی' کیونکہ نہ تو پاپا' نہ ہی چاچو کی عنقریب کبھی آئی۔ آپ سب مرد اچھی طرح سے آگاہ ہیں کہ ایک عورت اپنے شوہر کی دوسری بیوی تو بن سکتی ہے اپنی سوکن کے بچوں کی ماں کبھی نہیں۔ وہ شوہر سنبھالے گی' بچے ہرگز نہیں۔ آپ جھوٹ بولتے ہیں' مجھ سے' خود سے۔
آپ کبھی شادی نہیں کریں گے۔ لیکن! اس حقیقت کو بھی تسلیم کرلیجیے کہ آپ تنہا تین بچوں کی پرورش نہیں کرپائیں گے' آپ نہیں جانتے حمزہ کو بوٹ کے تسمے بھی نہیں باندھنے آتے۔ عمیر کو سوتے میں ڈر لگتا ہے۔ وہ رات کو کئی بار اٹھ کے مجھے جگاتا ہے' یہ تسلی

کرنے کے لیے کہ میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی' دعا رو رہی ہو' میں اسے سینے سے لگا لوں' چپ کر جاتی ہے۔ کسی غلط فہمی میں مت رہیے گا' نہ آپ کی اور آپ کو میری قطعاً" ضرورت نہیں' مگر ان بچوں کو صرف ہم چاہییں۔" اس نے اپنے ہاتھ منصور کے آگے جوڑ دیے۔

"آئی ریکوئسٹ یو' آپ میرا کیریکٹر آپی سے کمپیئر نہ کریں' نہ ہی میرے ماضی کو کسی طور مدنظر رکھیں' ماضی سے انکار نہیں' یہ بھولتا کب ہے؟ ہمیشہ ستاتا رہتا ہے' جینا حال میں پڑتا ہے' میں نے بھی ذہنی طور پر آپ لوگوں کے ساتھ رہنے کے لیے خود کو تیار کر لیا ہے۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ صرف لمحہ بھر کے لیے ہم دونوں کو اپنے ذاتی فائدے اور خوشیوں سے ہٹ کر ان معصوم سوالوں کو پرکھنا ہے' ان آنکھوں کے آنسوؤں کو پونچھنا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھامنا ہے' تب ہمیں اپنی ذات اور اس سے وابستہ دکھ بہت چھوٹے اور بے سود لگیں گے۔ ہمارا درد صرف ہمارا ہے' مگر ہم نے کسی اپنے کو جان بوجھ کر درد نہیں دینا' کسی کی خود سے وابستہ امیدوں کو نہیں توڑنا۔ ان سے دوبارہ ماں چھیننے سے پہلے ایک بار ان سے بھی ضرور پوچھ لیجیے گا' پھر آپ جو فیصلہ کریں' مجھے منظور ہوگا۔"

وہ ہاتھوں میں چہرہ گرا کے رونے لگی۔

منصور کی آنکھوں میں بھی نمی تیر رہی تھی۔ وہ جذباتی' بے وقوف لڑکی بہت عقل مند نکلی تھی۔ وہ شوخ و چنچل' ٹراؤزر شرٹ پہنے' ٹیل پونی جھلانے والی خودغرض اور بے حس نہیں تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا وہ صرف ایموشنل بلیک میلنگ یا میلو ڈرامیٹک ڈائیلاگ ہرگز نہیں' ایک سچائی تھی' جس کا عملاً" ثبوت وہ گزرے کتنے ماہ سے دیتی آرہی تھی۔ وہ لفظ بہ لفظ سچ بول رہی تھی۔ صرف حمزہ اور عمیر ہی نہیں دعا بھی اسے ماما کہہ کر پکارتی تھی۔

شیر خوار معصوم بچوں میں قدرتی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ نرم ہاتھوں' محبت و شفقت سے لبریز لگاوٹ' نرم بانہوں کی پہچان رکھتے ہیں۔

منصور کیا کہہ سکتا تھا' سب کچھ تو اس نے کہہ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

منصور کو یہ سب کہہ دینے کے بعد اگلا سب سے مشکل اور تکلیف دہ مرحلہ ارسل کا سامنا کرنا تھا۔ پہلے اس نے سوچا وہ مر کر بھی ارسل کا سامنا نہیں کر سکتی۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس کے علم میں لائے بغیر منصور سے شادی کر لے' مگر اتنا وہ جانتی تھی کہ منصور ایسا کبھی نہیں چاہے گا' پھر ابھی منصور نے ہاں کب کی تھی؟

ارسل کیا کہے گا' اس کا ری ایکشن کیا ہوگا' وہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا' اسے غلط سمجھے گا؟ ان تمام سوالوں کو سوچتی تو اعصابی دباؤ بڑھنے لگتا۔ جب وہ قربانی دینے کا فیصلہ کر ہی چکی تھی تو پھر ہر مرحلے پہ سوچنا کیا؟

وہ ارسل کے اپارٹمنٹ آگئی بغیر فون کال کیے صبح [illegible] دروازہ ناصر نے ہی کھولا تھا۔

اس سے ارسل کا پوچھ کر وہ [illegible] میں ہی بیٹھ گئی۔ وہ پہلی دفعہ اس گھر میں اتنا تکلف اور اجنبیت محسوس کر رہی تھی۔ گھبراہٹ سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتا وہ اسے دیکھ دروازے میں ہی رک گیا۔

"نو کانٹ بیلیو اٹ یار' ناصر نے بتایا مجھے یقین ہی نہیں ہوا۔" نیند آلود آنکھوں میں بہت خوب صورت سی چمک آگئی تھی جو صرف اس کے لیے تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس کے پاس نیچے کارپٹ پہ بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہو؟" بہت دھیمے سے اس نے دریافت کیا۔

"ٹھیک نہیں' بہت خوش ہوں' یو نو تم پورے انیس دن تیرہ گھنٹے اور۔۔۔ اوں۔۔۔ تنتالیس منٹ اور تیئس سیکنڈ بعد میری آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اتری ہو۔"

کھڑے کھڑے گھٹنے پہ بازو جما کے اس نے رسٹ واچ سے اسے حساب لگا کر بتایا۔ اس نے حیرت سے اس کا حساب سنا۔

"تم کیلکولیٹ کرتے ہو۔"

"حساب دوریوں کا رکھا جاتا ہے' ملن کی گھڑیوں کو کون گنتا ہے۔"

"سر! ناشتا بناؤں۔" ناصر نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

"نہیں تم رہنے دو۔" اس نے منع کر دیا۔

"پھر تمہارا ناشتا کون بنائے گا؟" شاہم نے بھنویں اچکا کر پوچھا۔

"تم اور کون' جب بھی فون کروں' میں کچن میں تھی' حمزہ کے لیے فلاں چیز بنا رہی تھی' کبھی فلاں کے لیے' میں بھی تو ٹیسٹ کروں' کتنی بڑی شیف بن گئی ہو۔"

"اچھا تم ہاتھ منہ دھو لو' میں کچن میں جاتی ہوں۔" اسے ارسل کے سامنے بیٹھنا دشوار لگ رہا تھا۔ اس نے فریج کھولا۔ ناشتے کا سارا سامان موجود تھا۔ تھوڑا سا گوندھا ہوا آٹا' بریانی اور دہی بھی تھا۔ اس نے آٹا' دہی اور آملیٹ کے لیے انڈہ نکال لیا۔

پراٹھا ہلکی آنچ پہ تھا' وہ آملیٹ کا آمیزہ پھینٹ رہی تھی کہ وہ بھی آگیا۔

"واؤ۔۔۔ مائی گاڈ شاہی!" وہ خوشی سے چلایا۔ "سچ اے گریٹ ایفی شینسی یار' میں یہ پہلی اعتراف کرتا ہوں تمہارے سگھڑاپے کا' روٹی بنانی بھی سیکھ لی۔" ارسل اسے دیکھ کر اتنا خوش تھا کہ اس کی خاموشی کو نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ خود ہی چیزیں ٹیبل تک منتقل کرنے لگا۔

"جہاں اتنا کیا ہے وہاں تھوڑی سی زحمت اور۔" اس نے انگوٹھے اور انگلی سے تھوڑا سا فاصلہ پیدا کیا۔

"کیا کروں؟" اس نے آملیٹ اس کے آگے رکھا۔

"چائے اور ایپل شیک بھی بنا دو پلیز۔"

وہ فریج کی طرف پلٹ گئی۔ وہ کرسی کا رخ تھوڑا سا شاہم کی طرف موڑ کر بیٹھا تھا۔

"تم ناشتا نہیں کر رہے؟" قہوہ بناتے وہ ذرا مڑی۔

"تمہاری موجودگی میں' میں اکیلا کھاؤں گا امپاسبل' محنت تم نے کی ہے' ہڑپ میں کر جاؤں؟" اس نے توجہ دی۔

"نہیں میں ناشتہ کر کے آئی تھی ارسل!"

وہ چند لمحے اسے تکتا رہا' پھر بے دلی سے لقمہ توڑا۔

"کیا ڈسکس کرنے آئی ہو؟" بلینڈر میں دودھ ڈالتے ہاتھ تھم گئے۔ وہ اس کی خاموشی کی وجہ جان گیا تھا۔

"میں شادی کر رہی ہوں۔"

بلینڈر کی تیز آواز میں وہ اتنا اونچا ضرور بولی تھی کہ اس نے سن لیا تھا۔ اس کا نوالہ منہ کی طرف لے جاتا ہاتھ وہیں رک گیا۔

وہ شاہم کی رگ رگ سے واقف تھا' اس کی ان کہی کے بہت سے پوشیدہ باتوں کا امین' وہ جگ میں سے شیک گلاس میں انڈیل رہی تھی کہ اس نے کلائی پکڑ لی۔

"کس سے شادی کرو گی؟" اس کا لہجہ برفیلا ہو گیا تھا۔

شاہم کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔ جس حقیقت کے لیے وہ اتنی ہمت مجتمع کر رہی تھی۔ وہ پل بھر میں اس تک پہنچ گیا تھا۔

جگ اس کے ہاتھ سے لے کر ٹیبل پہ دھر کے اس کی کلائی چھوڑ کے وہ کھڑا ہو گیا۔

"م۔۔۔ منص۔۔۔ منصور سے۔" اتھل پتھل سانسوں کے بیچ اس نے نام لیا۔ اس نے کبھی زندگی میں اس وقت کا تصور نہیں کیا تھا۔

ارسل نے غیر ارادی طور پر ہاتھ اٹھایا اور پوری طاقت سے شاہم کے گال پہ مار دیا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ بہت برداشت کے باوجود آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

"اب بولو' کس سے شادی کرو گی؟" دھیمے لہجے میں اژدھے کی پھنکار تھی۔

"منصور سے۔" ذرا بھی گھبرائے بغیر وہ بولی۔

"منصور سے۔۔۔؟"

اس نے شیک سے بھرے جگ کو غصے سے ہاتھ مارا۔ گلاس، پراٹھے کی پلیٹ سب دور جا گرے۔ گلاس اور جگ چکنا چور ہو گئے۔

"پلیز ارسل۔۔۔ مم۔۔۔ میں یہ سب اپنی خوشی سے نہیں کر رہی، مجھے منصور میں اور انہیں مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں، ہم دونوں کی صرف عمر میں ہی نہیں سوچ اور رشتے میں بھی بہت فرق ہے۔ میں نے اپنے مفاد اور خوشیوں سے ہٹ کر سوچا ہے۔ میں اپنے اس فعل اور بدلتی سوچ پر تم سے یا منصور سے شرمندہ نہیں ہوں میں صرف بچوں۔۔۔"

"میں نے تمہارے اس فیصلے کی تم سے وضاحت نہیں مانگی، کیونکہ تم لاکھ وضاحت دو، ایک بھی مجھے مطمئن نہیں کرے گی۔ میرے وجود کے ریزے نہیں سمیٹے گی، کبھی نہیں۔"

اس نے آنکھیں میچ لیں۔ اس کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے جذبات اور اندر بالکل سنسان ہو گئے تھے، اسے اپنے وجود کا سارا وزن ہاتھوں کے ذریعے میز پر منتقل کرنا پڑا۔ کرسی کا سہارا لیے وہ بڑی دقتوں سے کھڑا تھا۔

"کب کر رہی ہو؟"

شادی کا لفظ ادا کرنا آسان نہیں تھا۔

"تم ایسا کیسے کر سکتی ہو؟" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"بہت جلد۔" وہ رو رہی تھی۔

کیونکہ وہ صرف اس کے سامنے رو سکتی تھی، یہ دنیا کا واحد شخص تھا جس کے سامنے رو کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی تھی۔ وہ اپنی سگی بہن کے سامنے بھی نہیں روئی تھی۔ وہ جب بھی اداس یا تنہا ہوتی۔ اس کا کندھا تلاش کرتی۔ وہ بچھڑ رہی تھی، یہ ہی رونا اسے آ رہا تھا۔ وہ بغیر نادم ہوئے یا جھجکے اس کے پاس کھڑی سر جھکائے روتی جا رہی تھی۔ یہ آنسو ہمیشہ اس نے ہی صاف کیے تھے، جو ضبط کی آخری حدوں پہ کھڑا تھا۔ وہ اپنے۔ آنسو روک نہیں پایا تھا۔ ابھی بھی اس نے ہی آنسو پونچھنے تھے۔ اس نے کف سے اپنے آنسو صاف کیے۔ گلے میں اٹکے آنسوؤں کو حلق سے اتارا۔

"اب۔۔۔ اب رو رہی کیوں ہو؟" کتنا احمقانہ سوال تھا۔

"میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔ تم۔۔۔ تم کو بھولوں گی کیسے؟"

یہ بھی اسے بتانا تھا، کیونکہ وہ اپنے ہر مسئلے کا حل اسی سے پوچھا کرتی تھی۔

"میں تمہیں خود کو بھولنے ہی نہیں دوں گا۔" اس کی مضبوط دعوے دار سرگوشی ابھری۔

اس نے شاہم کا چہرہ اوپر کر کے آخری بار اس کے آنسو پونچھے۔

"جاؤ شاہی! جتنی جلدی ہو سکے چلی جاؤ۔ یہ نہ ہو کہ میں تمہیں روک لوں اور کبھی نہ جانے دوں۔" اس نے شاہم کے چہرے سے نگاہیں چرائیں۔

"بہت سی محبتوں کے قرض ہیں مجھ پہ، ان قرضوں کے بوجھ تلے دب گئی ہوں۔" ارسل کی ویرانی اس کا دل چیر رہی تھی۔ وہ اسے دلاسا دینا چاہتی تھی جو کسی بھی طرح بسنے والا نہیں تھا۔ وہ وہ نہیں رہا تھا جو بھی رو رہا ۔۔۔ مبہم ہو رہا تھا۔

"میں جا رہی ہوں۔" اس نے آخری ہچکی لی۔

"ہاں۔۔۔ جاؤ۔" اس کی آنکھیں ساکت تھیں۔ وہ آخری بار بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔

"unfor give able blunder۔" (ناقابل تلافی نقصان)

اس نے اپنے پیچھے اس کی بڑبڑاہٹ سنی، وہ نفی میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔ آٹومیٹک لاک دروازے کو زور سے بند کرنے پہ اس کا سکتہ ٹوٹا۔

وہ مدہوش سا ٹیبل کی دوسری طرف جہاں گلاس اور جگ کی کرچیاں تھیں، زمین پہ بیٹھ گیا۔

"جب تمہاری ماں کو تم پہ اپنی مرضی مسلط کرنے کا کوئی حق نہیں تو تمہیں بھی کوئی حق نہیں کہ تم شاہی کو روکتے۔"

اس کے اندر سے آواز آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کانوں تک تپش سے تپ رہا تھا۔ اس نے شیشے کی بڑی سی کرچی دائیں ہاتھ میں پکڑلی۔ جس سے شاہم کو کھینچ کر

مارا تھا۔

"مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ اسے مارتا۔" اس نے مٹھی زور سے بند کرلی۔

"unfor give able blunder (ناقابل تلافی نقصان) شاہی نہیں۔"

اس کی ہتھیلی سے خون انگلیوں سے بہہ کر نیچے گر رہا تھا اور وہ اور مضبوطی سے مٹھی جکڑے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ (کرم وجہہ اللہ) کا فرمان پاک ہے۔

"جو تمہیں دکھ دے اسے چھوڑ دو، مگر جسے چھوڑ دو اسے دکھ نہ دو۔"

رات کے تین بجے کا وقت تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کے بلب کی غیر واضح سی روشنی اور سرد سی خاموشی تھی۔ ساری کائنات ہُو کے عالم میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی۔ رات کے اس پہر جب فرشتے بھی سو جاتے ہوں۔ وہ گم صم شعور سے بے گانہ جاگنے کی تیسری رات بتا رہا تھا۔ نیند بہت بے کلی سی اس کی کھوئی آنکھوں کو بند کرنے کے لیے کروٹیں بدل رہی تھی مگر اس کے تمام کنکشن وجود کا نیند سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔

اس کے کیے گئے پختہ ارادے، سجائے گئے خواب، اس عمل کا دکھ اس کے اندر بیٹھن ڈال رہے تھے۔ متضاد اور منتشر سوچوں کی آماجگاہ بوجھل اور بھاری سر اس نے بمشکل اٹھایا۔ خالی خالی آنکھوں سے خود اپنے ہاتھوں سے اجاڑے ہوئے کمرے کا حلیہ اجنبیت سے دیکھا۔ بیڈ کی چادر دوہری تہری ہو کر آدھی کارپٹ پہ رل رہی تھی۔ بیڈ اور نیچے کارپٹ پہ بے بسی اور مایوسی سے پھاڑے گئے تکیوں کی روئی مدھم روشنی میں برف باری کے نرم گداز گولوں کے رقص کرنے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پہ دھری پرفیومز، کٹ، اسپرے، کلون، ہیر برش، لوشن وغیرہ کی سب بوتلیں

زمین پر زور سے پٹخنے سے ٹوٹ چکی تھیں یا یوں ہی ادھر ادھر لڑھک گئی تھیں۔ ٹشو پیپر کے بے دردی سے نوچے گئے ڈبے صوفے اور فلور کشن پر سفیدی جمائے ہوئے تھے۔ اس نے ان دنوں میں بے تحاشا اسموکنگ کی تھی۔ حالانکہ وہ سگریٹ پینے کا عادی نہیں تھا۔ ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر گیا تھا۔ گلاس ٹیبل جا بجا راکھ سے اٹا تھا۔

کمرے کا جائزہ لے کر اس نے سر کو دائیں سے بائیں جھٹکا، اپنے پژمردہ اور تھکن سے بھرے وجود میں بہت سی ہمت مجتمع کرتا، وہ اپنے گھٹنے پر ہاتھ کا بوجھ ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ تین دن بیٹھے رہنے کی وجہ سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ملگجی روشنی میں بکھری چیزوں کو مزید قدموں تلے روندتا وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کافی دیر بے یقینی سے آئینے میں اپنے عکس کو تکتا رہا، پھر بلا ارادہ ہی وہ اپنی دونوں کھلی ہتھیلیوں سے گالوں کو رگڑنے لگا۔ غیر محسوس انداز میں وہ کسی ذہنی مریض کی طرح یہ عمل بار بار دہرا رہا تھا۔ جیسے اسے کسی اور چہرے کا گمان ہو۔ ایسا کرتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ کے زخم کا بھی احساس نہیں تھا۔ جس پہ اس نے بینڈیج کی ہوئی تھی۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں چکنی سی ہو گئیں، اس نے چہرے کو آئینے کے مزید قریب لے جا کر غور سے دیکھا، بھاری گھنیرے بال خاصے الجھے تھے۔ اس کا ہلکا سانولا رنگ سیاہی مائل لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے رت جگے اور زیادہ اسموکنگ کی وجہ سے سوجے ہوئے تھے، آنکھیں بے تحاشا سرخ اور ہونٹ سیاہ ہو چکے تھے۔ اس کے جسم پر تین دن کے کپڑے چڑھے تھے۔

باقی آئندہ شمارے میں

تم سنگ مہکے ہیں راستے

مکمل ناول

چیخ کی زوردار آواز پر برتن دھوتی کشف کے ہاتھ سے گلاس چھوٹا تھا اور زمین پر گرتے ہی کرچیوں میں بدل گیا۔ کشف نے ایک نظر ٹوٹے ہوئے گلاس کو دیکھا لیکن پھر اسے نظر انداز کر کے کمرے کی طرف دوڑی۔ کمرے کا منظر اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ تہذیب بیڈ پر چڑھی پریشان نظروں سے نیچے دیکھ رہی تھی۔ ابھی کشف اس سے پوچھنے ہی لگی تھی کہ زبیدہ بیگم ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔

"کیا ہوا کون چیخا تھا۔" انھوں نے پریشانی سے پہلے کشف اور پھر تہذیب کو دیکھا۔ کشف نے انگلی سے بیڈ پر کھڑی تہذیب کی طرف اشارہ کیا تو زبیدہ بیگم کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر تک گئیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔

"وہ امی! میں جھاڑو دینے لگی تھی وہ کاکروچ آ گیا۔" اس نے معصومیت سے اپنے چیخنے کی وجہ بیان کی لیکن اس کی بات پر زبیدہ بیگم کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

"تہذیب، تہذیب! میں تمہارا کیا کروں کب تمہیں عقل آئے گی؟ کوئی کیڑا نکل آئے تو تم چیخنا شروع کر دیتی ہو۔ چھپکلی دیکھ کر تمہاری آدھی جان نکل جاتی ہے۔ کیا بنے گا تمہارا پتا نہیں کیا سوچ کر تمہارے باپ نے تمہارا نام تہذیب رکھا ہے۔ تمیز اور تہذیب تو تمہیں چھو کر نہیں گزرے۔"

زبیدہ بیگم نے غصے سے اس کے لٹکے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ کشف نے اس کی لٹکی شکل دیکھ بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی اس کو ہنسی ضبط کرنے کے چکر میں دیکھ کر تہذیب کی ہنسی نکل گئی تھی۔

"اب ہنستے ہی رہنا تمہیں تو اور کوئی کام ہی نہیں یا چیخ لو یا ہنس لو۔ میں تو پتا نہیں کن پاگلوں میں پھنس گئی ہوں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

کشف نے افسوس سے سر ہلایا۔ "امی صحیح کہتی ہیں تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔ کوئی کہہ سکتا ہے تم شہر کے بہترین اسکول میں پڑھاتی ہو مجھے تو کبھی کبھی لگتا ہے تم بچوں کو کم وہ تمہیں زیادہ ڈانٹتے ہوں گے۔" کشف کے مذاق اڑانے والے انداز پر اس نے غصے سے اسے دیکھا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"ہاں نظر آتا ہے۔" کشف نے جھاڑو اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا نظر آتا ہے؟" تہذیب نے جھاڑو اس کے ہاتھ سے لے لی تھی۔

"یہی ان کا پیار جو کبھی ربڑ کی چھپکلی کی صورت میں تمہارے پرس میں رکھا ملتا ہے۔"

کشف کی بات پر تہذیب نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں "وہ تو بس ایسے ہی اور تم ہر وقت میرے پیچھے نہ پڑی رہا کرو۔"

اس کے مڑتے ہی کشف چیخی تھی "کاکروچ" اور تہذیب چیخ مار کر اچھلی تھی اور کشف کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"کہاں ہے؟" تہذیب نے گھبرا کر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"پتا نہیں۔" کشف نے کہہ کر دروازے کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

"کشف کی بچی!" اس کی بات سمجھ میں آتے ہی وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آج لگتا ہے دشمنوں کے مزاج معمول پر نہیں۔" عمران نے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کشف سے کہا۔ اس نے مسکرا کر عمران کو دیکھا۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی ابھی لیکن آپ کی بہن صاحبہ نے تو سلام کا جواب دینا گوارا نہیں کیا اس لیے سیدھا یہیں آ رہا ہوں۔" عمران نے ٹوکری سے سیب اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اسے آج [illegible] ہے۔ امی نے اس کو ڈانٹ [illegible] اب وہ آج کسی سے بات نہیں کرے گی۔"

"اچھا تو اس لیے موڈ آف ہے۔" عمران نے سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن میں اسے بولنے پر مجبور کر دوں گا۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔" کشف نے اسے دیکھ کر چیلنج کیا اور چولہا بند کر کے عمران کے پیچھے آ گئی۔

تہذیب نے ایک نظر ان دونوں کو اندر آتے دیکھا اور دوبارہ اپنا دھیان ٹی وی کی طرف مرکوز کر دیا۔

"تہذیب ابو تمہیں یاد کر رہے تھے۔" عمران نے اسے ٹی وی میں مگن دیکھ کر کہا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"اچھا کشف! چلتا ہوں اور ابو سے جا کر کہوں گا میں آپ کا پیغام آپ کی چہیتی کو دے آیا تھا لیکن اس نے کہا۔ "میں کیا کروں۔""

عمران کے سنجیدگی سے کہنے پر وہ ایک دم بھڑک اٹھی تھی۔

"ابا! آپ بڑے جھوٹے ہو تم میں نے ایسا کب کہا" اس کے گھورنے پر عمران نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو روکا تھا۔

"ظاہری بات ہے تم جواب نہیں دو گی تو اس کا یہی مطلب نکلتا ہے۔" عمران نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم ہر جگہ اپنی عقل سے کام نہ لیا کرو۔" تہذیب نے جل کر جواب دیا تھا۔

"پھر ابو کو کیا جواب دوں؟"

"تمہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ان سے بات کر لوں گی۔"

تہذیب نے اسے دیکھے بغیر کہا تھا لفٹ نہ کروانے پر وہ کشف کی طرف آ گیا تھا۔

"دیکھے تمہاری بہن کو الو بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔"

"بڑھنے پھیلنے کی ضرورت نہیں ابھی اس نے سن لیا تو تمہیں باہر نکال دے گی۔" تہذیب نے گھور کر ان دونوں کو دیکھا۔

"تم دونوں کیا سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہو؟"

"یہ تمہاری بہن تمہاری برائیاں کر رہی تھی۔"

عمران نے سارا الزام کشف پر رکھ دیا تو وہ تڑپ کر بولی۔

"ہائے! کتنے بڑے جھوٹے ہو تہذیب! یہ تمہیں الو بنا رہا ہے۔" تہذیب کی گھوری پر وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

"جھوٹ میں تو کہہ رہا تھا تہذیب آج بہت تہذیب یافتہ لگ رہی ہے لیکن ..." وہ کشن اٹھا چکی تھی ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا اس نے سارے کشن اٹھا اٹھا کر اسے مارنے شروع کر دیے کچھ اسے لگ رہے تھے جبکہ کچھ کو وہ آسانی سے کیچ کر رہا تھا اور ہنستا جا رہا تھا اور اس کی ہنسی تہذیب کے لیے جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ اس نے نظریں گھما کر کسی زبردست چیز کی تلاش شروع کی "تہذیب جوتی" اس نے پیچھے کشف کی آواز سنی۔ تہذیب نے جلدی سے جھک کر اپنے پاؤں سے جوتی نکالی ابھی وہ سامنے کھڑے عمران پر پھینکنے والی تھی تبھی دائیں طرف کا دروازہ کھول کر زبیدہ باہر آئیں۔ انہوں نے حیرت سے سامنے کا منظر دیکھا، جہاں عمران دروازے کے ساتھ کھڑا تھا تہذیب کے ہاتھ میں جوتی تھی جبکہ کشف پیچھے کھڑی عمران کو اشارے کر رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ تینوں اس طرف متوجہ ہوئے تھے۔ کشف کی ہنسی رک گئی تھی۔ تہذیب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا جبکہ عمران کے حوصلے اور بلند ہو گئے تھے۔

"اچھا ہوا تائی جان! آپ آ گئیں یہ دیکھ رہی ہیں میری کتنی عزت ہو رہی ہے، جوتے مار کر گھر سے نکال رہی ہے۔" زبیدہ بیگم کے قریب جا کر اس نے مظلوم شکل بنا کر کہا۔

"جھوٹ بولتا ہے، جھوٹا سارے جہاں کا۔" تہذیب نے چیخ کر جوتے والا ہاتھ بلند کیا۔

"تہذیب کیا بدتمیزی ہے۔ جوتا نیچے رکھو۔" اس نے گھبرا کر جوتا نیچے رکھا تھا "یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا کوئی تمیز باقی رہ گئی ہے یا نہیں بڑا ہے وہ تم سے۔"

"ایک سال۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی "تو کیا ایک سال بڑا نہیں ہوتا جاؤ مانی کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔"

تہذیب نے کھا جانے والی نظروں سے عمران کو

دیکھا جس کے دانت ہی اندر نہیں جا رہے تھے۔
"دانت تو ایسے نکال رہا ہے جیسے بہت خوب صورت ہوں۔ امی نہ آتیں تو آج اس کے سارے دانت میرے ہاتھ سے ہی ٹوٹنے تھے۔" اس نے چائے کا پانی رکھتے ہوئے کہا۔
"تمہیں تو میں ایسی چائے پلواتی ہوں ساری عمر یاد رکھو گے۔" تہذیب نے چینی کی جگہ ڈھیر سارا نمک پانی میں ڈالا چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر اس نے چہرے کو سنجیدہ کیا اور باہر نکل آئی۔
چائے کا کپ عمران کو پکڑا کر وہ کشف کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ عمران نے کپ اٹھاتے ہوئے مسکرا کر اس کے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھا لیکن چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی اس کا منہ کا زاویہ ایک دم بگڑا تھا۔ اب اس کی حالت ایسی تھی کہ نہ تو وہ اگل سکتا تھا اور نہ ہی نگل سکتا تھا۔ اس نے گھبرا کر تہذیب کو دیکھا جو بڑی دلچسپی سے اس کی حالت دیکھ رہی تھی۔ عمران ایک دم اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا تھا زبیدہ بیگم نے گھبرا کر اسے پکارا۔
"عمران!" کشف بھی حیرانی سے اٹھی۔ جبکہ تہذیب اطمینان سے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی۔ تب ہی عمران دوبارہ اندر آیا تھا۔
"کیا ہوا بیٹا! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" زبیدہ نے پریشانی سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا۔
"اچھا تائی جان چلتا ہوں۔"
"بیٹا! چائے۔"
"نہیں تائی جان مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے، پھر آؤں گا۔" وہ جلدی جلدی کہہ کر نکل گیا۔ مبادا اسے چائے نہ پینی پڑ جائے۔
"کمال ہے۔ ابھی تو چائے کا کہہ رہا تھا اور اب پی بھی نہیں۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئیں اور سامنے رکھا کپ اٹھا لیا۔
تہذیب نے گھبرا کر انہیں دیکھا "امی! یہ مجھے دے دیں۔" اس نے جلدی سے کپ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے تہذیب!" انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔
"امی! یہ چائے ٹھیک نہیں۔"
"کیا ہے اسے؟" انہوں نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔
"وہ... اس میں نمک ہے۔" اس کے کہنے پر انہیں بے ساختہ عمران کی حالت یاد آئی کشف کی ہنسی نکل گئی جبکہ انہوں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسٹارٹ لیتیں اس نے کمرے سے نکلنے میں ہی عافیت سمجھی۔

☆ ☆ ☆

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا اس لڑکی کا کیا کروں، ایک کشف ہے مجال ہے کبھی اس نے مجھے تنگ کیا ہو، سارا گھر سنبھال رکھا ہے۔ اتنی سلجھی ہوئی ہے کہ اپنے کیا غیر بھی تعریف کرتے ہیں لیکن تہذیب اسے سوائے شور مچانے اور [illegible]
"[illegible] اب کیا کر دیا اس نے؟"
"آج مانی آیا تھا جب وہ آئے آپ کی لاڈلی نے ضرور اس سے بدتمیزی کرنی ہوتی ہے۔ آج بھی اتنے دن بعد آیا تھا بیچارہ ہولے کر گھڑی ہوئی پھر چائے میں ڈھیر سا نمک ملا کر اسے پلا دیا۔ وہ بیچارہ چپ کر کے چلا گیا۔ اتنا مانتی ہوں لیکن مجال ہے اسے اثر ہو آپ نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔"
زبیدہ بیگم کی بات پر وہ ہنسی نہیں روک سکے۔ ان کی ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔
"ہاں ہاں ہنس لیں آپ کو اور آپ کی بیٹی کو اور کام ہی کیا ہے۔"
"بھئی بیگم بچے ہیں اگر ایک دوسرے سے مذاق کر لیتے ہیں تو حرج ہی کیا ہے۔"
"حرج ہے اصغر! کل کو تہذیب کو اسی گھر جانا ہے۔ اب تو مانی اس کی ہر بات ہنس کر برداشت کر جاتا ہے کل کو رشتہ بدلے گا تو یہی باتیں مصیبت بن جائیں گی

کل بھی شوہر یہ برداشت نہیں کرتا اس کی بیوی اس سے بدتمیزی کرے۔ اتنی بے تکلفی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ سعدیہ کے مزاج کو تو آپ جانتے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی تہذیب کو پسند نہیں کرتی صرف مانی کی وجہ سے برداشت کر رہی ہے۔" انہوں نے عمران کی ماں کا حوالہ دیا۔
زبیدہ بیگم کی بات پر اصغر صاحب چپ سے ہو گئے زبیدہ بیگم نے غور سے ان کی سنجیدہ شکل دیکھی۔
"دیکھو زبیدہ! میں تہذیب کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ اس میں ابھی بچپنا ہے لیکن سمجھ دار ہے وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سنبھل جائے گی۔"
"آپ بھی کمال کرتے ہیں اصغر جو بیس سال کی ہو چکی ہے آپا کا فون آیا تھا۔ وہ کشف کی رخصتی کروانا چاہتی ہیں اور میں کشف کے ساتھ تہذیب کا بھی سوچ رہی تھی لیکن اب بہت مشکل لگتا ہے۔ تھوڑی سی [illegible] ضروری ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا شروع کر [illegible] لوگ اتنا نخرہ برداشت نہیں کرتے۔" پریشانی [illegible] لہجے سے عیاں ہو رہی تھی۔
"زبیدہ! تم خواہ مخواہ فکر کر رہی ہو۔ سعدیہ بھابی اور [illegible] بھائی کوئی غیر نہیں اس کے سگے چچا چچی ہیں۔ وہ [illegible] سے اس کی عادت سے واقف ہیں۔ ہاں اچھا بچہ [illegible] بچپن کا ان کا ساتھ ہے۔ وہ سمجھتا ہے تہذیب کو [illegible] سب ٹھیک ہوگا اور جہاں تک تہذیب کی [illegible] اس کی شادی کے بارے میں ابھی رہنے دو۔ [illegible] صرف کشف کے بارے میں سوچو۔"
"آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے تہذیب سے پیار نہیں ہے۔ بہت ہے لیکن میں اس کی حرکتوں سے ڈرتی ہوں۔ بچپنا ماں باپ کی دہلیز تک ہی اچھا لگتا ہے۔ [illegible] چاہے کوئی بھی ہو چچا چچی کوئی برداشت نہیں [illegible]۔" ان کے افسردہ لہجے پر اصغر صاحب مسکرا [illegible]
"اچھا بابا ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو میں اسے سمجھا دوں [illegible] ابھی سمجھا دیتا ہوں۔"
"تہذیب!" انہوں نے اونچی آواز میں تہذیب کو پکارا۔
"جی ابو" کچھ دیر بعد وہ ان کے سامنے تھی۔
"تمہاری امی شکایت کر رہی ہیں۔"
"یہ کونسی نئی بات ہے۔" ان کے کہنے پر وہ لاپروائی سے بولی تو زبیدہ نے غصے سے اسے گھورا۔
"بیٹا! آپ نے مانی کی چائے میں نمک کیوں ملایا؟"
"ابو وہ ہے ہی اس قابل امی کے سامنے معصوم بن جاتا ہے۔ میں تو اسے اور مزا چکھاتی وہ تو..."
"دیکھا آپ نے، کیسے زبان چل رہی ہے۔" زبیدہ بیگم کا پارہ پھر چڑھ گیا تھا۔
"بری بات بیٹا ایسے نہیں کرتے وہ بڑا ہے تم سے۔ آئندہ اس کی چائے میں نمک مت ملانا۔" اصغر صاحب نے اپنی مسکراہٹ روک کر سنجیدگی سے کہا تھا۔
"تو پھر کیا ملاؤں ابو؟" اس نے ان کے قریب جا کر قدرے رازداری سے پوچھا۔ اصغر صاحب بھی کوئی ایسا ہی جواب دینا چاہتے تھے لیکن ان کی نظر زبیدہ بیگم کے غصیلے چہرے پر پڑ گئی۔
"میں ہی پاگل ہوں جو آپ سے بات کی۔ آپ دونوں باپ بیٹی کبھی نہیں سدھر سکتے۔" وہ پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئیں تو تہذیب باپ کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

☆ ☆ ☆

"آنٹی! مزا آگیا آج۔ اتنے دن بعد گھر کا کھانا کھایا ہے۔" حسن نے چکن کڑاہی سے اچھی طرح انصاف کرنے کے بعد قمر بیگم کو دیکھا تو وہ مسکرا دیں۔
"تم سے کتنی دفعہ کہا ہے جب تک فائزہ کراچی سے واپس نہیں آجاتی۔ تم یہاں آجایا کرو لیکن تم پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔"
"کیا کروں آنٹی! آپ کے بیٹے کے ساتھ رہ رہ کر میرے احساسات بھی ختم ہیں۔" حسن نے شرارتی انداز میں دائیں طرف بیٹھے داؤد کو دیکھ کر کہا جو پورے انہماک سے کھانے میں مصروف تھا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں بھائی تھوڑے سنجیدہ ضرور ہیں لیکن خشک مزاج نہیں۔" دانیال نے جلدی سے اپنے بھائی کی طرف داری کی تھی۔

"تھوڑے؟" حسن نے حیرت سے پوری آنکھیں کھولیں "یار کم از کم جھوٹ تو وہ بولو کہ جو دوسرے بندے کو ہضم ہو جائے۔ تمہارے بھائی صاحب سنجیدہ ہی نہیں بالکل، بے انتہا سنجیدہ ہیں۔ لطیف جذبات تو انہیں چھو کر بھی نہیں گزرے۔" اب کے داؤد نے نظر اٹھا کر غصے سے اسے دیکھا لیکن وہ اس کے غصے کو کسی خاطر میں نہیں لایا تھا۔

"اب ہر کوئی آپ کی طرح رنگین مزاج تو نہیں ہو سکتا۔" داؤد نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے اس کی عاشق مزاجی پر بھرپور طنز کیا تھا لیکن مقابل بھی چکنا گھڑا تھا۔

"تو رنگین مزاج ہونا بری بات تو نہیں۔ اللہ نے آنکھیں دی ہیں جذبات دیے ہیں ان کا کچھ تو استعمال ہونا چاہیے" داؤد نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"ایسا استعمال جیسا آپ کرتے ہیں؟"

"میں کیا کرتا ہوں۔" وہ انجان بن کر داؤد کو دیکھنے لگا۔

"میرا منہ نہ کھلواؤ۔" داؤد کہہ کر کھڑا ہو گیا تھا اس کے اٹھتے ہی حسن اور دانیال بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا جبکہ حسن اب دانیال کے ساتھ بحث میں مصروف تھا۔ قمر بیگم ٹرالی لے کر اندر داخل ہوئیں "آنٹی آپ اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں شاید موصوف کو کوئی افاقہ ہی ہو جائے۔" قمر بیگم کے بیٹھتے ہی حسن ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

داؤد نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"آنٹی! پتا ہے مجھے کیا لگتا ہے کسی لڑکی کا چکر ہے یا تو وہ شادی کے لیے مان نہیں رہی یا کسی لڑکی کی بے وفائی کا غم دل سے لگا بیٹھا ہے۔" حسن کی بکواس پر قمر بیگم نے جن نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ داؤد کا دل چاہا! اپنا گیارہ نمبر جوتا اتار کر اس کے سر پر دس لگائے

اور ایک گنے "داؤد! اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو مجھے بتاؤ۔ میرے لیے سب سے اہم یہ بات ہے تمہارا گھر آباد ہو اور اگر لڑکی تمہاری پسند کی ہو تو وہ اور بھی اچھا ہے۔"

"مما! ایسی کوئی بات نہیں۔" اب کے وہ اکتا کر بولا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟"

وہ ہنس پڑا تھا۔

"میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔"

"کون آنٹی؟" داؤد سے زیادہ حسن نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"میجر حامد ہیں B کالونی میں ان کی بیٹی ڈاکٹر ہے۔ بہت سلجھی ہوئی بچی ہے اسے دیکھا تو مجھے خیال آیا وہ داؤد کے ساتھ جچے گی۔"

حسن نے ابرو اچکا کر دانیال کو دیکھا جو پہلے ہی مسکرا رہا تھا جبکہ داؤد کا سارا دھیان ماں کی طرف تھا۔

"داؤد پھر میں ان سے بات کروں؟"

"آپ کو ٹھیک لگتا ہے تو ضرور کریں بس ایک بات لڑکی میں میچورٹی ہونی چاہیے مجھے رونے دھونے والی خاص طور پر جن میں بچپنا ہو وہ لڑکیاں بالکل پسند نہیں۔"

"ٹھیک ہے میں مسز حامد سے بات کرتی ہوں لیکن پھر بھی پہلے تم اس لڑکی سے مل لو۔ اس کے بعد فائنل کرتے ہیں۔"

اس نے گہرا سانس لے کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

☆ ☆ ☆

جب وہ گھر داخل ہوا تو کافی تھکا ہوا تھا۔ اس کا ارادہ باتھ لے کر سونے کا تھا لیکن لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اسے عجیب سا احساس ہوا تھا اس سے پہلے وہ پوری طرح سمجھتا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر قمر بیگم لاؤنج میں داخل ہوئیں اور اسے وہاں دیکھ کر حیران بھی۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی ابھی" کہنے کے ساتھ اس نے ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔

"کوئی آیا ہوا ہے؟" اس نے اب نظریں قمر بیگم کے چہرے پر ٹکا دیں۔

"ہاں میں نے تمہیں میجر حامد کی بیٹی کے بارے میں بتایا تھا نا۔ ان کی فیملی کو انوائٹ کیا ہے۔" داؤد کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

"داؤد! انہیں میں نے بلایا ہے تم سے ملنے کے لیے" وہ جو انکار کا سوچ رہا تھا ان کی بات سن کر چپ کا چپ رہ گیا۔

"میں چینج کر کے آتا ہوں۔" اس نے اپنے یونیفارم کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا سب باتوں میں مصروف تھے اس کے باآواز بلند سلام کرنے پر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک آدمی جو گورے سانولے رنگ کا تھا اس نے اٹھ کر داؤد سے مصافحہ کیا اور میجر حامد کے نام سے اپنا تعارف کروایا۔

اس آدمی کے علاوہ وہاں ایک عورت جو یقیناً مسز حامد تھیں اور دو عدد لڑکیاں بھی تھیں وہ کچھ دیر رسمیتی کے طور پر میجر صاحب سے بات کرتا رہا پھر ایکسکیوز کر کے کھڑا ہو گیا۔ اب سونے کا تو موقع نہیں رہا تھا تو وہ کچن میں آ گیا۔ اس کا ارادہ کافی پینے کا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ قمر بیگم اندر داخل ہوئیں۔

"داؤد ذرا بات سننا۔" وہ بڑے نارمل انداز میں باہر گیا تھا لیکن صوفے کے قریب کھڑی اس لڑکی کو دیکھ کر وہیں رک گیا۔

"داؤد! یہ نورین ہے اور نورین یہ داؤد ہے میرا بیٹا تم دونوں باتیں کرو اور جو پوچھنا اور جاننا ہے ایک دوسرے کے بارے میں پوچھ لو۔" وہ مسکرا کر دونوں کو دیکھ کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔

داؤد کا ارادہ کسی بھی قسم کے انٹرویو لینے کا نہیں تھا لیکن اپنی ماں کی بات کو رد کر کے ان کی بے عزتی بھی نہیں کروا سکتا تھا۔

"آپ بیٹھیں۔" اسے بیٹھنے کا کہہ کر وہ خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا پوچھے جب وہ خود بول پڑی۔

"آنٹی بتا رہی تھیں آپ نے CSS کر رکھا ہے۔" داؤد نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"جی!"

"اس کے بعد آپ نے پولیس فورس جوائن کی؟"

اب بھی اس نے "جی" کی صورت میں مختصر جواب دیا۔ انٹرویو اسے لینا چاہیے تھا اور لے وہ رہی تھی چند منٹوں میں ہی داؤد کو اندازہ ہو گیا لڑکی کافی کانفیڈنٹ ہے۔

"کچھ دن پہلے میں نے اخبار میں آپ کے بارے میں پڑھا تھا آپ نے اسمگلر کے بہت بڑے گروہ کو پکڑا تھا۔ میں آپ سے بہت امپریس ہوئی تھی میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کبھی یوں میں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں گی میں آپ کو بتا نہیں سکتی میں کیسا محسوس کر رہی ہوں۔" اس کی آواز سے ایک دم ایکسائٹمنٹ جھلکنے لگی تھی۔

داؤد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اب کیا کہے وہ کوئی شرمیلا بندہ نہیں تھا بہت بولڈ تھا لیکن لڑکیوں سے اس کی بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔

اسے خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ بولی تھی۔

"آپ میرے بارے میں کچھ نہیں پوچھیں گے؟"

"آپ خود بتا دیں۔" داؤد نے کہہ کر قصہ ہی ختم کر دیا۔

ایک پل کے لیے تو وہ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی پھر مسکرا کر بولی۔

"میرا نام نورین ہے میں ڈاکٹر ہوں دو سال سے جاب کر رہی ہوں ہم دو بہنیں ہیں میں سب سے بڑی ہوں۔ آنٹی قمر سے کچھ دن پہلے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ آج انہوں نے ہمیں انوائیٹ کیا آپ کو معلوم ہی ہو گا ہم لوگ کیوں مل رہے ہیں؟"

داؤد نے چونک کر اسے دیکھا اس سے پہلے وہ جواب دیتا وہ سب لاؤنج میں داخل ہوئے تو داؤد اور نورین بھی کھڑے ہوگئے۔

"اوکے بیٹا اجازت دیں آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ امید ہے جلد آپ سے ملاقات ہوگی۔"

میجر حامد صاحب اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہہ رہے تھے تو اس نے بھی مسکرا کر سرہلا دیا۔ جانے سے پہلے نورین اس کے قریب رکی تھی۔

"آپ سے مل کر مجھے واقعی بہت اچھا لگا۔" داؤد کے مسکرانے پر وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

مہمانوں کو سی آف کر کے قمر بیگم جب اندر آئیں تو وہ خوش لگ رہی تھیں۔

"کیسے لگے تمہیں وہ لوگ؟" اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے انہوں نے اس سے پوچھا۔

"اچھے ہیں۔"

"اور نورین کیسی لگی تمہیں؟" انہوں نے اشتیاق سے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

"اچھی ہے۔"

"بس اچھی؟" ان کے کہنے پر وہ مسکرا دیا تھا۔

"تو اور کیا کہوں؟"

تو میں انہیں ہاں کردوں؟"

"اتنی جلدی کیا ہے مما!" ان کے ہتھیلی پر سرسوں جمانے والے طریقے پر وہ جز بز ہو کر بولا تھا۔

"داؤد! نورین بالکل ویسی ہے جیسا تم نے کہا تھا' سور ایکو کینڈ بیوٹی فل اور بہت بولڈ بھی" اگلے لفظ کا اضافہ اس نے خود کردیا تو قمر بیگم چپ کر گئیں۔

"واقعی نورین کچھ زیادہ ہی بولڈ تھی۔" ان کا چہرہ اترتے دیکھ کر داؤد نے سر جھٹکا۔

"اگر آپ کو ٹھیک لگتا ہے تو مجھے منظور ہے۔" وہ کہہ کر ان کا ردعمل دیکھنے کے لیے رکا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

بہت ہی ڈراؤنا خواب تھا جس نے انہیں گہری نیند سے اٹھنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھیں کچھ دیر تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اندھیرے میں گھورتی رہیں پھر انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ لیمپ آن کیا ہلکی روشنی سارے کمرے میں پھیل گئی انہوں نے گردن گھما کر اصغر صاحب کی طرف دیکھا جو کروٹ بدلے گہری نیند میں تھے۔ انہوں نے گہرا سانس لے کر ٹانگیں بیڈ کے نیچے لٹکالیں ان کا رخ کشف اور تہذیب کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ اندر داخل ہوئیں تو کمرے میں نائٹ بلب کی نیلی روشنی پھیلی تھی۔

انہوں نے سامنے بیڈ کی طرف دیکھا وہ دونوں سو رہی تھیں تہذیب کا بازو کشف کے اوپر تھا اور کشف کا ہاتھ تہذیب کے بازو پر ان کے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھیں سب کچھ ٹھیک تھا تو پھر وہ خواب ان کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔

"یا اللہ میری بچیوں کی حفاظت کرنا۔" انہوں نے بے ساختہ سر اٹھا کر دعا کی تھی۔

وہ جب کمرے میں آئیں تو اصغر صاحب بیڈ پر بیٹھے تھے۔

"کہاں گئی تھیں؟" انہیں اندر آتا دیکھ کر انہوں نے پوچھا وہ کوئی جواب دیے بغیر بیڈ پر آکر بیٹھ گئیں۔

"کیا بات ہے زبیدہ؟" ان کے انداز پر اصغر صاحب بھی ٹھٹھک گئے تھے۔

"اصغر! میں نے ابھی بہت برا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا ایک جنگل ہے گھنا بہت ڈراؤنا اس میں سانپ ہی سانپ ہیں پھر میں نے وہاں ایک لڑکی کو بھاگتے دیکھا سانپ اس کے پیچھے لگے ہیں۔ وہ لڑکی بھاگتے بھاگتے گر جاتی ہے۔ وہ سانپ اسے گھیر لیتے ہیں اور پھر ایک بہت بڑا کالا ناگ اسے کاٹ لیتا ہے۔"

اصغر صاحب نے دیکھا وہ ہلکے ہلکے کانپ بھی رہی تھیں۔

"پھر میں نے اس لڑکی کا چہرہ دیکھا پتا ہے وہ کون تھی؟"

جب انہوں نے سوالیہ نظروں سے اصغر صاحب کو دیکھا تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

ایک پل کے لیے اصغر صاحب بھی ڈر گئے۔

"وہ تہذیب تھی۔" کہنے کے ساتھ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔ ایک پل کے لیے اصغر صاحب بھی کچھ بولنے کے قابل نہیں رہے۔

"آپ جانتے ہیں نا سانپ کا نظر آنا ہی برا ہے پھر اس نے تہذیب کو کاٹا بھی ہے۔"

وہ مسلسل رو رہی تھیں جبکہ اصغر صاحب بھی پریشان ہو گئے تھے لیکن پھر انہوں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"یہ صرف ایک خواب ہی تھا زبیدہ اور اگر تمہیں لگتا ہے کہ کچھ برا ہونے والا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مصیبتوں کو ٹالنے کے لیے صدقے کا حکم دیا ہے۔ میں کل ہی صدقہ دیتا ہوں جو بلا ہو گی خود بخود ٹل جائے گی۔"

ان کی تسلی پر وہ چپ تو ہو گئی تھیں لیکن ان کا دل مسلسل پریشان تھا۔

☼ ☼ ☼

تہذیب نے ناراضی سے انہیں دیکھا "میں نے ایک ہفتے پہلے آپ کو بتایا تھا ہمارے اسکول کا ٹرپ اسلام آباد جا رہا ہے۔ تب تو آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا صبح مجھے جانا ہے تو آپ کہہ رہی ہیں نہ جاؤ۔"

"تہذیب میرے ساتھ بحث نہ کرو کہہ دیا نا کہ نہ جانا۔"

ان کے دو ٹوک انداز پر وہ کتنی دیر ہونٹ کاٹتی انہیں دیکھتی رہی اس کی آنکھیں لبالب پانی سے بھر گئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کشف نے افسوس سے اسے جاتے دیکھا پھر کچھ کہنے کے لیے ماں کا چہرہ دیکھا لیکن ان کا سخت چہرہ دیکھ کر وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

وہ اوندھے منہ بستر پر لیٹی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی تھی اور پھر اصغر صاحب کی آواز سنائی دی تھی۔

"تہذیب بیٹا! دروازہ کھولو۔" کچھ دیر تو وہ لیٹی ہی پڑی رہی لیکن جب تین چار بار دستک ہوئی تو اسے اٹھنا پڑا' دروازہ کھول کر وہ دوبارہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اصغر صاحب اندر داخل ہوئے اور اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"میری بیٹی ناراض کیوں ہے؟" تہذیب نے نظریں اٹھا کر باپ کا چہرہ دیکھا اسے ایک بار پھر رونا آنے لگا تھا۔

"ابو! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہمارے اسکول کا ٹرپ جا رہا ہے امی کو بھی بتایا تھا لیکن اب وہ منع کر رہی ہیں۔"

ابو! میں بچی تو نہیں جو گم ہو جاؤں گی اور پھر میری ساری کولیگز بھی جا رہی ہیں۔" اصغر صاحب نے ایک پل کے لیے سوچا کہ اسے زبیدہ کے خواب کے بارے میں بتا دیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ وہ بھی پریشان ہو جائے گی اور وہ تو صرف ایک خواب ہی تھا تب ہی کشف کھانے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی تہذیب نے ناراضی سے اسے دیکھا "مجھے کچھ نہیں کھانا۔" اس نے منہ دوسری طرف موڑ لیا کشف نے جاتے ہوئے باپ کا چہرہ دیکھا تو وہ مسکرا دیے۔

"چلو بیٹا! کھانا کھاؤ کھانے سے کیا ناراضی ہے۔" لیکن وہ بدستور منہ پھلائے بیٹھی رہی۔

"تم نے ٹرپ پر جانا ہے نا!" تہذیب نے فوراً نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"تم چلی جانا۔ تمہاری ماں کو میں سمجھا دوں گا۔"

"سچ!" وہ خوشی کے مارے کھڑی ہو گئی اور ان کے گلے لگ گئی "ابو یو آر گریٹ۔" تو انہوں نے مسکرا کر اس کا سر تھپتھپایا تھا۔

"تمہاری امی ٹھیک کہتی ہیں بالکل بچوں والی حرکتیں ہیں تمہاری بچوں کی طرح ناراض ہو جاتی ہو اور پھر فوراً" مان بھی جاتی ہو۔" چلو اب لاڈ بعد میں اٹھوا لینا۔ پہلے کھانا کھا لو۔ تمہاری وجہ سے میں بھی بھوکی ہوں۔"

کشف کی آواز پر وہ مسکراتی ہوئی بیڈ کی طرف آ گئی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ "سچ بہت زبردست قسم کی بھوک لگی ہے۔" وہ کہنے کے ساتھ کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔ کشف نے مسکرا کر باپ کو دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیے۔

☼ ☼ ☼

ڈی آئی جی کے ساتھ ان کی میٹنگ تھی۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ کانفرنس روم سے باہر آئے تو کافی سنجیدہ تھے حتیٰ کہ ہر وقت مذاق کے موڈ میں رہنے والا حسن بھی خاموش تھا۔ کاشف نے ایک نظر اپنے سینئرز پر ڈالی اور خاموشی سے ان کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ لوگ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے کیفے ٹیریا میں آ گئے تھے جس موضوع کو وہ ڈی آئی جی کے روم میں ڈسکس کر کے آئے تھے وہ اب دوبارہ ان کے درمیان زیر بحث تھا۔

ایک مافیا گروہ جس کا کام ایلیٹ کلاس کے بچوں یا بڑی شخصیات کو اغوا کرنا تھا پھر وہ ان سے بھاری رقم وصول کرتا تھا۔ یہ گروہ پچھلے دو مہاؤں سے کافی سرگرم عمل تھا۔ کافی جدوجہد کے باوجود پولیس ابھی تک ان کا کوئی آدمی گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ اب یہ کیس اسلام آباد پولیس کے پاس آیا تھا اور آج یہ میٹنگ اسی سلسلے میں تھی۔

پہلے کچھ عرصے سے داؤد اور اس کی ٹیم نے جس طرح بہت سے پیچیدہ کیس اپنی جان پر کھیل کر حل کیے تھے لازمی طور پر ان سے توقعات بھی زیادہ ہو گئی تھیں۔ اب بھی ڈی آئی جی صاحب نے خاص طور پر یہ کیس ان کے حوالے کیا تھا۔ کھانے کے دوران بھی وہ لوگ اسی گروہ کو ڈسکس کرتے رہے۔ اٹھنے سے پہلے داؤد نے حسن کو ان لوگوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کر کے اسے انفارم کرنے کا کہا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جب حسن تقریباً" بھاگتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔

"کل نورین کے ساتھ ملاقات کیسی رہی؟" وہ جو تیزی سے چل رہا تھا۔ حسن کے سوال پر بے ساختہ رکا تھا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے غیبی علم نہیں آتا اور نہ میں سلیمانی ٹوپی پہن کر تم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے آنٹی نے بتایا ہے۔"

داؤد سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے کیپ اتار کر ٹیبل پر رکھی اور خود چیئر پر بیٹھ گیا۔

"پھر کیسی لگی نورین؟" حسن نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کافی اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"جب مما نے ملاقات کے بارے میں بتایا ہے تو یہ بھی بتایا ہو گا مجھے نورین کیسی لگی۔"

"میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں' جب تم کسی لڑکی کی تعریف کرو گے تو کیسے لگو گے۔" حسن کے انداز پر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" اس کی مسکراہٹ کو حسن نے اپنے انداز میں لیا تھا۔

"بھئی پھر تو ڈاکٹر نورین سے ملنا چاہیے۔"

"بکومت ایسی بھی کوئی بات نہیں وہ اچھی لڑکی ہے۔"

"اچھا۔" حسن نے مایوسی سے سر ہلایا "تو یہ صرف پسندیدگی ہے محبت نہیں۔"

داؤد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ سامنے پڑی فائل کھول کر اپنے آگے کر لی تھی۔ حسن جانتا تھا۔ اب وہ کوئی بات نہیں کرے گا۔

"بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے
وہ گنگناتا ہوا اس کے آفس سے باہر نکل گیا

☼ ☼ ☼

"کیسی لگ رہی ہوں۔" تہذیب کے پوچھنے پر کشف نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ بلیک سوٹ پر وائٹ امبرائیڈری کی ہوئی تھی۔

"تم اسکول ٹرپ پر جا رہی ہو یا فیشن شو پر؟" کشف

نے اسے ٹوکا۔

"کیا کشف اب تم بھی امی کی طرح شروع مت ہو جانا یہ مت کرو وہ مت کرو تمہیں کیا پتا وہاں سب کتنی تیاری کے ساتھ آتی ہیں بس میں ہی نہ چلی ہوئی ہوں کتنا آکورڈ لگتا ہے مجھے۔" تہذیب نے منہ بنا کر کہا۔ "اچھا بابا نہیں کچھ کہتی لیکن تمہاری اتنی تیاری پر امی ضرور بولیں گی۔"

"تہذیب تمہارے اسکول کی بس آگئی ہے۔"

اس نے تیزی سے برش بالوں میں پھیرا اور ربربینڈ سے بالوں کو باندھ کر ہینڈ بیگ اٹھایا اور باہر کی طرف بھاگی۔ باہر زبیدہ بیگم کو صوفے پر بیٹھا دیکھ کر رک گئی انہوں نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا تھا۔

"تم کیا شادی میں جا رہی ہو۔" انہوں نے اس کی دونوں کلائیوں میں ڈھیر ساری چوڑیاں دیکھ کر کہا تو اس کا منہ بن گیا لیکن بولی کچھ نہیں۔

"زبیدہ بیگم نے غور سے تہذیب کا چہرہ دیکھا" کتنے بجے تک آؤ گی؟"

"رات ہو جائے گی۔ ذرا مجھے چھوڑ دے لی۔" اس نے اپنی دوست کا نام لیا۔

"کشف اسے چادر دے دو۔" تہذیب نے پلٹ کر ماں کا ناراض چہرہ دیکھا تو ان کی طرف بڑھ آئی۔

"امی! آپ مجھ سے ناراض ہیں۔" زبیدہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا وہ ناراض نہیں تھیں صرف اپنے اس خواب کی وجہ سے پریشان تھیں۔ اب جبکہ وہ لمبے سفر پر جا رہی تھی تو وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔

"نہیں بیٹا! میں تم سے ناراض نہیں۔" ان کے کہنے کی دیر تھی اس کے چہرے کی رونق ایک دم بحال ہو گئی تھی۔ باہر ہارن کی آواز پر وہ ایک دم کھڑی ہوگئی تھی۔

"زبیدہ نے آیت الکرسی پڑھ کر اس پر پھونکی تھی۔ کشف چادر لے کر اس کے پیچھے بھاگی تھی لیکن وہ بس میں سوار ہو گئی تھی۔ کشف نے مسکرا کر جاتی بس کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ٹیچر اسلام آباد تو میں نے دیکھا ہوا ہے۔" وہ باہر کے نظاروں میں مگن تھی جب اس کی فیورٹ اسٹوڈنٹ سونیا نے کہا تھا۔

"ٹیچر! کیا ہم دوسری کنٹری میں گھومنے نہیں جا سکتے تھے؟" تہذیب نے گہرا سانس لے کر سر ہلایا۔ سونیا کسی بہت بڑے بزنس مین کی بیٹی تھی اور اس کے ایک چچا سیاست میں تھے۔

جب پچھلی سیٹ پر بیٹھی اس کی کولیگ سارا نے اسے آواز دی تھی "چاکلیٹ!" وہ چاکلیٹ اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔

"تھینکس یار یہ بتاؤ اسلام آباد کتنی دیر تک آئے گا۔" تہذیب کی اکتائی ہوئی آواز پر سارا ہنس پڑی تھی "بس آنے والا ہے۔ میرا خیال ہے ایک ڈیڑھ گھنٹہ اور لگے گا۔" اچانک ایک جھٹکے سے بس رک گئی۔ سب لوگ کھڑکیوں سے باہر دیکھ رہے تھے وہ بھی پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی ڈرائیور باہر کسی سے بحث میں مصروف تھا۔ ابھی وہ صورت حال سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب تین آدمی بس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

"آپ اندر کیسے آگئے؟" آگے بیٹھی ایک ٹیچر نے ان تینوں سے کہا تھا۔

"دیکھیں مس ہمیں ذرا آگے تک جانا ہے ہم اتر جائیں گے۔"

"یہ اسکول بس ہے کوئی پبلک ٹرانسپورٹ نہیں۔ آپ لوگ اتر جائیں۔" وہ ٹیچر غصے سے بولی تھیں۔

"آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ ہم نے کہا نا۔ ہم آگے اتر جائیں گے۔ اوئے ڈرائیور چلو تم۔" وہ غصے سے ڈرائیور کی طرف مڑا۔

وہ ٹیچر اب بھی کھڑی انہیں گھور رہی تھیں۔

"او شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی؟ چپ چاپ بیٹھ جاؤ ورنہ اٹھا کر چلتی بس سے نیچے پھینک دوں گا۔" اس کا انداز ہی ایسا تھا کہ ان ٹیچر کے ساتھ باقی لوگ بھی خوف زدہ ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔ بس چل پڑی تھی اور اس بس میں موجود سب لوگ ان تینوں کے مقصد جاننے سے قاصر تھے۔ وہ تینوں بس میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہے تھے تب ہی ان میں سے ایک نے جیب سے تصویر نکالی اور پچھلی سیٹوں کی طرف دیکھ کر اپنے دوسرے ساتھی کے کان میں کچھ کہا تھا۔ ان میں سے جو تیسرا آدمی جس کی عمر لگ بھگ ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ اس نے موبائل پر کسی سے بات کی تھی۔ وہ لوگ پندرہ منٹ سے کھڑے تھے اور ان کا تیسرا ساتھی جس نے موبائل پر بات کی تھی پچھلے پندرہ منٹ سے تہذیب کو گھورنے میں مصروف تھا۔ ٹھیک ٹھاک شکل و صورت کا لڑکا تھا لیکن اس کی آنکھیں بہت عجیب تھیں۔

تہذیب نے گھبرا کر کندھوں پر لیا ہوا دوپٹہ سر پر کر کے اپنا چہرہ بھی کافی حد تک اس میں چھپا لیا۔ تبھی اس لڑکے کے اشارے پر دوسرے آدمی جس کی [illegible] تھیں ڈرائیور کے سر پر گن رکھ دی۔ پوری بس میں بچوں کی چیخیں گونج گئیں۔

"خاموش! کسی کی آواز نہ آئے ورنہ ہم اس کا سر اڑا دیں گے۔" ان کا دوسرا ساتھی بولا جس کا رنگ بہت کالا تھا اور چہرے پر جابجا زخموں کے نشان تھے۔ [illegible] نے بھی اپنی گن نکال لی تھی۔

"ڈرائیور بس یہیں پیچھے اتار لو" سیاہ رنگ والے نے سنسان راستے کی طرف جاتی سڑک کی طرف [illegible] کرتے ہوئے کہا۔ بس کے رکتے ہی وہ لڑکا اور کالے رنگ والا آدمی اتر گئے تھے۔ ان کی بس کے پیچھے دوسری سکول بس آ رہی تھی وہ بھی ان کے قریب رک گئی اس میں بھی ان کے دو آدمی تھے۔ ان کو وہاں رکے کافی دیر گزر گئی تھی شام کے سائے بھی آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ بچوں کا رونا بھی اب بند ہو گیا تھا لیکن وہ مسلسل سہمی ہوئی نظروں سے باہر دیکھ رہے تھے۔ تہذیب کے ساتھ بیٹھی سونیا اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھی جبکہ وہ مسلسل بہتے اپنے آنسوؤں کو صاف کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے اور ڈر کے مارے دھڑکن اتنی تیز چل رہی تھی جیسے ابھی ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ان میں ایک آدمی دوبارہ اندر آیا تھا اور آتے ہی تلاشی کرنے کے بعد جس جس کے پاس موبائل تھا اس نے لے لیا تھا۔ سب لوگ ابھی تک ان کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھے۔ تب ہی وہ لڑکا جو تہذیب کو گھور رہا تھا اندر داخل ہوا۔

"سلطان! وہ لوگ ہمارے مطالبات نہیں مان رہے بچے کو لے آؤ۔"

اس کی بات پر سب نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔ اس لڑکے نے اس لمبی مونچھوں والے کو سلطان کے نام سے بلایا تھا۔ سلطان پچھلی سیٹوں کی طرف بڑھنے لگا اپنی سیٹ کی طرف بڑھتا دیکھ کر تہذیب کی سانس سینے میں اٹک کر رہ گئی۔ اچانک سلطان نامی شخص نے آگے بڑھ کر سونیا کا بازو دبوچ لیا سونیا کی چیخیں ساری بس میں گونجنے لگی تھیں۔ اس کو دیکھ کر باقی بچے بھی رونے لگے تھے۔

"میں نہیں جاؤں گی ٹیچر میں نہیں جاؤں گی" سونیا نے چلاتے ہوئے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ سونیا کو روتا دیکھ کر اس کے اپنے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔ وہ شخص اس کو مسلسل کھینچ رہا تھا اور تہذیب کے ڈر کے مارے سارے حواس سلب ہو کر رہ گئے تھے۔

"سلطان! اس لڑکی کو بھی ساتھ لے آؤ۔" وہ جو پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی۔ اس اچانک افتاد پر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

"لیکن بابر! اس لڑکی کا کیا کرنا ہے۔" سلطان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"میں نے کہا نا اس لڑکی کو بھی لے آؤ۔" اب کے اس نے حکمیہ انداز میں کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" ڈر کے مارے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ سلطان نے باہر کی طرف دیکھا تھا تبھی وہ خود آگے بڑھا تھا۔

"تم بچی کو لے جاؤ۔" اس کے کہنے کی دیر تھی اس سے پہلے وہ صرف سونیا کا بازو کھینچ رہا تھا! اچانک تم اٹھتے ان اس نے سونیا کو جھٹکا دے کر کھڑا کیا اور گود میں اٹھالیا۔ سونیا چیخنے کے ساتھ بری طرح اس کی گرفت میں مچل رہی تھی۔ بس میں بیٹھے کسی آدمی نے اتنی جرأت نہیں کی کہ اس آدمی کو روک سکے کیونکہ ان کے پاس گن تھی اور جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔ سلطان کے بس سے باہر نکلتے ہی بابر اس کی سیٹ کے بالکل پاس آکر کھڑا ہو گیا تہذیب نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور بالکل کھڑکی کے ساتھ لگ گئی بابر نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا۔" وہ اب دوسرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش بھی کر رہی تھی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی وہ اسے کھینچ کر اٹھانے میں کامیاب ہو گیا تھا "سر پلیز مجھے بچائیں" وہ اسے کھینچ کر لے جا رہا تھا جب اس نے خاور صاحب جو ان کے سکول کے اسپورٹس ٹیچر تھے ان کی سیٹ کو مضبوطی سے تھام کر التجا کی تھی۔ خاور کو بھی جانے کیا ہوا وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

"لڑکی کا ہاتھ چھوڑو۔" بابر نے ایک نظر اسے دیکھا اگلے ہی پل اپنے ہاتھ میں تھامی گن بڑے زوردار طریقے سے اس کے منہ پر ماری تہذیب کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی تھی جبکہ خاور کراہتا ہوا منہ کے بل گرا تھا۔ بابر اس کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر کھینچتا ہوا بس سے باہر لے آیا تھا۔ نکلنے سے پہلے اس نے سب لوگوں کو وارن کیا تھا۔

"اگر تم لوگوں کو اپنی جان پیاری ہے اور تم لوگ چاہتے ہو کہ اپنے گھروں کو صحیح سلامت جاؤ تو کوئی آواز کوئی چالاکی نہیں ہمارے اترتے ہی تم لوگ جا سکتے ہو۔"

ان کے اترتے ہی بس چل پڑی تھی اور اس کے پیچھے دوسری بس بھی جبکہ وہ حیران پریشان ان بسوں کو جاتا دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"بابر اس بچی کو تو ہم نے تاوان کے لیے رکھا ہے لیکن یہ لڑکی؟" سلطان نے تہذیب کو دیکھ کر بابر کو دیکھا جو اب اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنی گن کا بولٹ چیک کرنے میں مصروف تھا۔

"یہ لڑکی مجھے اچھی لگی ہے۔ بچی کو تو ہم کام ہونے کے بعد چھوڑ دیں گے لیکن یہ لڑکی اب میرے پاس رہے گی۔"

تہذیب رونا دھونا بھول کر اس کی شکل دیکھنے لگی جو بڑے غور سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا دماغ ایکدم ماؤف ہو گیا تھا سونیا اس آدمی سے ہاتھ چھڑا کر اس سے لپٹ گئی تھی لیکن اس میں ہاتھ ہلانے کی سکت نہیں رہی تھی اسے اپنی جان کی نہیں صرف اپنی عزت کی فکر تھی۔ یوں کسی ڈاکو کا اسے اپنے پاس رکھنا اور وہ اس کی خود پر جمی نظریں اس نے بے چینی سے اردگرد کا جائزہ لیا۔

وہ کافی سنسان جگہ تھی، درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے۔

"یار بابر! یہ لڑکی نہیں کوئی مصیبت کھڑی نہ کر دے پہلے ہی نو بج رہا ہے پولیس کو اطلاع مل چکی ہے۔"

"بس سلطان مزید کوئی بات نہیں یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی۔" نواز سے کہو گاڑی یہیں لے آئے تب تک میں اس سے دو چار باتیں ہی کر لوں۔"

وہ مسکراتا ہوا تہذیب کی طرف بڑھا اور اسی طرح بڑے بے ساختہ انداز میں وہ پیچھے ہٹی تھی۔ اسے مسلسل پیچھے ہٹتا دیکھ کر وہ رک گیا تھا اور تہذیب کے قدم بھی رک گئے تھے۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی ہرنی شکار ہونے سے پہلے رحم طلب نظروں سے اپنے شکاری کو دیکھتی ہے۔

"ایسے دیکھو گی تو میں کیسے خود کو روک پاؤں گا۔"

وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے پاس آیا اور اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔ تہذیب کی روح فنا ہو گئی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی حرکت کرتا۔ پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا تھا۔ بابر نے ایکدم

اسے چھوڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔ تہذیب کے ذہن نے بجلی کی تیزی سے کام کیا تھا۔ اس نے قریب کھڑی سونیا کا ہاتھ پکڑا اور سمت کا تعین کیے بغیر دوڑ لگا دی۔ ان کو بھاگتے دیکھ کر بابر ایک پل کے لیے حیران رہ گیا اور پھر وہ ان کے پیچھے بھاگا تھا اور بابر کے پیچھے سلطان۔ وہ پاگلوں کی طرح بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی راستہ کونسا ہے اسے صرف یہ پتا تھا اسے اپنی عزت بچانی ہے۔ سونیا کا پاؤں پھسلا تھا اور وہ وہیں گر گئی تھی۔

تہذیب نے گھبرا کر اسے دیکھا وہ اسے اٹھانے کے لیے مڑنے والی تھی تبھی اسے بھاگتے قدموں کی آواز نزدیک سے آئی تو وہ سونیا پر ایک بے بس نظر ڈال کر پھر بھاگنے لگی تھی۔ وہ کتنا بھاگی تھی اسے اندازہ نہیں تھا لیکن جب سانس پھولنے لگا اور بھاگنے کی ہمت نہیں رہی تو اس نے درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی۔

کچھ دیر بعد اس نے درخت کی اوٹ سے دیکھا کچھ فاصلے پر اسے وہ دونوں نظر آئے جو متلاشی نظروں سے اسے ہی ڈھونڈ رہے تھے جبکہ سونیا ان کی گرفت میں تھی۔ سائرن کی آواز اب کافی قریب سے آ رہی تھی۔

"بابر یار چل۔" سلطان نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا۔

"نہیں مجھے یہ لڑکی چاہیے۔"

"نہیں بابر اس وقت ہمارے پاس مزید کوئی چانس نہیں یہ نہ ہو ہم جان سے بھی جائیں۔ ابھی چلو زندہ رہے تو اسے ڈھونڈ لیں گے۔"

بابر نے نظر گھما کر چاروں طرف دیکھا تو وہ ایک دم درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ قدموں کی آواز کے بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے اور پھر جانے کی آواز آئی تھی۔ کتنی دیر تو وہیں دم سادھے کھڑی رہی اور پھر اس نے سامنے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا جہاں سے سائرن کی آواز آ رہی تھی۔ اونچی ہیل کی وجہ سے وہ کتنی مرتبہ گری تھی چوٹیں بھی آئی تھیں لیکن وہ ان کی پرواہ کیے بغیر بھاگ رہی تھی۔ تب ہی دور سے اسے پولیس کی تین گاڑیاں نظر آئی تھیں آنکھوں میں آئے آنسوؤں نے کچھ دیر کے لیے سامنے کے منظر کو دھندلا دیا تھا اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو صاف کیا اور دیوانہ وار اوپر جاتی سڑک پر بھاگنے لگی۔

☆ ☆ ☆

اطلاع ملتے ہی انہوں نے جنگل کے اس حصے کو گھیر لیا تھا۔ حسن اور کاشف وہاں پہنچ چکے تھے جبکہ انہیں داؤد کا انتظار تھا۔

"سر! وہ لڑکی" اچانک کاشف کی نظر اس پر پڑی تھی۔ اس کے کہنے پر فراز نے پیچھے دیکھا تھا ایک لڑکی بھاگتی ہوئی ان کی طرف بڑھ رہی تھی اس سے پہلے وہ ان تک پہنچتی وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

"کون ہیں آپ اور یہاں کیا کر رہی ہیں؟" حسن نے بغور اس کا جائزہ لیا تھا۔

"میں یہاں ۔۔۔ وہ بس سونیا۔" مسلسل رونے سے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پا رہی تھی۔

"لیکن سونیا اور بس کے ذکر سے وہ کچھ کچھ معاملہ سمجھ گیا تھا۔

"آپ سونیا کو کیسے جانتی ہیں؟"

"میں اس کی ٹیچر ہوں۔" وہ بری طرح رونے لگی تھی۔

"کاشف! پانی لاؤ۔"

"دیکھیں آپ چپ کر جائیں۔ لیں یہ پانی لیں۔" حسن نے کاشف کے ہاتھ سے پانی کی بوتل لے کر اس کی طرف بڑھائی۔

"اس نے بہت مشکل سے تین چار گھونٹ پیے تھے۔"

"آپ ریلیکس ہو جائیں اور مجھے آرام سے بتائیں وہ لوگ کس طرف گئے ہیں۔" حسن کے پوچھنے پر اس نے ہاتھ سے نیچے جانے والی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

حسن نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کاشف کو اشارہ کیا تھا جس نے سر ہلا کر ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر کوئی نمبر پریس کیا تھا۔ حسن کاشف کے پاس آ گیا تھا

داؤد کو فون کیا۔

"جی سر! وہ نکل چکے ہیں۔"

"ہوں!" حسن نے سر ہلا کر دوبارہ تہذیب کی طرف دیکھا جو گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اس کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا جیسے بہت مشکل سے کھڑی ہو۔ قریب جا کر حسن نے محسوس کیا وہ کانپ بھی رہی تھی۔

"آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں" وہ شاید اپنے ہی دھیان میں تھی اس کی آواز پر گھبرا کر سر اٹھایا۔ وہ اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے سمجھ نہ پا رہی ہو۔ حسن کو اس کی پریشانی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"باہر سردی ہے آپ اندر بیٹھ جائیں۔"

تو وہ خاموشی سے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر شیشے کے پار دیکھا جہاں وہ دو افراد کھڑے تھے اور ان سے کچھ فاصلے پر پولیس وین جس میں وردی میں ملبوس آفیسر تھے۔ ان لوگوں کی وہاں موجودگی سے اسے یک گونہ احساس ہوا تھا۔ پتا نہیں کیا ٹائم ہوا ہے اس نے تھوڑا سا آگے جھک کر ڈیش بورڈ کی طرف دیکھا۔ شام کے سات بج رہے تھے اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر پانی جمع ہونے لگا۔

"امی ابو کاشف پتا نہیں کیا کر رہے ہوں گے جب میں گھر نہیں پہنچوں گی تو پتا نہیں ان کی کیا حالت ہوگی اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" وہ ابھی ابھی وہاں پہنچا تھا۔ گاڑی میں بیٹھی تہذیب کو دیکھ کر اس نے حسن سے پوچھا تھا۔

"سونیا کی ٹیچر ہے جب ہم یہاں پہنچے تو یہ ہمیں یہاں ملی۔" "کچھ بتایا اس نے؟" داؤد نے ایک نظر اسے دیکھ کر کہا۔

"نہیں کافی ڈری ہوئی لگ رہی ہے۔ صرف اتنا ہی بتایا۔ وہ لوگ جنگل کی طرف گئے ہیں بچی ان کے پاس ہے۔"

"ہوں! آدھا گھنٹہ تو ہو گیا ہے۔"

حسن کے کہنے پر اس نے نیچے جانے والی سڑک کی طرف دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔"

داؤد اب کچھ فاصلے پر کھڑی پولیس وین کی طرف گیا تھا۔ اس کی ہدایت پر وہ لوگ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے تو وہ دوبارہ حسن اور کاشف کی طرف آ گیا۔

"میں نے ان لوگوں کو جنگل کی طرف بھیج دیا ہے۔ اطلاع ملنے پر وہ انفارم کریں گے ہم دوسرے راستے سے جائیں گے کاشف ٹارچ وغیرہ رکھ لو۔" داؤد نے پھیلتے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے انہوں نے اسے کیوں اتارا؟"

وہ تہذیب کو پرسوچ انداز میں دیکھتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا داؤد نے انگلی سے شیشہ بجایا تہذیب اپنے دھیان سے چونکی تھی اس نے شیشے کی طرف دیکھا جہاں ایک شخص اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا وہ ڈر کر پیچھے ہٹی تھی۔ اس نے مدد کے لیے ان لوگوں کو ڈھونڈنے والے [illegible] آنسو آ گئے۔

"باہر آئیں۔" داؤد نے کہنے کے ساتھ دروازہ کھول دیا تو وہ ڈر کے مارے دوسرے دروازے سے جا لگی۔ حسن نے داؤد کو غصے سے گاڑی کے دروازے کے پاس دیکھا تو بھاگتا ہوا اس کے قریب آیا تھا حسن کے قریب آنے پر وہ جھنجلا کر اس کی طرف مڑا۔

"یہ بہری ہے یا گونگی ہے۔" حسن نے داؤد پر سے نظریں ہٹا کر کار میں جھانکا۔

"دیکھیں مس باہر آئیں۔ ہم پولیس والے ہیں۔ ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔" حسن کا انداز اتنا نرم تھا کہ وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔ اس نے داؤد کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

"اب آپ منہ کھول کر یہ بتانا پسند کریں گی وہ کتنے لوگ تھے؟" داؤد نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا تھا۔

"تین۔" وہ تھوک نگل کر بولی پھر دوسرے ہی پل وہ پھر بولی تھی۔

"نہیں پانچ تھے۔" اسے دوسری بس سے نکلنے والے دو لوگ اور یاد آئے تھے داؤد نے کھا جانے والی

نظروں سے اسے دیکھا۔
"محترمہ یادداشت پر زور دیں تین تھے یا پانچ؟"
"پانچ!" وہ اب سر جھکا کر بولی۔
"آپ کو کیوں اتارا انہوں نے؟" داؤد کے سوال پر اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھرنے لگیں اب انہیں کیا بتاتی کیوں اتارا۔
"کچھ پوچھا ہے آپ سے۔" اسے خاموش دیکھ کر داؤد نے کہا تھا۔
"پتا نہیں" وہ اسی طرح جھکے سر کے ساتھ بولی۔ حسن نے اس کے اترے چہرے کو دیکھ کر داؤد کو دیکھا۔
"داؤد! کول ڈاؤن یار وہ پہلے سے ڈری ہوئی ہے اور اب چلو پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے" حسن کی بات پر اس نے گہرا سانس لیا تھا۔
"چلو۔" داؤد کے کہنے پر انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ روشن کرلی تھیں۔
"داؤد ان کا کیا کرنا ہے" حسن کے سوال پر اس نے سوالیہ نظروں سے حسن کو دیکھا جو سر جھکائے کھڑی تہذیب کو دیکھ رہا تھا۔
"واٹ ڈو یو مین ان کا کیا کرنا ہے" کئی شکنیں داؤد کی پیشانی پر نمودار ہوئی تھیں۔
"اتنی رات کو اس سنسان سڑک پر ہم انہیں اکیلا چھوڑ کر تو نہیں جا سکتے نا۔"
"تو تمہارا کیا مطلب ہے یہ ہمارے ساتھ جائے گی؟" اب کے داؤد نے حیرت سے حسن کو دیکھا جس کے چہرے پر الجھے تاثرات تھے۔
"اوکم آن حسن ہم وہاں مجرموں کو پکڑنے جارہے ہیں پکنک اسپاٹ پر نہیں جارہے۔ وہاں ہماری اپنی جان کو خطرہ ہے۔ اس کو کہاں سنبھالتے پھریں گے۔"
"سر ٹھیک کہہ رہے ہیں حسن سر۔" کب سے خاموش کھڑے کاشف نے بھی اکتا کر کہا تھا۔ حسن کو داؤد سے اتفاق تو تھا لیکن اسے اس لڑکی کا بھی خیال تھا اور تہذیب سر جھکائے ان کے فیصلے کی منتظر تھی اور خاموشی میں ایک بار پھر داؤد کی آواز سنائی دی تھی۔
"میں جہانداد کو فون کردیتا ہوں وہ اسے یہاں سے لے جائے گا۔" آخر کار داؤد کو خیال آہی گیا تھا، داؤد موبائل پر نمبر ڈائل کرتا ہوا آگے نکل گیا اور اس کے پیچھے کاشف بھی۔ حسن تہذیب کی طرف مڑا۔
"آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں اور ڈور لاک کرلیں ابھی کچھ دیر میں ہمارے ایک انسپکٹر آئیں گے آپ ان کے ساتھ چلی جانا۔"
تہذیب نے نظر اٹھا کر حسن کی طرف دیکھا اتنے اندھیرے میں بھی اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو اسے صاف دکھائی دے رہے تھے لیکن وہ مجبور تھا اس نے سر جھٹک کر خود کو اس سوچ سے آزاد کیا وہ چلا گیا تھا اور تہذیب وہیں کھڑی ان تینوں کو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے دیکھ رہی تھی۔
ان تینوں کے نظروں سے اوجھل ہونے پر اس نے گھبرائی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آرہا تھا۔ اردگرد درختوں کے جھنڈ پھیلے تھے۔ جن کی لمبی لمبی شاخیں عجیب ڈراؤنا تاثر دے رہی تھیں۔ [illegible] اچھی طرح اپنے گرد لپیٹا۔ سردی آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ اس کے پاؤں سن ہو رہے تھے۔
"امی نے مجھے چادر دی بھی تھی۔" گھر والوں کا خیال آتے ہی اس کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں تبھی پیچھے درختوں میں سرسراہٹ ہوئی تھی اس نے چونک کر پیچھے دیکھا لیکن اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ جلدی سے کار کا دروازہ بند کرکے بیٹھ گئی اور ڈور لاک کرلیا اسے وہاں بیٹھے پانچ منٹ سے زیادہ ہوگئے تھے اسے جتنی سورتیں، آیات یاد تھیں وہ پڑھ رہی تھی لیکن باوجود کوشش کے وہ اپنے ڈر سے نجات حاصل نہیں کرسکی تھی۔ جس انسپکٹر نے اسے لینے آنا تھا وہ ابھی نہیں آیا تھا اور جانے کب تک آنا اور آنا بھی کہ نہیں جبکہ وہ جانتی تھی وہ بار نامی غنڈہ یہیں کہیں ہے اگر وہ دوبارہ آگیا تو وہ کیا کرے گی اور اس کی بری نیت سے بھی وہ اچھی طرح آگاہ تھی۔ اسے ایک پل لگا تھا فیصلہ کرنے میں۔ اس نے گاڑی کا [illegible] کھولا اور بھاگنا شروع کردیا۔

☆ ☆ ☆

اپنے پیچھے تیز قدموں کی آواز سن کر وہ تینوں تیزی سے مڑے تھے۔ آنے والے کو دیکھ کر جہاں ان تینوں کے چہرے پر حیرت آئی تھی وہیں ان تینوں کو اپنی طرف گن تانتے دیکھ کر تہذیب کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ اس کے چیخنے پر ان تینوں نے گن نیچے کرلیں تھیں۔
"آپ یہاں؟" حسن نے حیرت سے اسے دیکھا۔
تہذیب نے ایک دم اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
"دیکھیں پلیز میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے ساتھ لے جائیں وہاں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"
کہتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ بے حال ہوتے ہاتھ جوڑے وہ واقعی قابل رحم لگ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ تینوں خاموش ہوگئے تھے۔ ان کی [illegible] تہذیب [illegible] دیکھا لیکن اتنے اندھیرے میں وہ ان کے تاثرات جاننے سے قاصر تھی۔
"پلیز۔" وہ دوبارہ بولی تو داؤد نے اپنا رخ موڑ لیا۔
"ٹھیک ہے آپ چلیں ہمارے ساتھ۔" حسن کے کہنے پر داؤد غصے سے اس کی طرف مڑا۔
"داؤد پلیز اس طرح سنسان راستے پر ہم اکیلی لڑکی نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔"
"اگر کچھ برا ہوگیا تو کون ذمہ دار ہوگا۔"
"حسن سر ٹھیک کہہ رہے ہیں وہاں اکیلے رہنے سے بہتر ہے یہ ہمارے ساتھ چلیں پتا نہیں ہمیں کتنی دیر لگتی ہے۔" کاشف کی بات پر داؤد نے حیرت سے اسے دیکھا "حسن کو تو وہ جانتا تھا لڑکیوں کے معاملے میں اس کے جذبات ایسے ہی تھے لیکن کاشف۔" اس نے بے زاری سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے رونے میں مصروف تھی اس کی قابل رحم حالت نے سب کے ووٹ اس کی طرف منتقل کردیے تھے۔
"ہمیں ان لوگوں کو ڈھونڈنے میں صبح بھی ہوسکتی ہے اور یہ بھی نہیں پتا وہ کل بھی ملتے ہیں یا نہیں تو کیا کل تک یہ ہمارے ساتھ اس جنگل ٹائپ جگہ پر بھٹکتی رہے گی۔" داؤد نے اردگرد پھیلے درختوں کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ اس کی بات پر وہ دونوں ایک بار پھر چپ کر گئے تھے۔
"میں آپ کو بالکل تنگ نہیں کروں گی پلیز" تہذیب نے سامنے کھڑے داؤد سے کہا کیونکہ اتنی دیر میں اسے اندازہ ہوگیا تھا وہ ان کا سینئر ہے وہ اس کا آرڈر مانتے ہیں اور وہی اس کو ساتھ لے جانے کو تیار نہیں۔ لیکن وہاں اکیلے رہنے سے بہتر تھا وہ ان تینوں کے ساتھ رہے اگرچہ وہ تینوں بھی مرد تھے لیکن اس کا دل کہہ رہا تھا وہ تینوں مختلف تھے ان کے ساتھ وہ محفوظ رہے گی۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی آپشن بھی نہیں تھا سو وہ اللہ کے سہارے ان پر یقین کرنے کے لیے مجبور تھی۔ داؤد نے کچھ کہے بغیر قدم آگے بڑھا دیے اس کے آگے بڑھتے ہی وہ دونوں بھی اس کے پیچھے چل پڑے تو وہ پھر سر جھکائے خاموشی سے ان کے پیچھے چلنے لگی۔ انہیں چلتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی تہذیب نے پھولی سانسوں کے ساتھ ان تینوں کو دیکھا جو اتنی تیزی سے چل رہے تھے کہ ان کے پیچھے چلنے کے لیے اسے بھاگنا پڑ رہا تھا۔ کچھ اندھیرا کچھ اونچا نیچا راستہ ذرا سی بے احتیاطی سے وہ گر بھی سکتی تھی اتنی سردی میں لمبی ہیل کے ساتھ مسلسل چلنے سے اس کی جان نکل رہی تھی۔
تبھی ان تینوں میں سے کسی ایک کے موبائل کی بیپ بجی تھی۔ وہ لوگ رک گئے تھے۔ داؤد موبائل بند کرکے ان دونوں سے مخاطب ہوا۔
"ابھی تک ان لوگوں کا کچھ پتا نہیں چلا لیکن یہ شیور ہے کہ وہ لوگ اسی ایریا میں ہیں۔ ہمیں کچھ دیر یہیں انتظار کرنا ہوگا۔ ویسے بھی تھوڑی دیر تک صبح ہو جائے گی تو ٹائر کے نشان کے ذریعہ جلدی ان تک پہنچ جائیں گے۔"
داؤد نے درخت کے ساتھ ٹیک لگالی شاید وہ خود

بھی تھک گیا تھا۔ تہذیب نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا کم از کم تھوڑی دیر بیٹھنا تو نصیب ہوا تھا ورنہ اسے لگ رہا تھا اس جنگل میں چل چل کر ہیں اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ وہ ان تینوں سے کچھ فاصلے پر درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تینوں ان لوگوں کو ڈسکس کر رہے تھے۔

ان تینوں نے ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ ان کے ساتھ موجود ہے بھی یا نہیں اس نے سر اٹھا کر گہرے اندھیرے کو دیکھا۔

"صبح کب ہو گی؟" اگر ان لوگوں کے ہاتھوں میں ٹارچ نہ ہوتی تو اتنے گہرے اندھیرے میں وہ ویسے ہی خوف سے فوت ہو جاتی۔ ٹارچ کی روشنی اور ان لوگوں کی آوازیں اسے حوصلہ دے رہی تھیں۔ اپنے پاؤں میں اسے شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے جوتی کے اسٹریپ کھول کر جوتی اتار دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے پیر دبانے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ایک تو صبح وہ جلدی اٹھ گئی تھی۔ دوسرا سفر کے دوران حالات کی وجہ سے ذہنی اور جسمانی تھکن تھی اور صبح سے اس نے کچھ کھایا بھی نہیں تھا اب تھکن اور نقاہت کی وجہ سے نیند اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ اس نے دونوں بازو اپنی ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر سر گھٹنوں پر ٹکا دیا۔

کچھ عجیب سا احساس تھا جس نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا اس نے مندی مندی نظروں سے سامنے دیکھا جہاں وہ بیٹھے تھے اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئی تھیں۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوئی اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا وہ اسے کہیں نظر نہیں آئے۔ اس کے سوئے ہوئے حواس ایک دم الرٹ ہوئے تھے۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں ڈھونڈنے لگی پر وہ اسے کہیں نظر نہیں آئے۔

"سنیں آپ لوگ کہاں ہیں؟" بڑی مری ہوئی آواز میں اس نے انہیں آواز دی تھی۔

"وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے" پہلا خیال اسے یہ آیا تھا اور یہی خیال اس کو رلا گیا۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے چاروں طرف پھیلے اندھیرے کو دیکھا اور پھر وہ راستے کا تعین کیے بغیر بھاگنے لگی۔ بے خیالی میں جوتی وہی رہ گئی تھی اب ننگے پاؤں دوڑتے ہوئے طرح طرح کی چیزیں اس کے پاؤں سے ٹکرا رہی تھیں۔ کبھی اسے لگا کسی نے اس کا دوپٹہ کھینچا تھا اور اسے لگا جس چیز سے ڈر کر وہ بھاگ رہی ہے وہ وقت آگیا ہے۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔

☼ ☼ ☼

موبائل پر میسج ملتے ہی وہ تینوں تیزی سے آگے بڑھے تھے انہیں یاد ہی نہیں رہا وہ لڑکی بھی ان کے ساتھ ہے۔ وہ تینوں بہت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کیونکہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ آگے جھاڑیوں میں انہیں ہلچل کا احساس ہوا تھا۔ داؤد نے حسن کو اشارہ کیا۔ ابھی وہ دو قدم ہی بڑھے تھے جب [illegible] نسوانی چیخ کی آواز [illegible] تینوں [illegible] چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک ہی خیال ان تینوں کے ذہن میں آیا تھا وہ ان کے پیچھے چھوڑ گئی ہے۔

[illegible] کو وہیں رکنے کا کہہ کر وہ دونوں اس سمت میں بھاگے تھے جہاں وہ موجود تھی۔ اس کا دوپٹہ جھاڑیوں میں اٹکا تھا لیکن اس وقت اتنی ڈری ہوئی تھی کہ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا دوپٹہ وہیں چھوڑ کر بھاگی تھی تیزی سے بھاگتے ہوئے وہ بری طرح کسی سے ٹکرائی تھی۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ زمین و آسمان اس کے سامنے گھوم گئے تھے اس نے سر تھام کر نظریں اٹھائیں داؤد اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔

"کیا ہوا آپ چیخی کیوں تھیں؟" حسن کے سوال پر اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"وہ میں ڈر گئی تھی۔" اس نے سر جھکا کر شرمندگی سے کہا۔

"اٹیٹ نان مینس میں نے پہلے ہی کہا تھا اس

[illegible] کو ساتھ مت لو۔ لیکن تمہیں ہی شوق تھا اب بھگتو۔ اس بے وقوف لڑکی کی چیخ کی وجہ سے نہ ہم وہاں پہنچ پائے نہ وہ ہمارے ہاتھ سے نکلتے۔ اب پتا نہیں اب تک یہاں خوار ہونا پڑے گا۔" آخر میں وہ بڑبڑایا۔

"سر! وہاں تو وہ لوگ نہیں ملے لیکن اطلاع ملی ہے کہ وہ یہیں کہیں ہیں ان کے آس پاس ہونے کا سن کر تہذیب کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

"حسن! ہمیں ان لوگوں کو زیادہ ایزی نہیں لینا چاہیے۔ ان لوگوں سے کچھ بھی توقع کی جا سکتی ہے اگر ہمیں انہیں گرفتار کرنے میں زیادہ دیر ہو گئی تو مجبوراً اس لڑکی کے پیرنٹس کو ان کے مطالبات ماننے ہوں گے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اس صورت میں بچی کو مارنا ان کے لیے مشکل کام نہیں۔"

داؤد کے کہنے پر تہذیب کی نظروں میں سونیا کی شکل گھومنے لگی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا [illegible] روشنی پھیلنے لگی تھی پھر اس نے دوبارہ نظریں ان تینوں پر ٹکا دیں جو اس سے کچھ فاصلے پر ڈسکشن میں مصروف تھے۔ دن کی پھیلتی روشنی میں ان کے چہرے وہ اب واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ تہذیب کی نظریں داؤد پر ٹھہر گئیں وہ ان تینوں میں سب سے لمبا تھا بلکہ اس کے نقوش پرکشش تھے اس کی بارعب شخصیت اسے سب سے نمایاں کرتی تھی جب وہ بڑے غور سے اس کا جائزہ لینے میں مصروف تھی تبھی داؤد نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا اس کا جلتا منہ ایک پل کے لیے [illegible] تھا۔

تہذیب نے جلدی سے نظریں اس سے ہٹا کر سامنے درخت پر ٹکا دیں۔

"پتا نہیں خود کو سمجھتا کیا ہے کبھی عام حالات میں ملا ہوتا تو اس کی طبیعت ٹھکانے لگا دیتی۔ جنگلی لڑکیوں سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں۔"

دل ہی دل میں اسے اچھی طرح کوسنے کے بعد اس نے دوبارہ ترچھی نظروں سے انہیں دیکھا اور پھر اسے [illegible] لگا تھا اس نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ تینوں آگے جا رہے تھے۔ وہ ان کے پیچھے بھاگی۔ اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹکرایا تھا اچانک اس کے منہ سے زوردار چیخ نکلی تھی۔ وہ پاؤں پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی تھی بھاری قدموں کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ داؤد اس کی طرف آ رہا تھا —— قریب آنے پر داؤد نے کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا تھا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ وہ بیٹھے سے اوندھے منہ زمین پر گری۔ کوئی پتھر بڑی زور سے اس کے ماتھے پر لگا تھا۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ اس نے بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا نا کہ اب تمہاری آواز نہ آئے اگر تمہیں اتنا ہی ڈر لگتا ہے تو گھر سے باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ زہر لگتی ہیں مجھے تم جیسی لڑکیاں۔"

تہذیب شاک کی کیفیت میں اپنے قریب کھڑے داؤد کو دیکھ رہی تھی وہ درد، تھپڑ حتیٰ کہ رونا بھول گئی تھی۔

"اب اگر تم یہاں سے اٹھیں یا تمہاری آواز آئی تو یاد رکھنا یہیں دفن کر دوں گا۔" وہ سختی سے کہہ کر پلٹ گیا تھا۔

ماتھے پر درد محسوس کر کے اس نے ہاتھ سے چھوا نمی محسوس کرنے پر جب اس نے ہاتھ دیکھا وہاں خون لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے اس نے بائیں گال پر اپنا ہاتھ رکھ کر جلن کے احساس کو کم کرنے کی کوشش کی تھی تب ہی اس کی نظر پاؤں پر پڑی جو لہولہان تھا۔ کوئی چیز پاؤں میں چبھی تھی اسی لیے تو وہ چیخی تھی۔ اس نے روتے ہوئے سر گھٹنوں پر ٹکا دیا۔ جتنا وہ کل سے رو رہی تھی اتنا تو وہ ساری زندگی میں نہیں روئی تھی۔ اس کی زندگی میں تین مرد تھے اس کے ابو، اس کے چچا اور ماموں انہوں نے کبھی اسے ڈانٹا تک نہیں تھا اور یہ کیسا شخص تھا جو بات بھی ایسے کرتا تھا جیسے انگارے چبا رہا ہو اور یہ تھپڑ اس کا بایاں گال بری طرح جلنے لگا تھا۔ اچانک فائرنگ کی آواز پر اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔ ڈر کے مارے اس کی جان

نکل رہی تھی لیکن پھر بھی وہ وہاں سے ہل نہیں رہی تھی داؤد کا خوف اس ڈر پر حاوی آگیا تھا۔ مسلسل فائرنگ کی آواز پر اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا کافی دیر گزر گئی تھی خاموشی بھی چھا گئی تھی بھاگتے قدموں کی آواز اس کے قریب آکر رک گئی تھی۔ تہذیب نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جلدی اٹھو، ہمیں چلنا ہے۔" کہہ کر وہ رکا نہیں تھا چند قدموں پر اسے احساس ہوا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں مڑتے ہی اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئی تھیں وہ جہاں تھی وہیں بیٹھی تھی۔

"تمہیں سنائی نہیں دیا۔" وہ اس کے سر پر آکر گرجا تھا۔ تہذیب نے بڑی بے بسی سے سامنے کھڑے داؤد کو اور پھر اپنے پاؤں کو دیکھا تھا اور اس کی نظروں کے تعاقب میں اس کی نظر اس کے زخمی پاؤں پر پڑی تھی۔ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے قریب بیٹھتے ہی تہذیب نے آنکھیں زور سے بند کر لیں اور دوسرے تھپڑ کا انتظار کرنے لگی اور جب کافی دیر تک کوئی آواز نہ آئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اپنی جیب میں سے کچھ نکالنے میں مصروف تھا۔ اچانک اس نے تہذیب کا پاؤں پکڑ کر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا۔ تہذیب درد بھول کر حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی جو بہت غور سے زخمی حصے کو دیکھ رہا تھا۔ داؤد نے پاؤں کے اس حصے کو دبایا تھا جہاں سے خون نکل رہا تھا۔ تکلیف پر تہذیب نے بے ساختہ اپنا پاؤں کھینچا تھا۔ داؤد کی نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھیں جہاں رونے کا پروگرام صاف نظر آرہا تھا۔

"کانچ کا ٹکڑا پاؤں میں ہے، میں نکال رہا ہوں درد ہوگا آواز نہیں آنی چاہیے۔" اس نے ساتھ متنبہ بھی کردیا تھا۔

تہذیب نے اپنے دونوں ہاتھ سختی سے اپنے ہونٹوں پر رکھ لیے تھے۔ اس نے جھٹکے سے وہ ٹکڑا نکالا تھا۔ تکلیف کا ایک احساس تھا جو اس کے سارے جسم میں سرایت کر گیا تھا لیکن سامنے بیٹھے شخص کا ڈر اتنا حاوی تھا کہ اس کی آواز اندر ہی دب کر رہ گئی۔ ٹکڑا نکال کر داؤد نے اس کا چہرہ دیکھا جو دونوں ہاتھ ہونٹوں پر رکھے آنکھیں زور سے میچے بیٹھی تھی اس کے ہونٹوں پر ایک پل کے لیے مسکراہٹ آئی تھی اس کے پیر پر رومال باندھ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔ تہذیب نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی لیکن زخمی پاؤں پر دباؤ پڑتے ہی درد کی لہر سارے وجود میں سرایت کر گئی۔ داؤد کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہوا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں میرے پاؤں میں بہت درد ہو رہا ہے۔ چلا بھی نہیں جا رہا۔" اس کے روہانسے انداز پر داؤد نے غور سے اس کی شکل دیکھی۔ اس کے ماتھے پر زخم تھا جبکہ بائیں رخسار پر چار انگلیوں کے نشان کافی واضح تھے۔

"رونا بند کرو۔" تہذیب نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔

"ہاتھ دو اپنا۔"

"جی!" تہذیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کہہ رہا ہوں ہاتھ دو اپنا، بیٹھی رہنے دو ہاتھ دو۔"

اس کے زور دے کر بولنے پر اس نے بے ساختہ انداز میں اپنا ہاتھ اس کی چوڑی ہتھیلی پر رکھا تھا۔ داؤد نے اسے کھینچ کر کھڑا کیا تھا۔ ابھی وہ ٹھیک طرح سے کھڑی بھی نہیں ہو پائی تھی کہ داؤد نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے کندھے کے گرد پھیلا کر اسے اپنے ساتھ کر کے اپنے سہارے سے چلانا شروع کیا۔ یہ سب اتنا اچانک تھا کہ وہ حیرت کے مارے اس کا منہ دیکھنے لگی لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اپنے گرد پھیلے اس کے بازو کے لمس نے اس کے چہرے کو سرخ کر دیا تھا اس کا سر جھک گیا تھا۔

اس کے موبائل کی بیپ بجی تو اس نے تیزی سے اپنا موبائل نکالا اور اگلے ہی لمحے وہ اس کے گرد پھیلا اپنا دایاں ہاتھ بھی ہٹا چکا تھا اور وہ جو بالکل اس کے سہارے پر تھی توازن برقرار نہ رہنے پر نیچے جا گری اور وہ جو فون سن رہا تھا اس نے مڑ کر دیکھا اسے زمین پر بیٹھا دیکھ کر پہلے تو وہ حیران ہوا پھر سمجھ میں آنے پر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ تہذیب اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر اسے شدید جھٹکا لگا ہوا تھا۔ تہذیب نے غصے سے اپنے زخمی پاؤں کو دیکھا نہ وہ زخمی ہوتی نہ اس کا سہارا لینا پڑتا۔

"پتا نہیں میں کب یہاں سے نکلوں گی کب اس آدمی سے میری جان چھوٹے گی۔"

اس نے سوچنے کے ساتھ سامنے دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ وہ بڑے انہماک سے اس کا جائزہ لے رہا تھا اس کا ورود کہیں ہوا ہو گیا اسے اچانک اپنے حلیے کا احساس ہوا تھا دوپٹہ بھی ندارد تھا اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر انہیں سینے سے لگا لیا اور اضطرابی انداز میں اپنے چہرے کے گرد پھیلے بالوں کو کان کے پیچھے اڑسا اور دوبارہ ڈرتے ڈرتے سامنے دیکھا وہ اب اپنی جیکٹ اتار رہا تھا۔ ڈر کے مارے اس کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ پتا نہیں آج کے دن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کیا فیصلہ کیا تھا۔

ایک مصیبت سے بڑی مشکل سے بچ کر بھاگی تھی اور اب دوسرا امتحان۔ اسے نہیں بھولنا چاہیے تھا وہ بھی ایک مرد ہے۔ داؤد کو اپنی طرف قدم بڑھاتا دیکھ کر اس نے بڑی لاچاری سے اپنے زخمی پاؤں کو دیکھا اور پھر ادھر ادھر اپنے بچاؤ کے لیے کسی چیز کی تلاش کی۔ وہ اس کے بالکل قریب آکر رکا تھا تہذیب کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں۔

"یہ جیکٹ پہن لو۔"

داؤد نے جیکٹ اس کے قریب پھینکی تھی اس نے [illegible] سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اس کے دیکھنے پر اس نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ تہذیب نے جلدی سے اس کی جیکٹ پہن لی تھی۔

"اب ذرا جلدی چلو۔" داؤد نے کہنے کے ساتھ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

"میں خود چل سکتی ہوں۔" اس نے سر جھکا کر دھیمی آواز میں کہا داؤد نے ایک نظر اس کے جھکے سر کو دیکھا اور کندھے اچکا کر چل پڑا۔ اسے کھڑا ہونے کے لیے اپنی پوری ہمت صرف کرنا پڑی تھی لیکن وہ اب داؤد کا سہارا نہیں لینا چاہتی تھی۔ تین قدموں پر اس کی جان آدھی ہو گئی تھی۔ وہ درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

"اگر تمہیں یہ جنگل بسیرا کرنے کے لیے اتنا ہی پسند آگیا ہے تو صاف بتا دو۔ ہمارا ٹائم کیوں ضائع کر رہی ہو۔"

"مجھ سے چلا نہیں جا رہا" کہتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔

"تو کیا کروں۔ اٹھا کر لے جاؤں تمہیں؟" داؤد کی بات پر وہ بوکھلا کر اسے دیکھنے لگی۔

"دیکھو، میں بڑی مشکل سے تمہارے نخرے برداشت کر رہا ہوں اب اگر مزید تم نے کوئی نخرا کیا تو تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔" تب ہی اس کے موبائل پر بیل ہوئی تھی۔

"بولو" داؤد پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

"کیا تکلیف ہے رو کیوں رہے ہو۔ اب آبھی چکو کہ وہیں سونا ہے۔" جواباً حسن بھی اسی انداز میں بولا۔

"آ رہا ہوں۔" داؤد نے موبائل آف کر کے جینز کی جیب میں گھسایا اور تہذیب کی طرف بڑھا اور اگلے ہی پل وہ اس کے بازوؤں میں تھی۔ اس نے سٹپٹا کر داؤد کی طرف دیکھا لیکن وہ سیدھا چلتا جا رہا تھا۔ اس کے ماتھے کی شکنوں کی وجہ سے اس کے الفاظ کہیں اندر ہی رہ گئے، مسلسل خاموشی پر داؤد نے سر جھکا کر اسے دیکھا جس نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ساتھ ساتھ اس کا منہ بھی کھل گیا۔ داؤد نے اس کے تاثرات دیکھے لیکن انہیں نظرانداز کرتے ہوئے وہ گاڑی کے قریب آگیا۔

"اب تم آنکھیں کھول سکتی ہو۔" اس کی دھیمی آواز پر تہذیب نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ داؤد نے اسے نیچے اتار دیا۔ تہذیب سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ نظریں جھکا گئی۔ اب کی بار داؤد نے غور سے اس کے جھکے چہرے کو دیکھا اور اسے نروس دیکھ کر اس نے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

"او ہیلو!" حسن نے اس کے سامنے ہاتھ لہرایا۔
"ہوں!" وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا "بڑی دیر کر دی مہمان آتے آتے۔" حسن نے ایک نظر تہذیب کو دیکھنے کے بعد داؤد کو دیکھا۔
"اس کے پاؤں میں چوٹ لگ گئی تھی۔"
"او آئی سی لگتا ہے کافی گہری چوٹ آئی ہے۔" حسن نے سر سے پیر تک داؤد کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔
"میں اپنی نہیں اس کی بات کر رہا ہوں۔" اب کے داؤد نے غصے سے اسے دیکھا۔
"بچی کہاں ہے؟" "بچی کو خاور کے ساتھ روانہ کر دیا ہے جبکہ ان لوگوں کو بھی تھانے بھجوا دیا ہے۔" ان کے جواب پر وہ سر ہلا کر گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی حسن نے مڑ کر تہذیب کو دیکھا اور اگلے ہی پل اس کے چہرے پر سنجیدگی نمایاں تھی۔ اس نے بڑے غور سے تہذیب کا چہرہ دیکھا جہاں بائیں رخسار پر تھپڑ کے نشان بہت واضح تھے اور ماتھے پر بھی چوٹ کا نشان تھا اس نے بڑے افسوس سے داؤد کی طرف دیکھا جو نظریں چرا گیا تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی کاشف نے کار اسٹارٹ کر دی اور گاڑی کے چلتے ہی تہذیب نے سکون کا سانس لیا۔ گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کاشف تھا' اس کے ساتھ حسن — اور اس سے کچھ فاصلے پر داؤد تھا۔ وہ چاروں ہی خاموش تھے۔ تہذیب نے گردن موڑ کر خود سے کچھ فاصلے پر بیٹھے داؤد کو دیکھا جو کچھ دیر پہلے اس سے بہت قریب تھا اور اب گردن موڑے انجان بھی لگ رہا تھا تب ہی حسن نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
"آپ کا نام کیا ہے؟" تہذیب نے حیرت سے اسے دیکھا لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"تہذیب" وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔
"نائس نیم اور آپ رہتی کہاں ہیں۔"
"لاہور۔"
"ہوں۔" وہ شاید آگے بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا جب داؤد بول پڑا۔

"اگر انٹرویو پورا ہو گیا ہو تو میں کچھ عرض کروں۔"
"بکو۔" حسن نے بڑے شاہانہ انداز میں کہا تھا۔
"اس وقت ہم لاہور نہیں جا سکتے۔ آفس جا کر ان لوگوں کے بیان بھی لینے ہیں تو پھر اس کا کیا کریں؟" وہ تہذیب کے بارے میں ایسے بات کر رہا تھا جیسے وہ یہاں موجود ہی نہ ہو۔
"ظاہر سی بات ہے تہذیب ہمارے ساتھ ہیں تو ہماری ذمہ داری ہے ہمیں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کرنا ہوگا۔"
داؤد نے گاڑی چلاتے کاشف کو دیکھا۔ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر کاشف جلدی سے بولا۔
"سر آپ جانتے ہیں میں اکیلا رہتا ہوں۔" اس سے پہلے کہ وہ حسن سے کہتا وہ بھی بول پڑا۔
"ماما پاپا گھر پر نہیں تمہیں پتا ہے۔ میں بھی اکیلا ہوں ویسے مجھے کوئی پرابلم نہیں تم تہذیب سے پوچھ لو۔"
حسن کی بات پر تہذیب نے گھبرا کر داؤد کو دیکھا کہ پتا نہیں وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔
"آپ میرے ابو کو فون کر دیں وہ مجھے لینے آجائیں گے۔" تہذیب نے ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔
داؤد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ گاڑی ایک بڑے سے گھر کے آگے رکی تھی۔ وہ تینوں — اتر آئے تھے حسن نے بیل بجائی تھی۔ کاشف نے اس کی طرف کا دروازہ کھولا لیکن وہ اپنی دائیں ٹانگ کو حرکت نہیں دے سکی تھی۔ گیٹ کھل چکا تھا اور ایک لڑکا باہر آیا تھا اور اس کے پیچھے ایک خاتون۔
"شکر ہے تم لوگ آگئے۔ رات ایک پل بھی میری آنکھ نہیں لگی۔ طرح طرح کے وہم ستاتے رہے کم از کم بندہ فون ہی کر دیتا ہے۔" وہ خاتون حسن کو دیکھتے ہی شروع ہو گئیں حسن نے ہنس کر ان کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھا تھا۔
"آنٹی آپ پریشان نہ ہوا کریں آپ جانتی ہیں یہ سب تو ہماری ڈیوٹی کا حصہ ہے۔"
"اچھا اب اندر چلو کہ باہر ہی کھڑے رہنا ہے۔"

حسن نے داؤد کی طرف دیکھا تھا اور داؤد نے کار کی طرف دانیال اور قمر دونوں نے ان کے تعاقب میں دیکھا اور تہذیب کو دیکھ کر دونوں ہی حیران ہوئے تھے۔
"یہ!" قمر بیگم صرف اتنا ہی کہہ سکی تھیں۔
"مما! اسے اندر لے جائیں۔ باقی باتیں بعد میں کرتے ہیں۔"
قمر بیگم باہر آگئی تھیں' انہوں نے تہذیب کو گاڑی سے نکالا اور سہارا دے کر اندر لائی تھیں۔
"دانیال! دیکھو اگر انکل ہاشمی گھر ہوں تو انہیں بلا لاؤ۔" داؤد کے کہنے پر دانیال اور قمر بیگم پریشانی سے اسے دیکھنے لگے۔
"داؤد! تمہیں چوٹ لگی ہے۔" قمر نے بڑی بے چینی سے اس کا جائزہ لیا۔
"میں ٹھیک ہوں مما! اس کے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔" قمر اسے دیکھنے لگیں جبکہ دانیال باہر نکل گیا۔ قمر بیگم اس کے قریب بیٹھ گئی تھیں اور اس کی چوٹوں کو دیکھ رہی تھیں۔
"کیسے لگیں بیٹا!" قمر کے سوال پر تہذیب نے سامنے بیٹھے داؤد کو دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"مما! میں آپ کو بتا دوں گا۔ کچھ ناشتے کا بندوبست کر دیں۔" قمر نے ایک نظر داؤد کو دیکھا اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ کمرے میں اس وقت صرف وہ دونوں تھے کاشف تو کار لے کر چلا گیا تھا اور حسن بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تہذیب نے جھکا سر اٹھا کر دوبارہ داؤد کی طرف دیکھا جو آنکھیں بند کیے صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے کیسے بلائے آخر اپنی پوری ہمت مجتمع کر کے اس نے اسے پکارا تھا۔
"سنیے۔" داؤد نے گردن سیدھی کر کے اسے دیکھا۔
"مجھے گھر فون کرنا ہے وہ پریشان ہوں گے۔" داؤد گہرا سانس لے کر کھڑا ہوا اور کارڈلیس اس کی طرف بڑھا یا اور خود باہر نکل گیا۔ نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔

دوسری طرف بیل کی آواز جا رہی تھی اور پھر کاشف کی آواز سنائی دی تھی۔ آنسوؤں کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ بڑی مشکل سے اس نے ہیلو بولا تھا۔
"تہذیب!" کاشف چیخی تھی۔ "ابو امی دیکھیں تہذیب کا فون ہے۔"
کاشف خوشی کے مارے چیخنے لگی تھی اصغر صاحب نے فون کاشف کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔
"تہذیب! میری بچی! کہاں ہو تم؟ تم ٹھیک تو ہو؟"
"ابو!" وہ ان کی آواز سنتے ہی پھر بے چین ہو گئی تھی۔ اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔ کسی نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا تھا تہذیب نے نظریں اٹھا کر دیکھا داؤد اس کے سر پر کھڑا خشمگیں نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔
"السلام علیکم۔ میں اسلام آباد سے ایس ایس پی داؤد احمد بات کر رہا ہوں۔ آپ کی بیٹی تہذیب ہمارے پاس خیریت کے ساتھ موجود ہیں۔ ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے انہیں کچھ چوٹیں آئی ہیں جس کی وجہ سے وہ فوراً ٹریول نہیں کر سکتیں۔"
دوسری طرف سے ابو نے کچھ کہا تھا کہ وہ خاموش ہوا تھا۔
"میں آپ کی پریشانی سمجھ سکتا ہوں لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اس وقت میری فیملی کے ساتھ ہیں۔ نو پرابلم۔ اٹس مائی جاب اوکے آپ ایڈریس نوٹ کرلیں۔"
ایڈریس لکھوا کر اس نے فون تہذیب کی طرف بڑھایا لیکن اس نے بات کیے بغیر فون آف کر دیا تھا داؤد وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔
"میں نے تمہارے فادر کو ڈیٹیل Detail نہیں بتائی کیونکہ دور بیٹھے وہ زیادہ پریشان ہوں گے شام تک وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔"
وہ کچھ نہیں بولی تھی اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے ابھی تک اس کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس میں اس کا نازک سا وجود بالکل چھپ گیا تھا۔

چہرے پر جابجا زخموں کے نشان تھے اور وہاں سے اس کی نظر۔ پاؤں تک گئی۔ اس کا بایاں پاؤں بری طرح سوجا ہوا تھا اور اس کا باندھا ہوا رومال سرخ ہو چکا تھا۔ وہ مرد ہو کر تھک گیا تھا تو وہ نازک لڑکی تھی اور جس طرح وہ نڈھال بیٹھی تھی داؤد کو نہ جانے کیوں اسے یوں دیکھ کر تکلیف ہو رہی تھی اس سے پہلے وہ اسے کچھ کہتا دانیال ڈاکٹر ہاشمی کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا اور اس کے پیچھے حسن۔

"ہاں بھئی جوان کسے چوٹ لگی ہے؟" ڈاکٹر ہاشمی نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"انکل! یہ ہماری کزن ہے۔ اس کو چوٹیں آئی ہیں۔" داؤد نے تہذیب کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں بھئی بیٹا کہاں چوٹ لگی ہے۔" انہوں نے تہذیب کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا۔

"اوہ کافی چوٹیں آئی ہیں۔" انہوں نے ماتھے کی چوٹ اور ـــــ پاؤں کی چوٹ کا جائزہ لے کر کہا۔ انہوں نے اس کے پاؤں پر بندھا رومال کھول کر زخم کا جائزہ لیا۔

"زخم تو کافی گہرا لگتا ہے۔" پھر انہوں نے دوبارہ ماتھے کی طرف دیکھا "یہاں سے شروع کرتے ہیں۔" انہوں نے کاٹن پر لیکوڈ لگا کر زخم پر لگایا تو شدید جلن کا احساس اس کے ماتھے پر جاگا تھا اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ہاشمی صاحب ہلکی پھلکی باتیں کر کے اس کا ذہن بٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ قمر بیگم بھی چائے لے کر لاؤنج میں آگئیں۔

"ہماری بچی تو بہت بہادر ہے۔" اس کے پاؤں کی بینڈیج کرنے کے بعد انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"آپ کے پاؤں میں سوجن بہت زیادہ ہے اور زخم بھی تازہ ہے اس لیے کوشش کریں کہ پاؤں پر دباؤ نہ پڑے۔"

انہیں انجکشن تیار کرتا دیکھ کر تہذیب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اس نے بے ساختہ انداز میں قریب کھڑی قمر بیگم کا بازو تھام لیا۔

"مجھے انجکشن نہیں لینا۔" اس کے روہانسے انداز پر حسن اور دانیال کی ہنسی نکل گئی تھی جبکہ داؤد نے خشمگیں نظروں سے انہیں گھورا۔

"بیٹا یہ ضروری ہے۔ ورنہ انفیکشن کا خطرہ ہے۔" تہذیب نے نظر اٹھا کر باری باری سب کا چہرہ دیکھا۔ داؤد کی پہنی ہوئی جیکٹ کے بازو اتنے کھلے تھے کہ وہ آسانی سے اوپر ہو گئے تھے۔ صرف ایک پل کی چبھن کا احساس تھا اور پھر جیسے سب ٹھیک ہو گیا۔

"بس اتنی سی بات تھی۔" ڈاکٹر ہاشمی اسے یوں ٹریٹ کر رہے تھے جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو۔

"بھائی صاحب! ناشتہ کرتے جائیں۔"

"نہیں بھابھی! ہسپتال کا ٹائم ہو گیا ہے۔" وہ حسن اور داؤد سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گئے۔

"آجاؤ تم لوگ بھی ناشتا کر لو۔" اور انہیں بھوک تو واقعی لگی تھی۔ وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل کی طرف آ گئے۔

"مما! اسے بھی ناشتہ کرا دیں۔ اس نے بھی کچھ نہیں کھایا۔" داؤد نے کھاتے ہوئے سرسری انداز میں کہا تھا لیکن حسن نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"پہلے مجھے یہ بتاؤ یہ ہے کون؟" آخر انہوں نے وہ سوال پوچھ ہی لیا جو مسلسل دو گھنٹوں سے انہیں پریشان کر رہا تھا۔ حسن نے انہیں ساری بات بتائی تھی۔ قمر بیگم نے بڑے افسوس سے سرہلایا۔

"بیچاری بچی شکر ہے جان بچ گئی ورنہ ایسے ذلیل لوگوں کا کیا بھروسا ہوتا ہے۔ اتنے گھٹیا لوگ تھے ورنہ اتنی پیاری بچی سے کوئی ایسا سلوک کرتا ہے۔ بے چاری کو کتنی چوٹیں لگی ہیں حتی کہ اس کو تھپڑ بھی مارا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے آنٹی' بڑا گھٹیا اور ذلیل انسان ہی ہو سکتا ہے جو اتنی نازک سی لڑکی پر ہاتھ اٹھائے۔" حسن نے بڑے مزے سے داؤد کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔

"مما میں سونے جا رہا ہوں۔ آپ اسے کچھ کھلا دیجیے گا۔" وہ ایک دم کھڑا ہوا تھا۔

"آنٹی میں بھی جا رہا ہوں۔" حسن جلدی سے اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگا ورنہ اس کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ اسے کمرے میں گھسنے نہ دیتا اور اسے گھر جانا پڑتا۔ وہ لاؤنج میں آئیں تو دانیال اس کے قریب بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی ان کے قریب آ گئیں۔ وہ جو ناشتے کے لیے چیزیں اس کے آگے رکھ کر گئی تھیں وہ یونہی رکھی تھیں۔

"بیٹا آپ نے کچھ کھایا نہیں۔"

"آنٹی! مجھے بھوک نہیں۔" اور واقعی اس کی بھوک جیسے مر گئی تھی۔

"نہیں بیٹا ایسے کیسے چلے گا تھوڑا سا تو کھاؤ۔ چلو شاباش۔" وہ خود اس کے قریب بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگیں۔ ان کا انداز اتنا شفقت بھرا تھا کہ وہ آرام سے دو سلائس کھا گئی تھی۔

"تھوڑی دیر سو جاؤ۔" اس کی بند ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر وہ بولیں تو اس نے سر ہلا دیا کیونکہ اسے واقعی نیند آ رہی تھی شاید انجکشن کا اثر تھا۔ وہ اسے سہارا دے کر ایک کمرے میں لے آئیں۔

"تم ہاتھ لینا چاہتی ہو؟" ان کے پوچھنے پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو کپڑے بدل دو میرے کپڑے تمہیں کھلے تو ہوں گے لیکن مجبوری ہے۔" ان کے کہنے پر وہ مسکرا دی تھی۔ اسے کپڑے پکڑا کر وہ باہر چلی گئی تھیں۔ جیکٹ اتار کر کتنی دیر تک وہ اسے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے اسے بیڈ پر رکھ دیا اس نے نظریں گھما کر دیکھا تو اسے ایک اور دروازہ نظر آیا جو یقیناً "واش روم" تھا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی زخم پھر درد دینے لگے تھے کچھ دیر تو وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی لیکن پھر نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو ہی گئی تھی۔

وہ گہری نیند میں تھی لیکن کوئی ایسا احساس تھا جس نے اسے آنکھ کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھ گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا پھیلا تھا۔ وہ نہ سمجھنے والے انداز میں سامنے دیوار کو دیکھنے لگی۔ دروازے پر ہونے والی دستک پر اس نے چونک کر دروازے کو دیکھا۔ تیسری دستک کے بعد دروازہ کھل گیا تھا اور قمر بیگم اندر داخل ہوئی تھیں۔

"اٹھ گئیں بیٹا!" وہ اس کے قریب آ کر بولیں تو وہ مسکرا دی۔

"آپ کے ابو آئے ہیں۔" اس نے ان کی طرف ایسے دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو۔ وہ تیزی سے بیڈ سے اترنے لگی تھی لیکن بایاں پاؤں زمین پر رکھتے ہی وہ کراہ کر وہیں بیٹھ گئی۔ قمر بیگم نے جلدی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکا۔

"تم بیٹھو۔ میں انہیں یہیں لے آتی ہوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئی تھیں۔ وہ دونوں مٹھیاں بھینچے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ ان سے آرام سے بات کرے گی رو کر انہیں پریشان نہیں کرے گی اس کے برعکس اس کی آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی اصغر صاحب اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے تھے وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

"تہذیب!" انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس کا صبر کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔ وہ ان کے گلے لگ کر روئی تھی۔ اتنا روئی تھی کہ وہ ضبط کے باوجود خود بھی رو پڑے تھے۔ قمر بیگم جو چائے کا پوچھنے آئی تھیں ان کو یوں روتا دیکھ کر وہیں رک گئیں لیکن کافی دیر تک جب وہ چپ نہ ہوئے تو انہیں آگے بڑھنا پڑا۔

"بس بیٹا چپ کر جاؤ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے اور آپ یوں روؤ گی تو آپ کے ابو بھی پریشان ہوں گے۔" وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے بولیں تو اصغر صاحب نے اپنے آنسو صاف کر کے اس کا چہرہ صاف کیا۔ اس کا چہرہ صاف کرتے انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تو ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ تہذیب نے چہرہ صاف کر کے اصغر صاحب کی طرف دیکھا تو نظر ان کے پیچھے کھڑے مانی سے ٹکرا گئیں۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرا دی تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" اصغر صاحب کے سوال پر اس نے مانی پر سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

اور پھر جو ہوا تھا۔ اس نے سب انہیں بتا دیا تھا۔ وہ کوئی غیر تو نہیں تھے کہ ان سے کچھ چھپایا جاتا۔ ساری باتیں سن کر اصغر صاحب کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔ کتنی دیر یونہی سر جھکائے بیٹھے رہے۔

"تایا جی! چلیں!" مانی کی آواز پر ان تینوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ایس ایس پی صاحب سے ملاقات ہو سکتی ہے؟" اصغر صاحب نے قمر بیگم کو دیکھا۔

"وہ کچھ دیر پہلے پولیس اسٹیشن گیا ہے۔"

"اوہ!" اصغر صاحب نے افسوس سے سر ہلایا۔

"میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ شکریہ کا لفظ تو بہت چھوٹا ہے۔ جو انہوں نے میری بیٹی کے لیے کیا اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر دے آپ بہت خوش قسمت ہیں جو اتنے بہادر اور نیک بیٹے کی ماں ہیں۔" تہذیب نے چونک کر اپنے باپ کا چہرہ دیکھا اسے نہ جانے کیوں اپنے باپ کے لہجے میں بیٹے کی محرومی کا احساس ہوا تھا۔

"بھائی صاحب رات ہونے والی ہے اور تہذیب کو ڈاکٹر نے زیادہ چلنے سے منع کیا ہے۔ آج آپ یہیں رک جائیں میں داؤد کو بھی فون کر دیتی ہوں اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"میں بہت معذرت چاہتا ہوں بہن! تہذیب کی ماں کی طبیعت کافی خراب ہے۔ اسے پہلے ہی وہم تھا پھر تہذیب کے نہ پہنچنے پر اس کی طبیعت کافی خراب ہو گئی ہے۔"

تہذیب نے پریشان ہو کر اپنے باپ کا چہرہ دیکھا۔ تہذیب خود بھی ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر میں داخل ہوا تو دانیال اور قمر بیگم ٹی وی دیکھ رہے تھے وہ سلام کرتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کی متلاشی نظروں نے ارد گرد کا جائزہ لینا شروع کر دیا ہے۔

"اس کے فادر آئے تھے میں نے تمہارے موبائل پر فون بھی کیا تھا پر آف تھا۔ اس کی گمشدگی پر اس کی ماں کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے وہ جلدی نکل گئے۔ تمہارا بہت شکریہ ادا کر رہے تھے۔"

کہنے کے بعد انہوں نے داؤد کا چہرہ دیکھا جو سر جھکائے زمین کو گھور رہا تھا۔

"داؤد!" ان کے پکارنے پر وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا ہے کوئی پریشانی ہے؟"

"نہیں تو۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے بالوں کو سنوارا تھا۔

"پھر تم اس کے جانے کا سن کر پریشان کیوں ہو گئے ہو کہیں کیس کے سلسلے میں اس کی ضرورت تو نہیں تھی؟"

"نہیں اس کا بیان تو لے لیا تھا وہ بس۔۔۔ بس بس رہا تھا اس کی کنڈیشن ابھی تو نہیں تھی کہ وہ سفر کرتی۔" ٹی وی دیکھتے دانیال نے غور سے داؤد کی طرف دیکھا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ پر میں کیا کہہ سکتی تھی بچی اس کو جانا تو تھا ہی۔" قمر بیگم کے کہنے پر وہ گہرا سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

"کھانا لاؤں؟"

"نہیں مجھے بھوک نہیں آپ کھا لیں۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ فائل ڈھونڈتے ہوئے اس کمرے میں آیا تھا جو گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ سائیڈ ٹیبل کی دراز بند کر کے وہ جونہی مڑا اس کی نظر بیڈ کی سائیڈ پر رکھی اپنی جیکٹ پر پڑی وہ بے ساختہ اس کو اٹھانے کے لیے جھکا تھا۔ جیکٹ کو ہاتھ میں لیتے ہی ایک عجیب سے احساس نے اسے اپنے حصار میں لیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اس کے بازوؤں کے حصار میں ہے اس نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں اور وہ چہرہ اس کے سامنے تھا بالکل واضح حالانکہ اس کو یقین تھا اس نے اسے اتنے دھیان سے نہیں دیکھا لیکن وہ پوری خوب صورتی کے ساتھ اس کے تصور کے جہاں میں آباد تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دوبارہ جیکٹ کو دیکھا جیکٹ کو تہہ کرتے وقت اسے آواز سنائی دی تھی اور اس نے الجھ کر جیکٹ کو دیکھا اور ہاتھ جیب میں ڈالا اگلے ہی پل اس کی ہتھیلی پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ وہ مسکرا کر انہیں دیکھتا رہا اور کسی متاع کی طرح اسے دوبارہ کوٹ کی جیب میں رکھ دیا۔ آہٹ پر اس نے دروازے کی طرف دیکھا جہاں قمر بیگم کھڑی تھیں۔

"تم یہاں ہو میں تمہیں تمہارے کمرے میں ڈھونڈ رہی تھی۔"

"خیریت؟" وہ جیکٹ دائیں بازو پر ڈال کر بولا۔

"ہاں خیریت ہی ہے وہ میجر حامد کا فون آیا تھا انہوں نے واضح بات تو نہیں کی لیکن میرا خیال ہے وہ جواب جاننا چاہتے ہیں تاکہ کوئی رسم کر سکیں۔"

اور داؤد کی چہرے پر بے بسی کی جانے والی کیفیت وہ دیکھ رہی تھیں۔

"تو پھر کیا جواب دوں انہیں۔"

"مما آپ انہیں منع کر دیں۔"

"کیوں؟" وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

"پتا نہیں۔" وہ اکتا کر بولا۔

"یہ تو کوئی وجہ نہیں۔"

"مما ابھی رہنے دیں مجھے ابھی بہت ضروری کام سے جانا ہے۔"

"اچھا رکو تو یہ جیکٹ تو دیتے جاؤ۔ دھلوا کر رکھ دوں گی۔"

"نہیں۔" وہ جلدی سے بولا "ایسے ہی ٹھیک ہے۔" اس کے نظریں چرانے پر وہ حیران ہو کر اسے جاتا دیکھنے لگیں اس کے جانے کے بعد انہوں نے بات کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر کچھ خیال آنے پر جیب میں ہاتھ ڈالا تو اندر سے کانچ کے ٹکڑے نکلے۔ کتنی دیر تک وہ حیرت سے ان ٹکڑوں کو اور کوٹ کو دیکھتی رہیں اور آخر میں ان کے چہرے پر جو مسکراہٹ آئی تھی وہ بہت خوب صورت اور معنی خیز تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کی لائف سیدھی سادی تھی۔ کسی لڑکی کا اس سے جڑے کسی خیال کا کوئی گزر نہ تھا۔ پیار محبت کا تو وہ سرے سے قائل نہیں تھا۔

ابھی کچھ دن پہلے ہی تو مما نے اسے نورین سے ملوایا تھا اچھی تھی اور تقریباً ویسی جیسی اسے چاہیے تھی۔ ایجوکیٹڈ میچور کانفیڈنٹ لیکن وہ کانفیڈنٹ ہونے کے ساتھ ساتھ بولڈ بھی بہت زیادہ تھی۔ نہ بہت جھینپو نہ ڈرپوک نہ بات بات پر رونے والی ایسی لڑکیاں اسے بالکل پسند نہ تھیں۔ جبکہ تہذیب میں یہ ساری باتیں موجود تھیں۔ وہ شرمیلی بھی تھی۔ ڈرپوک بھی تھی۔ رونے کی تو شوقین بھی بہت تھی اور کم عمر بھی تھی پھر ایسا کیوں ہوا کہ وہ اسے اچھی لگنے لگی بلکہ وہ جو اس کے لیے محسوس کر رہا تھا وہ احساس پسندیدگی سے کچھ بڑھ کر تھا۔ دروازہ دھڑ سے کھلا تھا اور اس نے آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں حسن کھڑا تھا اسے دیکھ کر وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

"یہ اندھیرے کمرے میں بجھے ہوئے چراغ کی طرح کیوں پڑے ہو۔" داؤد نے غصے سے اسے گھورا۔

"کیوں میں اکیلا نہیں بیٹھ سکتا۔"

"اکیلے بیٹھ کر کسے یاد کیا جا رہا ہے۔"

"تمہیں۔" داؤد نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"اوہ میں بھی کہوں تم سے ملنے کے لیے دل کیوں اتنا بے قرار ہو رہا ہے۔"

"کام کی بات کرو۔"

"تم نے شادی کے لیے منع کیوں کیا؟"

"کیونکہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"شادی ہی نہیں کرنا چاہتے یا نورین سے نہیں کرنا چاہتے؟" اب کے داؤد نے آنکھیں کھول کر اسے

دیکھا جو محظوظ سی ––– مسکراہٹ چہرے پر لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا اس کی وجہ تہذیب ہے؟" حسن کی بات سن کر داؤد اچھل پڑا تھا اور اس کے چہرے پر آنے والے تاثرات پر حسن بھی حیران رہ گیا تھا۔ اس نے تو ایسے ہی تکا لگایا تھا۔

"تم!" حسن کی تم میں حیرت ہی حیرت تھی۔ "یہ کب ہوا کیسے ہوا اور مجھے کیوں پتا نہیں چلا؟" اور حسن کے سوالوں کے جواب تو خود اس کے پاس بھی نہیں تھے۔

"پتا نہیں۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"لیکن یار تہذیب تو بہت ڈفرنٹ ہے۔ جس طرح کی لڑکی تمہیں پسند تھی تو پھر یہ ––" حسن رک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا اور پھر اسے خاموش دیکھ کر مسکرا دیا۔

"بڑے صحیح کہتے ہیں دل آئے گدھی پر تو حور کیا چیز ہے۔"

"شٹ اپ حسن!" تہذیب کو گدھی کہنے پر داؤد نے اسے غصے سے گھورا تھا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" حسن نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"تو مجھے محترمہ تہذیب بھابھی کی شان میں گستاخی نہیں کرنی چاہیے۔" اب کی بار داؤد مسکرا دیا تھا۔

"واقعی تمہارے حسن سلوک کا بہترین نمونہ اس کے دائیں گال پر میں دیکھ چکا ہوں۔" حسن نے جیسے اس کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔

"فکر نہ کرو یار! اگر نہ مانی تو اسے اٹھا کر لے آئیں گے۔ آخر پولیس میں ہونے کا کچھ تو فائدہ ہو۔" حسن کے کہنے پر اس کی ہنسی نکل گئی تھی۔

دستک کے بعد دروازہ کھلا تھا اور قمر بیگم کے ساتھ دانیال اندر داخل ہوا تھا۔

"مبارک ہو آنٹی! آپ کا شک بالکل صحیح تھا۔" قمر بیگم بے تحاشا خوش ہو گئی تھیں۔ انہوں نے داؤد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار کیا تھا۔

"پگلے مجھے تو بتانا تھا۔ خیر ابھی بھی دیر نہیں ہوئی میں تہذیب کے گھر والوں سے بات کرتی ہوں۔ میرے بیٹے کا گھر جتنی جلدی آباد ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"آپ کے پاس تہذیب کا نمبر ہے؟" حسن نے پوچھا۔

"ہاں جاتے ہوئے میں نے اس سے نمبر لے لیا تھا۔" حسن نے بے ساختہ انہیں داد دی تھی۔

قمر بیگم تہذیب کے گھر کا نمبر ملا رہی تھیں۔ دانیال اور حسن ان کے اردگرد بیٹھ گئے تھے جبکہ وہ ان سے کچھ فاصلے پر بے نیاز ظاہر کرتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہا تھا لیکن اس کے سارے احساسات فون پہ ہونے والی گفتگو کی طرف تھے۔ فون تہذیب کی بہن نے اٹھایا تھا۔ سلام دعا کے بعد قمر بیگم نے تہذیب کو بلانے کو کہا تھا۔ داؤد کو نہ جانے کیوں اپنی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ ایک میچور آدمی تھا نو عمر لڑکا نہیں تھا لیکن دل کی حرکتیں نو عمر لڑکیوں جیسی تھیں حسن نے اسپیکر آن کر دیا تھا اور کچھ دیر بعد اس نے تہذیب کی ہیلو سنی تھی وہ پہلی بار تہذیب کی آواز فون پر سن رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اسے پہچان لیا تھا۔

"کیسی ہو بیٹا! میں داؤد کی ممی بات کر رہی ہوں۔"

"میں ٹھیک ہوں آنٹی! آپ کیسی ہیں۔"

"ٹھیک ہیں ہم سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے داؤد کی طرف دیکھا۔

"میں بھی آپ کو بہت یاد کرتی ہوں۔" داؤد کو لگا جیسے وہ رو پڑی ہے۔ اس نے نظریں گھما کر قمر بیگم کی طرف دیکھا۔

"تو پھر ملنے آجاؤ۔" قمر بیگم کے کہنے پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ اس کی خاموشی پر قمر بیگم نے بات بدل دی۔

"تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔ زخم ٹھیک ہوئے؟"

"جی۔" بڑا مختصر سا جواب آیا تھا۔

"گھر میں سب ٹھیک ہیں آنٹی؟" کچھ دیر بعد اس کی جھجکتی ––– ہوئی آواز پر حسن نے اس پر کشن کھینچ کر مارا تھا۔

"دانیال کے بارے میں پوچھ رہی ہو یا داؤد کے بارے میں؟" قمر بیگم کے سوال پر داؤد کے حواس الرٹ ہو گئے تھے۔

"کس کا فون ہے تہذیب؟" اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتی مردانہ آواز سنائی دی تھی "ابو اسلام آباد سے آنٹی کا فون ہے۔"

"اچھا مجھے فون دو۔ مجھے ضروری بات کرنی ہے۔" ان کی آواز بہت واضح ان چاروں کو سنائی دے رہی تھی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام کیسے ہیں بھائی صاحب۔"

"الحمد اللہ میں آپ لوگوں کو ہی فون کرنے والا تھا۔"

"خیریت تھی؟" قمر بیگم پریشانی سے بولیں۔

"جی خیریت ہے بلکہ خوشی کی بات ہے تہذیب کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔ آپ کو کارڈ تو بھیجیں گے لیکن میں خود بھی آپ کو اطلاع کرنا چاہتا تھا۔" داؤد کو لگا اس کے کان کے پاس دھماکا ہوا ہے۔ اتنا شدید کہ اچانک اردگرد ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ ان تینوں نے ایک ساتھ داؤد کی طرف دیکھا تھا۔

"تہذیب کی شادی!" وہ بمشکل اتنا کہہ سکی تھیں۔

"جی میرے بھتیجے عمران سے منگنی کو تو کافی سال گزر گئے ہیں۔ آپ سب ضرور آیئے گا اور داؤد صاحب کو بھی لایئے گا۔"

"جی!" قمر بیگم نے بمشکل دو تین جملے بولے اور فون رکھ دیا۔ وہ سب خاموشی سے داؤد کو دیکھنے لگے۔ وہ اتنا کمزور نہیں تھا کہ یوں بکھر جاتا خود کو کمپوز کرنے میں اسے کچھ وقت لگا تھا لیکن اس نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر انہیں دیکھا۔

"کیا ہوا، آپ لوگ خاموش کیوں ہو گئے ہیں۔" اس کے پوچھنے پر بھی وہ تینوں یونہی خاموش رہے تو وہ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

"جو ہم سوچ رہے ہیں ضروری تو نہیں کہ دوسرا بھی ویسا سوچے اور دنیا صرف تہذیب پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔" پتا نہیں اس نے ان کو تسلی دی تھی یا خود۔

"اب ایسے اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"داؤد!" وہ پلٹنے لگا تھا جب قمر بیگم کی آواز پر رک گیا۔

"تمہیں افسوس نہیں ہوا؟"

"اگر ہوا بھی تو کیا ہو سکتا ہے مما!" کہہ کر وہ باہر نکل گیا تھا جبکہ وہ تینوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

☼ ☼ ☼

اسے گھر آئے ایک ماہ ہو چلا تھا اور اس دوران اس نے محسوس کیا۔ زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ اب تک وہ جو گزارتی آئی ہے وہ تو ایک خواب تھا سہانا خواب زندگی کیا ہوتی ہے۔ اپنی پوری حقیقت اور تلخیوں کے ساتھ اس ایک ماہ میں سامنے آئی تھی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ کسی کو پتا نہیں تھا اس کے ساتھ کیا ہوا۔ سوائے گھر والوں کے۔ لیکن کبھی کبھی اپنے غیروں سے بھی بڑھ کر برے ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے پتا ہوتا کہ اس کی جان کوئی اس کے لیے اتنی مصیبت بن جائے گی تو وہ کبھی مانی کو بھی اس راز میں شریک نہ کرتی۔ اس نے تو اپنا سمجھ کر کچھ نہیں چھپایا تھا اسے مانی پر یقین تھا وہ اس کا بچپن کا ساتھی تھا وہ تو اسے سمجھتا تھا۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن چچی آکر جس طرح زبان کے تیر چلا کر جاتی تھیں وہ کتنے دن تک نڈھال رہتی تھی۔

چچی کا جو رویہ اس کے ساتھ تھا وہ اسے اندر ہی اندر سہما جاتا تھا۔ اب جب کہ شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہو گئی تھی کوئی خوشی اس کے دل کے اندر نہیں جاگی تھی۔ عجیب سی پریشانی گھبراہٹ ہر وقت اسے اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی تھی۔ اسکول کی جاب اس نے چھوڑ دی تھی لوگوں سے ملنا اس نے بند کر دیا تھا۔ وہ جو ہر وقت چہکتی پھرتی تھی اس کی ہنسی کہیں کھو سی گئی تھی۔ اگر وہ کسی جگہ پر بیٹھتی تھی تو گھنٹوں وہاں ساکت بیٹھی رہتی۔ زبیدہ بیگم جو اس کی شرارتوں سے نالاں

رہتی تھیں اب اسے دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں۔ وہ اس کی ایک کھلکھلاتی ہنسی سننے کے لیے ترس گئی تھیں۔

"امی! یہ چائے۔" کشف کی آواز پر انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کیا سوچ رہی ہیں امی؟" کشف نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا جو کافی پریشان لگ رہی تھیں۔

"میں تہذیب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب سے واپس آئی ہے بہت چپ چاپ رہنے لگی ہے۔ پتا نہیں سارا دن کیا سوچتی رہتی ہے۔ میں اسے یوں گم صم دیکھتی ہوں تو بہت پریشانی ہوتی ہے۔" بات کرتے کرتے ان کی آواز بھرا گئی۔

"امی آپ یوں پریشان ہوں گی تو تہذیب کو حوصلہ کون دے گا۔ آپ کو پتا ہے وہ کیسے حالات سے گزر کر آئی ہے۔ ابھی ڈری ہوئی ہے۔ اس وقت کو ان باتوں کو بھلانے میں اسے کچھ وقت تو لگے گا۔ پھر کچھ دنوں تک اس کی شادی ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" کشف نے تسلی دینے والے انداز میں ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہی تو پریشانی والی بات ہے۔ کچھ دنوں تک اس کی شادی ہے لیکن کوئی خوشی کوئی رونق اس کے چہرے پر نہیں۔ مرجھا کر رہ گئی ہے۔ سعدیہ کا تو تمہیں پتا ہے اتنی فضول باتیں کرتی ہے میں صرف غصے سے کھول کر رہ جاتی ہوں۔ اسے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔ اس حادثے میں میری بچی کا کیا قصور ہے۔ حالات کی چکی میں بھی تو وہی پس رہی ہے تمہارے باپ کو منع بھی کیا تھا۔ اتنی جلدی شادی کی ڈیٹ فکس نہ کریں۔ ابھی بچی اس حادثے سے سنبھلی نہیں، لیکن نہیں، میری آج تک انہوں نے سنی ہے جو اب سنیں گے پہلے بھی میں نے اتنا منع کیا تہذیب کو نہ بھیجیں لیکن تب بھی میری نہیں مانی۔ بھگت رہے ہیں۔ اب بھی اپنی من مانی۔"

"امی! آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی فون کی بیل پر کھڑی ہو گئی۔

"کس کا فون تھا؟" زبیدہ نے کشف کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پتا نہیں کوئی بولتا ہی نہیں آج کل مس کالز بہت آرہی ہیں۔" اس نے کہہ کر اپنا چائے کا کپ اٹھا لیا۔

"پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔" زبیدہ بیگم خود کلامی کے انداز میں بولیں۔

"کشف داؤد کو فون کرکے بتاؤ کہ یوں مس کالز آرہی ہیں۔"

"امی! یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں کہ ان کو تکلیف دی جائے۔ رانگ کالز آجاتی ہیں۔"

"لیکن میرا دل گھبرا رہا ہے۔ چار دن بعد گھر میں شادی ہے میں نہیں چاہتی مزید کچھ برا ہو تم فون کرو۔"

"اچھا!" وہ فون کی طرف بڑھ گئی دوسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"ایس ایس پی داؤد اسپیکنگ۔"

"السلام علیکم! میں کشف بات کر رہی ہوں۔ تہذیب کی سسٹر۔"

"جی کیسی ہیں آپ سب خیریت ہے؟"

"جی سب ٹھیک ہے وہ بس ایک چھوٹی سی پرابلم تھی ہمارے گھر کئی دنوں سے مس کالز آرہی ہیں فون اٹھاؤ تو کوئی بولتا نہیں۔ ہم نے تو نوٹس نہیں لیا لیکن امی پریشان ہو گئی ہیں انہوں نے کہا کہ آپ کو بتا دوں۔"

"ہوں!" کچھ دیر بعد اس نے ہنکارا بھرا تھا۔

"نمبر کیا ہے؟"

"نمبر ہر بار مختلف ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر بھی آپ مجھے نوٹ کروا دیں۔"

کشف ID سے دیکھ کر لکھواتی جا رہی تھی۔

"ویسے پرابلم والی تو کوئی بات نہیں۔"

"نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔" داؤد کی تسلی پر وہ مسکرا دی۔

"بہت بہت شکریہ دراصل چار دن بعد تہذیب کی شادی ہے تو ہم چاہتے ہیں خوش اسلوبی سے سب کام

بالکل ویسے آپ کو شادی کا کارڈ مل گیا۔"

"جی!" کافی دیر بعد وہ بولا تھا۔

"تو آپ آرہے ہیں نا۔"

"اگر ضروری کام نہ ہوا تو شاید! اور کشف! انفارم کرنے کا شکریہ۔ میں انویسٹی گیٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور آپ بھی محتاط رہیں اور اگر کچھ ایسی ویسی بات ہوتی ہے تو میرا موبائل نمبر ہے نا آپ کے پاس۔ مجھے فوراً انفارم کردیں اللہ حافظ۔"

فون رکھ کر اس نے کرسی کی بیک سے ٹیک لگا لی۔

"کس کا فون تھا؟" حسن کے پوچھنے پر وہ سیدھا ہو گیا۔

"تہذیب کی بہن کا۔"

"او، تو سالی صاحبہ کا فون تھا۔" حسن کے مذاق پر اس نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا تو حسن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اس بار کا کچھ پتا چلا؟"

"ہاں اطلاع ملی ہے کہ وہ آج کل لاہور میں ہے۔" وہ چونک کر حسن کو دیکھنے لگا۔

"اس کے ٹھکانے کا پتا کرو ہمیں اسے ہر حال میں گرفتار کرنا ہے۔" حسن نے ایک نظر اس کے سخت چہرے کو دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو کیا ہو رہا ہے۔" عمران نے تہذیب کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہیلو!" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"تم کب آئے؟" "تب ہی جب تم کسی کی یادوں میں گم تھیں" اس کے طنز میں ڈوبی آواز پر تہذیب نے اس کی شکل دیکھی جو کھوجتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مانی! اس طرح کی بات سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" تہذیب کی پیشانی پر نہ چاہتے ہوئے بھی کئی شکنیں نمودار ہوئی تھیں۔

"کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میں نے سیدھی سی بات کی ہے اب تمہیں کیا لگا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" عمران نے کندھے اچکا کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ تہذیب نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے خود کو کمپوز کیا۔

"تم اتنے دن سے آ نہیں رہے تھے۔"

"کیوں تم مجھے مس کر رہی تھیں۔"

"ہاں!"

"اچھا حیرت ہے۔"

"مانی! تم ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟" اب کے وہ رو پڑی تھی۔

"تو اور کیسی باتیں کروں چار دن بعد ہماری شادی ہے اور تم پر سوگ کی کیفیت طاری ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے امی صحیح کہتی ہیں کہ تم بھی اس لڑکے کو۔۔۔" بات کرتے کرتے اچانک وہ چپ کر گیا تھا لیکن جو تیر وہ چھوڑ چکا تھا وہ اپنا کام کر چکا تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ بول ہی نہیں سکی۔

"مانی!" بڑی دیر بعد اس کے منہ سے نکلا تھا "تم بھی ایسا سوچ سکتے ہو میں نے کبھی ایسا سوچا نہیں تھا۔ میں کتنی دفعہ تمہیں یقین دلاؤں میں کسی کو نہیں جانتی۔ مجھے کیوں بس سے اتارا میں نہیں جانتی میں تو ان لوگوں کے ساتھ بھی نہیں رہی۔ مجھے فوراً پولیس آفیسرز مل گئے تھے۔"

"وہ بھی تو مرد تھے اور تم ان کے ساتھ جنگل میں رہیں پھر ان کے گھر میں ٹھہریں۔" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔ "وہ مجھے صرف اپنے ساتھ گھر لے کر گئے کیونکہ میں زخمی تھی تم نے دیکھا بھی تھا یہ تو ان کا احسان ہے کہ وہ مجھے تھانے نہیں لے کر گئے اور یہ بھی ان کا احسان ہے کہ باعزت میں تمہارے سامنے ہوں۔" اب وہ بری طرح رو پڑی تھی "میں تھک گئی ہوں مانی صفائی دیتے دیتے کم از کم تم تو مجھ پر شک نہ کرو۔" وہ شروع سے کانوں کا کچا تھا اور وہ جانتی تھی ابھی بھی وہ کس کی زبان بول رہا تھا۔ تہذیب نے آنکھیں صاف کر کے اسے دیکھا "اب جب مجھے

سب سے زیادہ تمہاری ضرورت ہے، تو تم بدل رہے ہو تو اس سے پیشتر کہ نکاح کے بندھن میں بندھ کر ہم دونوں مجبور ہو جائیں بہتر ہے اس تعلق کو ختم کر دیں۔"

دل کڑا کر کے اس نے وہ بات کہہ ہی دی تھی جو [illegible] سوچتی بھی نہیں تھی۔ عمران نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے روئے روئے چہرے کو دیکھ کر اسے اپنے سخت رویے کا احساس ہوا۔ "آئی ایم سوری تہذیب میں آج کل خود بہت کشمکش میں ہوں۔ میں تمہیں ہرٹ کرنا نہیں چاہتا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایک ان چاہا دن جو تم باہر گزار کر آئی ہو مجھے چین نہیں لینے نہیں دیتا خیر میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کل ہمیں شاپنگ کے لیے جانا ہے امی بھی ساتھ ہوں گی اگر وہ کوئی سخت بات کہیں تو دل پر مت لینا اور مجھ سے بھی امید مت رکھنا کہ میں انہیں روکوں گا میں جانتا ہوں تمہارا قصور نہیں لیکن اب خود کو امی کی باتیں سننے کا عادی بنا لو۔ میں نے انہیں شادی کے لیے راضی تو کر لیا ہے لیکن وہ دل سے خوش نہیں۔ چلتا ہوں [illegible] ملاقات ہو گی۔" اس نے ایک نظر اس کے [illegible] سر و دیکھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا لیکن [illegible] ہی پل وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

* * *

"تہذیب!" کشف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے متوجہ کیا۔

"ہوں۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "ایسے کیوں بیٹھی ہو۔" کشف خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"بس ایسے ہی۔"

"امی کہاں ہیں۔"

"اندر ہیں۔"

"اور ابو؟" "وہ لائیٹنگ والے کو بلانے گئے ہیں۔"

"لائیٹنگ سے دل کا اندھیرا دور ہو جائے گا۔" کشف نے پریشانی سے تہذیب کو دیکھا۔

"وہ بھی اب انہوں [illegible] کرنے لگا ہے۔ جس طرح چچی مجھ پر الزام لگا کر رہی تھیں وہ بھی اب اسی طرح بولنے لگا ہے۔ اس کا کہنا ہے وہ مجھ سے شادی تو کر رہا ہے لیکن چچی کی زبان وہ نہیں روک سکتا کیونکہ وہ خوش نہیں۔ خوش تو وہ پہلے بھی نہیں تھیں اب تو انہیں موقع مل رہا ہے۔" کشف نے پریشانی سے تہذیب کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"تم خوامخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ مانی تمہارے ساتھ ہے۔ اسی لیے تو شادی کر رہا ہے۔ ابھی ذرا چچی کی باتوں میں آ گیا ہے۔ تم تو اسے بچپن سے جانتی ہو۔ وہ ایسا ہی ہے تمہارے سامنے تمہارا (چچی) کے سامنے ان کا۔ شادی ہو جائے پھر دیکھنا بالکل پہلے کی طرح ہو جائے گا۔"

کشف نے مسکرا کر اس کی ٹینشن کم کرنے کی کوشش کی۔

"[illegible] سے [illegible]" کشف نے اس کی [illegible] تو اور [illegible]

"چھوڑو بھی۔ تم بس خوش رہو۔ آج دوپہر کو تمہاری آنٹی کا فون آیا تھا۔" "تم نے مجھے بلایا کیوں نہیں۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"تم سو رہی تھیں۔ میں نے کہا جگا دیتی ہوں تو انہوں نے منع کر دیا۔ ویسے وہ شادی پر آ رہی ہیں دانیال بھی تھا۔"

"اچھا۔" وہ مسکرا دی پھر کچھ سوچ کر اس نے کشف کی طرف دیکھا۔

"اور کوئی نہیں تھا؟" تہذیب کے سوال پر کشف نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"اور کسے ہونا چاہیے تھا۔" کشف کے سنجیدہ انداز پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا ایک بار پھر اپنا سر گھٹنوں پر ٹکا دیا۔

"آج میں نے داؤد بھائی کو فون کیا تھا۔" تہذیب نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"کیوں؟"

"[illegible] مس [illegible] آ رہی تھیں۔ انہوں نے کہا انہیں بتا [illegible]"

"انہوں نے کیا کہا؟" کشف غور سے اس کا چہرہ [illegible] رہی تھی جس کا ایک ایک نقش اس کے بارے [illegible] جاننے کے لیے بے چین لگ رہا تھا۔

"کچھ خاص نہیں۔"

"انہوں نے کچھ پوچھا؟"

"کیا؟"

"میرے بارے میں۔" کشف کی خاموشی پر تہذیب نے اس کا چہرہ دیکھا، بہت غور سے اسے دیکھ [illegible] تھی اس نے غور ہی نہیں کیا۔ وہ کیا بول رہی ہے اپنی ہی دھن میں تھی۔

"انہوں نے میرا نہیں پوچھا ہوگا اور کیوں پوچھیں [illegible] میں کون ہوں ان کی۔ میں صرف ایک وٹنس [illegible] گرا [illegible] تھی انہیں تو میرا ایک دن کا ساتھ پسند [illegible] تو عمر بھر کا ہم سفر۔" کشف نے بے اختیار اس [illegible] کو ہلایا تھا۔ تہذیب ایک دم چونکی اور پھر [illegible] ہو گئی لیکن ادھوری بات نے کشف کے اندر [illegible] مچا دی تھی۔ کشف نے سختی سے اسے دونوں [illegible] سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"مجھے ایسا کیوں لگتا ہے تہذیب مانی کے رویے [illegible] اس حادثے سے بڑھ کر کوئی بات ہے جو پریشان کر رہی ہے۔ دیکھو مجھ سے جھوٹ مت [illegible] تو مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔"

اسے بولتا دیکھ کر کشف نے اسے ٹوک دیا۔

اور جب وہ بولی تو اس کا لہجہ ہارا ہوا تھا۔

"پتا نہیں کشف! میں خود بھی نہیں جانتی مجھے کیا [illegible] میں شروع سے جانتی تھی میری شادی مانی [illegible] ہوگی اور میں خوش بھی تھی۔ وہ مجھے پسند کرتا ہے [illegible] سب میرے اپنے ہیں، مجھے اور کیا چاہیے لیکن نہ [illegible] کیوں اب جب میری شادی ہو رہی ہے۔ میں [illegible] نہیں کیوں؟" اس نے کشف کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔

کتنی دیر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔ کشف نے اسے ساتھ لگا لیا تھا۔ تہذیب اس کے ساتھ لگتے ہی بری طرح رونے لگی تھی۔

"کشف! میں مانی سے چیٹنگ نہیں کرنا چاہتی۔ میں اپنی محبت صرف اس کے لیے رکھنا چاہتی ہوں لیکن پتا نہیں کب کہاں غلطی ہو گئی جو جگہ اپنے دل میں چاہتے ہوئے بھی مانی کو نہیں دے سکی۔ وہ جگہ نہ چاہتے ہوئے بھی داؤد نے لے لی ہے، حالانکہ میں جانتی ہوں داؤد کو میں پسند نہیں۔ میں صرف ایک ذمہ داری تھی جو انہوں نے نبھا دی۔ تم نے انہیں فون کیا تھا۔ مدد کے لیے، آنے والے کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے کیوں تم بتاؤ۔ وہ کیوں ہماری مدد کریں گے کیا لگتی ہو تم ان کی؟ انہیں کیا پتا کوئی ان سے محبت کر بیٹھا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ کسی اور کی امانت ہے لیکن کشف یہ سب میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا بس پتا ہی نہیں چلا جب تک میں ان کے ساتھ تھی مجھے احساس ہی نہیں تھا میں بس ایک ہی دعا کر رہی تھی میں اس شخص سے دور چلی جاؤں اور جب میں واپس آ رہی تھی اور جس پل مجھے لگا کہ میں اب دوبارہ انہیں کبھی نہیں مل سکوں گی۔"

وہ اور اک کا لمحہ بہت بڑا تھا بہت بڑا۔ کشف کو اپنی پشت پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔

داؤد اور اس کے گھر والوں کے نام پر اس کے چہرے پر جو چمک آتی تھی۔ اس پر سے شک تو پہلے بھی ہوا تھا اور آج تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ اس نے بے اختیار گہرا سانس لے کر تہذیب کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ سخت کر دیا۔

"تم نے کون سا روگ خود کو لگا لیا ہے تہذیب! دو دن بعد تمہاری شادی ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ داؤد تمہارا نصیب نہیں وہ صرف ایک دن کا ہم سفر تھا عمر بھر کا نہیں۔"

کشف نے اسے حقیقت کا احساس کروایا تھا لیکن اس کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

"اگر وہ میرا نصیب نہیں تھا تو پھر اللہ نے مجھے کیوں ملایا تھا؟" تہذیب اس سے پوچھ رہی تھی لیکن کشف کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"تہذیب یہ دیکھو یہ اچھا ہے نا۔" کشف نے نیلے رنگ کا جگمگاتا سوٹ اس کے سامنے کیا۔

"ہوں!" وہ سرہلا کر اردگرد بکھرے دوسرے کپڑوں کو دیکھنے لگی۔

"تہذیب یہ دیکھو اچھا ہے نا۔" سعدیہ بیگم نے پنک سفید موتیوں سے بھرا کام والا سوٹ اس کے آگے کیا۔

"جی!"

"پسند ہے؟"

"جی آپ کو پسند ہے تو لے لیں۔"

سعدیہ بیگم نے غصے سے اسے دیکھا۔

"بی بی سوٹ ہمیں نے پہننا ہے؟ لڑکیاں شوق سے سو چیزیں لیتی ہیں تمہارے نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے دو گھنٹے ہو گئے ہیں بازار میں خوار ہوتے ہوئے لیکن تمہارا مزاج ہے کہ ٹھکانے پر ہی نہیں آرہا۔"

سعدیہ بیگم نے بغیر کسی لحاظ کے سب کے سامنے اس کی بے عزتی کردی دکان دار بھی اس کی شکل دیکھنے لگا وہ سر جھکا کر ہونٹ کاٹنے لگی۔

"تہذیب یہاں آؤ۔" اس کی مشکل عمران نے آسان کردی تھی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی تھی۔ کشف بھی اس کے پیچھے آئی تھی۔

"مانی یہ کوئی طریقہ ہے بچی سے بات کرنے کا۔" عمران نے کشف کی طرف دیکھا جو غصے سے اسے گھور رہی تھی پھر اس نے تہذیب کی طرف دیکھا جس کا چہرہ آنسو ضبط کرنے کے چکر میں سرخ ہو رہا تھا۔

"میں نے پہلے ہی تہذیب سے کہا تھا میں امی کو نہیں روک سکتی۔"

"کیا تہذیب نہیں روک سکتی۔" کشف کا لہجہ میں موم گیا تھا۔ "تم نے اسے لاوارث سمجھ رکھا ہے اور ابھی بھی کچھ نہیں ہوا کہ کوئی غیر بندہ اس کی بے عزتی کرے تم اس کی عزت کروا سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ ابھی [illegible] ہیں۔"

عمران کے ساتھ تہذیب نے بھی حیرت سے کشف کو دیکھا۔ کشف تہذیب کا ہاتھ تھام کر اسے دوسری طرف لے آئی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" کشف نے پریشانی سے اس کے سفید پڑتے رنگ کو دیکھا۔

"چکر آرہے ہیں۔" وہ بمشکل بولی۔

"تم یہیں رکو میں پانی لاتی ہوں۔" کشف تیزی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھی وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ اپنے قریب کسی کی موجودگی کے احساس پر اس نے آنکھیں کھولیں اور سامنے کھڑے شخص پر نظر پڑتے ہی زمین و آسمان اس کے سامنے گھومنے لگے تھے۔ [illegible] آنکھیں پھیل گئی تھیں۔

"تمہارے تاثرات دیکھ کر لگتا ہے تم مجھے پہچان گئی ہو۔" وہ اس کی کھلی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔ "جس طرح میں تمہیں نہیں بھول سکا لگتا ہے تم بھی مجھے نہیں بھولیں۔"

تہذیب کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ قدم آگے بڑھا کر اس کے مزید قریب آیا تو وہ جیسے ایک دم ہوش میں آئی۔

"مانی!" اس نے بے ساختہ پیچھے مڑ کر اسے آواز دی تھی۔ عمران جو اپنی ماں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی آواز پر حیرت سے پلٹا۔ تہذیب کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر عمران تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا؟" اس کے قریب پہنچتے ہی وہ اس کا بازو تھام کر اس کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کے یوں ڈرنے پر عمران نے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا۔

"اے مسٹر! کیا پرابلم ہے؟" عمران نے غصے سے دیکھا۔

"مجھے کوئی پرابلم نہیں۔ مجھے اس سے بات کرنی ہے تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ ورنہ تمہیں پرابلم ہو سکتی ہے۔"

"کیا کرلو گے؟" عمران نے طیش میں آکر اسے گریبان سے تھام لیا۔

"تمہاری یہ ہمت۔" اس سے پہلے عمران مزید کوئی حرکت کرتا۔ اس نے گن نکال کر اس کی پیشانی پر رکھ دی۔ عمران کے ساتھ اس کے پیچھے کھڑی تہذیب حتی کہ دوکان میں موجود ہر شخص ساکت ہوگیا تھا۔

"اب اگر تم بیچ میں آئے تو گولی ماردوں گا۔" عمران کو دھمکی دینے کے بعد اس نے عمران کے پیچھے کانپتی ہوئی تہذیب کو دیکھا اور اگلے ہی پل اس کا بازو اس کے ہاتھ میں تھا۔

"مانی!" وہ پورا زور لگا کر چیخی تھی۔

اس سے پہلے عمران کوئی حرکت کرتا سعدیہ بیگم [illegible] اس [illegible] کے [illegible] کے [illegible] پر خوف پھیلا تھا۔

عمران نے بڑی بے بسی سے اس کے ساتھ گھسٹتی تہذیب کو دیکھا، لیکن کشف بہن تھی اس نے کسی چیز کی پرواہ نہیں کی تھی وہ بھاگتی ہوئی ان کے سامنے آئی تھی۔

"پلیز میری بہن کو چھوڑ دیں۔" اس نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور مسکرا دیا۔

"سوری میں یہ احسان آپ پر نہیں کرسکتا حالانکہ مجھے آپ پر ترس آرہا ہے لیکن میں اپنی خوشی دیکھوں یا آپ کی۔" اس سے ناامید ہو کر اس نے دکان میں کھڑے لوگوں پر نظر دوڑائی۔

"پلیز کوئی تو مدد کرو میری بہن کو بچاؤ۔" وہ پاگلوں کی طرح مدد کے لیے چیخ رہی تھی لیکن کوئی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ سب کو ہی اپنی جان پیاری تھی۔

"بابر جلدی کرو۔" تب ہی اس کا ایک ساتھی اندر آیا اور بابر تیزی سے اسے کھینچتا ہوا باہر لے کر جا رہا تھا۔ تہذیب نے حیرت سے خاموش کھڑے عمران اور سعدیہ بیگم کو دیکھا اور اپنے پیچھے بھاگتی کشف کو۔ صدمے نے اس میں مزاحمت کی صلاحیت ختم کردی تھی۔

وہ ایک وین تھی جس کے قریب پہنچنے پر بابر نے دروازہ کھول کر اسے پھینکنے کے انداز میں اندر پھینکا تھا۔ گاڑی چلتے ہی اسے جیسے ہوش آیا تھا۔ اس نے زور زور سے چلانا شروع کردیا۔

"چپ کرو تم۔" بابر نے مڑ کر اسے گھورا لیکن اس نے چلانا بند نہ کیا تھا بلکہ وہ وین کا دروازہ بھی کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اس کو بے ہوش کردو۔" اس کے کہنے پر اس کے ساتھی نے کلوروفارم سے بھیگا رومال اس کے منہ پر رکھا جس کو اس نے ہاتھ مار کر جھٹکا تھا لیکن اس دفعہ اس نے سختی سے رومال اس کے منہ پر جمایا۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور زور سے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کردیے کلوروفارم اپنا اثر دکھا رہا تھا اس کے حواس آہستہ آہستہ جواب دے رہے تھے اس کی مزاحمت کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی تھی اور آنکھوں کے آگے بالکل اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ برستی ہوئی نظروں سے جاتی وین کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کرے پھر ایک خیال بجلی کی تیزی سے اس کے دماغ میں کوندا تھا۔ اس نے اپنے پرس سے موبائل نکالا وہ تیزی سے ایک نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہوش آنے پر اس نے بڑی مشکل سے اپنی بوجھل پلکوں کو کھولا تھا چکراتے سر کے ساتھ وہ بمشکل اٹھی تھی۔ وہ کوئی کمرہ تھا۔ جہاں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی وہ زمین پر پڑی تھی کچھ دیر تک تو وہ ناسمجھی سے درودیوار کو دیکھتی رہی اس کمرے میں کھڑکی نام کی

کوئی چیز نہیں تھی وہ کھڑی ہو کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔

"دروازہ کھولو۔" دروازہ پیٹتے پیٹتے اس کے ہاتھ سرخ ہو گئے تھے وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تبھی باہر قدموں کی آواز ابھری وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی۔ اس کے ہٹتے ہی دروازہ کھلا اور بابر اندر داخل ہوا تھا اسے سامنے کھڑے دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔

"شکر ہے، تمہیں ہوش آ گیا ورنہ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔" اس نے دروازہ بند کر دیا اور اس کی طرف بڑھنے لگا اور وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی۔

"کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا تمہیں۔ ایک ماہ سے تمہارے پیچھے خوار ہو رہا ہوں جب سے تمہیں دیکھا ہے۔ کسی کام میں دل ہی نہیں لگتا۔ میرے دوست کہتے ہیں میں کسی کام کا ہی نہیں رہا اور مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ ہر وقت تمہارا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔"

وہ اب اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"جب تم بھاگ گئی تھیں تب سے تمام کام چھوڑ کر تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے تمہارے اسکول سے تمہارا پتا ملا۔ روز تمہارے گھر فون کرتا تھا۔ شاید تمہاری آواز سننے کو مل جائے۔ کتنے دن تمہارے گھر کے باہر کھڑے ہو کر انتظار کیا اب نکلو گی اب نکلو گی، لیکن آج تم نکلیں تو میرا انتظار ختم ہوا۔"

وہ بڑے مطمئن انداز میں اپنی آپ بیتی سنا رہا تھا اور تہذیب دیوار سے لگی وہاں سے بھاگنے کا طریقہ سوچ رہی تھی۔

"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا میں کسی کو اتنا پسند کرنے لگوں گا۔" پھر غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس کے غور سے دیکھنے پر تہذیب کو اپنے سارے جسم پر چیونٹیاں چلتی محسوس ہونے لگیں۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔"

بابر نے کہہ کر ایک قدم اس کی طرف بڑھایا۔ تہذیب نے گھبرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔

"ارے تم ڈر کیوں رہی ہو اور یہ کیا اس طرح آنسو بہا کر ان خوبصورت آنکھوں پر ظلم کیوں کر رہی ہو۔"

بابر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو صاف کرنے چاہے۔ تہذیب نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اس کے انداز پر وہ محظوظ ہوا تھا تہذیب نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

"پلیز مجھے چھوڑ دیں۔ مجھے گھر جانا ہے۔" تہذیب کی بات پر وہ ایسے ہنسا جیسے اس نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

"تم کیا سمجھ رہی ہو میں تمہیں یہاں اپنی داستان محبت سنانے لایا ہوں۔ اب تم یہیں رہو گی۔ بھول جاؤ سب جو چھوڑ آئی ہو۔"

کہتے ہوئے اس نے تہذیب کا ہاتھ بھی پکڑ لیا تھا۔ تہذیب کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔ ہاتھ چھڑانے میں ناکام ہو کر اس نے اپنے دانت اس کے بازو پر گاڑ دیے۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا بلبلا کر رہ گیا۔ بابر کا ہاتھ گھوما تھا اور اس کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔ ابھی وہ اس سے نہ سنبھلی تھی کہ اس نے دوسرا تھپڑ دے مارا اور وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگی۔ "کمینی سب سے تیرے پیچھے خوار ہو رہا ہوں اور تو سالی مجھے مار رہی ہے۔"

وہ جیسے ایک دم پاگل ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس پر لپٹے ہوئے دوپٹے کو جھٹکے سے کھینچا۔ تہذیب نے سہم کر اپنے قریب آتے بابر کو دیکھا اسے اپنی موت بابر کی شکل میں نظر آ رہی تھی تب ہی باہر فائرنگ کی آواز آئی تھی۔ ان دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا کسی نے زور سے دروازے کو دھکا مارنا شروع کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے دل نے بڑی شدت سے اس شخص کو یاد کیا تھا بابر نے اسے چھوڑ کر اپنی گن نکال لی تھی۔ تبھی زوردار دھماکے کے ساتھ دروازہ کھلا تھا کچھ لوگ تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے اسی تیزی کے ساتھ بابر نے اسے کھینچ کر کھڑا کیا تھا اور گن اس کی کنپٹی پر رکھ دی تھی۔

"اگر مجھے ذرا بھی نقصان پہنچا تو میں اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔" بابر نے اسے بری طرح گرفت میں جکڑا

ہوا تھا۔ تہذیب کی نظریں سامنے اٹھیں تو پلٹنا بھول گئیں۔ ابھی اس نے پوری شدت سے اسے [illegible] اور وہ اس کے سامنے تھا۔ [illegible] آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پر پھسل گئے تھے۔ سب اس پر گن تانے کھڑے تھے۔

"ویسے تمہیں داد دوں گا ایس پی! بڑی کوئیک [illegible] ہے تمہاری لیکن افسوس اس دفعہ تمہارا پلڑا [illegible] ہے۔"

"لڑکی کو چھوڑ دو۔" اس کی بکواس کے جواب میں وہ [illegible] اتنا ہی بولا تھا۔

"اسے میں نے چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا۔" وہ [illegible] اس پر تانے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف [illegible] لگا۔ داؤد نے اتنی سختی سے دانتوں کو دبا رکھا تھا اس کی کنپٹی کی رگ ابھر آئی تھی۔ تہذیب اسے [illegible] رہی تھی۔ ایک پل کے لیے داؤد کی نظر بابر سے [illegible] اس سے ٹکرائی تھی۔ وہی ایک نظر اسے ہمت [illegible] تہذیب نے [illegible] ناخن اس [illegible] میں گاڑ دیے۔ صرف ایک سیکنڈ کے لیے اس [illegible] چوکی اور داؤد کی گولی اس کا بازو چیرتی ہوئی نکل [illegible] وہ لڑکھڑایا اور تہذیب کے گرد اس کی گرفت [illegible] اگلے ہی لمحے بھاگ کر دیوار سے جا لگی۔ [illegible] آفیسرز نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا تھا اور [illegible] دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں باندھ دیں۔ اس [illegible] کر داؤد تہذیب کی طرف مڑا جو زمین پر بیٹھی [illegible] اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"تہذیب!" اس کے جھکے سر کو دیکھ کر اس نے [illegible] سے اسے پکارا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر داؤد [illegible] دیکھا اور اگلے ہی پل وہ اس کے کندھے پر سر [illegible] پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ داؤد نے اسے خود [illegible] کر کے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

"[illegible] ٹھیک ہے؟" اس کی آنکھوں میں دیکھتے [illegible] اس نے تسلی دی تھی۔

"داؤد!" حسن کے پکارنے پر دونوں نے اسے دیکھا [illegible] نے تہذیب کا دوپٹہ اس کی طرف بڑھایا تھا داؤد نے دوپٹہ اچھی طرح اس کے گرد لپیٹ دیا تھا۔ اس کی نظر اس کے بازو سے نکلتے خون پر پڑی اس نے غور سے تہذیب کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا۔ گالوں پر بھی انگلیوں کے نشان تھے۔ اسے جانے کیا ہوا تھا وہ ایک دم اٹھا تھا اور اگلے ہی پل اس نے اپنے بھاری بوٹوں سے بابر کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ "تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس کو ہاتھ لگانے کی۔"

وہاں موجود سب لوگ حیران پریشان داؤد کو دیکھ رہے تھے حسن اور کاشف ایک دم آگے بڑھے تھے۔

"داؤد، کول ڈاؤن چھوڑو اسے۔" حسن نے کھینچ کر اسے پیچھے کیا۔ تہذیب سب بھول کر ہکا بکا داؤد کی جنونی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ اچانک وہ رک گیا تھا اور گہرے گہرے سانس لے کر خود کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی تھی۔

"لے جاؤ اسے۔" داؤد نے انسپکٹر کو اشارہ کیا تھا۔

"ایس پی! تم کیا سمجھتے ہو میں ساری عمر جیل میں رہوں گا۔ کبھی باہر نہیں آؤں گا۔ میں جلد واپس آؤں گا اور نہ تمہیں چھوڑوں گا اور نہ اسے۔" وہ اتنی مار کھانے کے بعد بھی دھمکی دینے سے باز نہیں آیا تھا۔

تہذیب کے قریب پہنچ کر وہ ٹھہر گیا تھا۔

"تمہیں تو میں برباد کر کے چھوڑوں گا۔" تہذیب نے گھبرا کر داؤد کو دیکھا جس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا "لے جاؤ اسے۔" وہ دھاڑ کر بولا تھا۔

حسن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تہذیب کی آنکھیں بند تھیں وہ یہی سمجھا وہ ابھی بھی بے ہوش ہے لیکن وہ ہوش میں آ چکی تھی تاہم وہ ابھی ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جب وہ گھر سے نکلی تھی دوپہر تھی اور اب رات ہو رہی تھی وہ لوگ پتا نہیں اسے کہاں لے کر آئے تھے اور یہ اسے کہاں لے کر جا رہے تھے۔ اس نے گردن گھما کر کار ڈرائیو کرتے داؤد کو دیکھا۔

"یہ تو اچھا ہوا ہم اسے فالو کر رہے تھے دوسرے کاشف نے فون کر دیا ورنہ شاید دیر ہو جاتی۔" داؤد نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

اس کے جذباتی پن کے پیچھے کیا محرک تھا حسن جانتا تھا تہذیب نہیں۔ وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ محبت کے اس سفر میں اکیلی ہے۔ اس کے ہونے والے شوہر نے اسے مصیبت کے وقت چھوڑ دیا تو یہ کیوں اس کی خاطر یوں دیوانہ ہو رہا تھا۔ بات تو صاف تھی لیکن اس کا دماغ اس بات کو ماننے میں ہچکچا رہا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی داؤد نے مڑ کر اسے دیکھا حسن نے بھی مڑ کر اسے دیکھا۔

"تم ٹھیک ہو تہذیب!" حسن کے پوچھنے پر اس نے سر ہلایا تھا' اس کے بعد وہ یونہی بیٹھی رہی لیکن خود پر وقفے وقفے سے داؤد کی نظریں بھی محسوس کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر پہنچنے پر اس کے پاؤں کانپنے لگے تھے۔ دیواروں پر لائٹیں تو لگی تھیں لیکن رات ہونے کے باوجود کسی نے انہیں جلایا نہیں تھا۔ وہ ان دونوں کے ہمراہ گھر کے اندر داخل ہوئی تھی۔ لاؤنج لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے رشتے دار تھے اور پڑوس' ہونے والی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے ان سب کے درمیان سعدیہ بیگم اونچی اونچی آواز میں بول رہی تھیں۔ اصغر صاحب اور زبیدہ سر جھکائے ان کی باتیں سن رہے تھے جبکہ کشف کچن کے دروازے سے لگی زار و قطار رو رہی تھی۔ ان تینوں کے اندر داخل ہونے پر سب سے پہلی نظر قمر بیگم کی پڑی تھی جو تہذیب کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں لیکن یہاں قصہ ہی عجیب تھا۔ داؤد اور حسن نے نہ سمجھنے والے انداز میں ان لوگوں کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر کمرے میں موجود آوازیں خاموش ہو گئیں پھر سعدیہ بیگم کی آواز آئی تھی۔

"لو آ گئی مہارانی' منہ کالا کر کے۔ ارے میں تو پہلے ہی کہتی تھی' اس کی شہ پر سب ہوا ہے۔ وہ لڑکا پاگل تھا جو اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک آ گیا لیکن میری کوئی سنتا ہی کہاں تھا۔ اس میسنی کی معصومیت کی پٹی بندھی تھی اس کی آنکھوں پر دیکھو' اب دو دفعہ اغوا ہوئی ہے یہ۔"

انہوں نے عمران کی طرف دیکھ کر جتایا جو بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا جبکہ تہذیب کا دل چاہا' زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"میں آج آخری بار بات کرنے آئی ہوں۔ میں ایک اغوا شدہ لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتی۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میرے ہیرے جیسے بیٹے کے لیے یہ عیب دار لڑکی ہی رہ گئی تھی۔"

"دیکھیں' آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔" حسن نے آگے بڑھ کر انہیں سمجھانا چاہا۔

انہوں نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

"بس جی آپ لوگ کچھ نہ بولیں۔ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔"

حسن نے تہذیب کا چہرہ دیکھا جو لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا جبکہ داؤد کا چہرہ ضبط کے مارے سرخ ہو گیا تھا۔

"مجھے ذرا بھی امید نہیں تھی تہذیب! تم اتنی ... ہونے کے باوجود میں ... لیکن تم بھی ... میری ای سچ کہتی تھیں۔"

اس نے بڑی نفرت سے تہذیب کو دیکھا۔ تہذیب بہت کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان جیسے اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی اور داؤد کا صبر جواب دے گیا تھا۔

"بس!" اچانک داؤد کی زور دار آواز پر پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی "بہت ہو گیا آپ لوگ سوچ سمجھے اس پر الزام لگا رہے ہیں۔ شرم آنی چاہیے آپ کو۔"

"شرم تو تمہیں آنی چاہیے۔" سعدیہ بیگم ہاتھ نچا کر بولیں "دیکھو میاں! ایسے لوگ ہمدردی کے قابل نہیں ہوتے۔ اس کی معصومیت پر مت جاؤ۔ اس کے کرتوت سب کے سامنے ہیں اور تمہیں اتنا درد ہے تو تم کر لو اس سے شادی۔"

ایک پل کے لیے داؤد بالکل خاموش رہ گیا۔ اس نے سوچا کیا قسمت کبھی اس طرح بھی مہربان ہوتی ہے۔ اس نے قمر بیگم کی طرف دیکھا جنہوں نے مسکرا کر اسے جواب دے دیا تھا۔

"آنکھوں دیکھی مکھی کون [illegible]" وہ نہ جانے کیا سمجھیں۔ طنزیہ نظروں سے [illegible] تھیں۔ داؤد کی خاموشی نے تہذیب کو اندر تک توڑ دیا تھا۔

"میں تہذیب سے شادی کرنے کو تیار ہوں ابھی اور اسی وقت۔"

داؤد کے کہنے پر اصغر صاحب اور زبیدہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر اس کے فیصلے کی مضبوطی صاف نظر آ رہی تھی۔ سعدیہ بیگم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں وہ ان سے تہذیب کے لیے بھیک مانگیں گے۔ عمران ایک دم باہر نکل گیا تھا۔

"بھائی صاحب آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔" قمر بیگم نے اصغر صاحب سے پوچھا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں کیسے اعتراض کر سکتا ہوں آپ لوگ تو فرشتہ بن کر ہماری زندگیوں میں آئے ہیں۔ میں نکاح خواں کا بندوبست کرتا ہوں۔"

حسن کے بولنے پر داؤد نے اسے روک دیا "ایک منٹ" حسن کے ساتھ باقی سب بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔

"آپ ایک بار تہذیب سے بھی پوچھ لیں اس کی زندگی کا سوال ہے۔" کشف جو خاموش تماشائی بنی سب دیکھ رہی تھی۔ تیزی سے آگے بڑھی کیونکہ تہذیب کیا چاہتی ہے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

"آپ نکاح خواں کو لے آئیں۔" اس نے حسن سے کہا تھا تو حسن ایک نظر داؤد کو دیکھ کر باہر نکل گیا اور اس کے پیچھے دانیال اور داؤد بھی۔ کچھ لمحوں کی بات تھی وہ تہذیب اصغر سے تہذیب داؤد بن گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کی زندگی میں وہ شخص ہمیشہ کے لیے آجائے گا جو اس کے لیے صرف ایک سوچ تھی۔ وہ ابھی بھی بے یقینی کی کیفیت میں زمین کو گھور رہی تھی جب قمر بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس کو پیار کرنے کے بعد وہ زبیدہ اور اصغر صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

"ہم رخصتی ابھی کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے سوچا ابھی تہذیب کی [illegible] تہذیب آپ کے پاس ہماری امانت ہے۔ ہم دو ہفتے بعد رخصتی کرائیں گے۔" اصغر صاحب اور زبیدہ نے ان کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

* * *

"ارے یہ کیا کر رہی ہو!" کشف کی آواز پر تہذیب گھبرا کر اچھل پڑی "دفع ہو جاؤ۔ آرام سے نہیں بول سکتیں میں ڈر گئی تھی۔" تہذیب نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کشف کو گھورا۔

"اچھا تم ڈر گئی تھیں حالانکہ تم ڈرتی نہیں ڈراتی ہو۔" تہذیب نے کوئی جواب نہیں [illegible] شیشے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ کشف اسے ہی دیکھ رہی تھی جو مہندی کے پیلے سوٹ میں سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی تھی۔

کل مہندی تھی داؤد اور اس کی فیملی لاہور گیسٹ ہاؤس میں شفٹ ہو گئے تھے۔ آج اصغر صاحب نے [illegible]

"کشف! وہ لوگ ابھی آئے نہیں۔" تہذیب کی بے چینی پر کشف کھل کر مسکرائی تھی۔

"آ گئے ہیں۔ اسی لیے تو تمہیں بلانے آئی ہوں۔"

"سچ۔" وہ ایک دم [illegible] ہو گئی تھی۔

"داؤد بھائی نہیں آئے۔" کشف کے بتانے پر تہذیب کا جگمگاتا چہرہ یکدم بجھ گیا تھا۔

"کیوں؟"

"مجھے کیا پتا۔" کشف نے کندھے اچکائے "اب تم نیچے آجاؤ۔" کشف کہہ کر باہر نکل گئی جبکہ تہذیب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ان دو ہفتوں میں داؤد نے اسے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ وہ خود کو تسلی دیتی رہی لیکن آج جب سب آئے ہیں تو وہ کیوں نہیں آئے۔ کئی وہم تھے جو اس کے اردگرد اپنا جال بننے لگے کشف ایک بار پھر اندر داخل ہوئی۔

"تم ابھی یونہی بیٹھی ہو۔" کہتے ہوئے اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم رو رہی ہو؟" اس کے آنسوؤں کی روانی میں اضافہ ہو گیا۔ کشف نے پریشانی سے پیچھے دیکھا اور دروازے میں کھڑے داؤد نے اسے انگلی کے اشارے سے بتانے سے منع کر دیا۔

"کیا ہوا ہے تہذیب؟"

"کشف! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ کہیں واقعی ایسا تو نہیں کہ داؤد نے اس وقت صرف ہمدردی میں مجھ سے شادی کر لی ہو اور اب پچھتا رہے ہوں۔" "کیوں تمہیں ایسا کیوں لگا؟"

"تم خود دیکھ لو نہ کبھی انہوں نے مجھے فون کیا اور اب آئے بھی نہیں۔ میں ہی پاگل ہوں جو پتا نہیں کیا کیا امیدیں لگالی تھیں۔ میں ان سے پیار کرتی ہوں تو ضروری نہیں وہ بھی مجھ سے کریں۔ دانیال نے مجھے بتایا تھا انہیں ڈرپوک اور رونے والی لڑکیاں پسند نہیں اور پتا ہے میں جب بھی ان سے ملی روتی ہی ملی انہیں [illegible] لڑکیاں پسند ہیں تم بتاؤ میں کیا سوبر لگتی ہوں۔" اس کے پوچھنے پر کشف کی ہنسی نکل گئی تھی تہذیب نے ناراض ہو کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

"اچھا بابا ناراض نہ ہو اگر تمہیں یہ وہم ہے تو تمہیں چاہیے تھا تم خود داؤد بھائی سے بات کر لیتیں آخر تم ان کی بیوی ہو۔ اتنا تو تمہارا حق بنتا ہے۔"

"مجھے پاگل کتے نے نہیں کاٹا جو میں ان سے یہ پوچھتی۔ تم نے نہیں میں نے ان کا غصہ دیکھا ہے اور تھپڑ بھی کھایا ہے۔" تہذیب نے اپنا گال سہلایا۔

"تو اب اس کا کیا علاج ہے۔" کشف نے دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھا تو تہذیب نے مسکرا کر اپنے آنسو صاف کیے۔

"کوئی علاج نہیں اب تو میں ان کی بیوی ہوں جیسی ہوں ان کو برداشت کرنا ہو گا۔ چلو میں آنٹی سے مل لوں۔"

وہ بیڈ سے کھڑی ہو گئی لیکن دروازے کے قریب [illegible] ہی دھک سے رہ گئی اس نے مڑ کر شکایتی نظروں سے کشف کو دیکھا جو قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔

"سنا داؤد بھائی! آپ کی بیوی کو کتنی شکایتیں ہیں آپ سے۔"

"جی!" وہ تہذیب پر نظریں ٹکائے بولا۔

"آپ بات کریں میں چلتی ہوں۔"

تہذیب کی نظریں زمین میں گڑ سی گئی تھیں۔ اب پتا نہیں اس نے کیا کیا سنا تھا۔

"بعض دفعہ حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کا وہ روپ سامنے آتا ہے جو وہ اصل میں نہیں ہوتا جب پہلی بار تم ملیں تو جانتی ہو کیا حالات تھے۔ اگر میں نے تمہیں تھپڑ مارا تھا تو میں اس کے لیے شرمندہ ہوں اگر کوئی تمہیں خراش بھی لگائے تو اس کا جو حال میں کروں گا اس کا بھی تمہیں اندازہ ہے کیا وہاں سے تمہیں میرے پیار کا اندازہ نہیں ہوا۔ بوجھ کو زندگی کا حصہ نہیں بنایا جاتا۔ زندگی میں ان لوگوں کو شامل کیا جاتا ہے جو دل کے مکین ہوتے ہیں اور میں تمہاری تمام حماقتوں کے باوجود تم سے محبت کرتا ہوں۔" تہذیب نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا جو ہمیشہ کی طرح سنجیدہ تھا۔

"تسلی کے لیے اتنا کافی ہے یا کچھ اور کہوں۔" تہذیب کی نظریں جھک گئی تھیں۔ اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"آؤ نیچے چلیں۔"

تہذیب نے حیرت سے اس کی پھیلی ہوئی چوڑی ہتھیلی کو دیکھا اور پھر اس کا چہرہ۔ اگلے ہی پل اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ آخری سیڑھی پر اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تھا۔ داؤد نے ایک نظر اس کا چہرہ دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔

عمرانہ مقصود

گاڑی گیراج میں آ کر رکی۔ بی بی جان ایک طرف سے اترنے کی کوشش کر رہی تھیں کیونکہ انہیں کراچی کا تحفہ کچھ جلدی ہی مل گیا تھا۔ یعنی ان کے گھٹنے جواب دے گئے تھے۔ گاڑی میں اترتے چڑھتے کئی بار "آہ" اور "اوہ" کرتی تھیں۔ ویسے گھر میں ہر جگہ ان کے لیے ایک مقابلتاً "اونچی کرسی موجود ہوتی تھی۔

دوسری طرف سے باباجان سعید اترے۔ بی بی جان گاڑی سے اتر کر سیدھی ہوئیں اور حسب معمول شروع ہو گئیں۔

"آپ اس گاڑی کا اے سی کیوں نہیں ٹھیک کرواتے؟ ریٹائر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی سے ریٹائرمنٹ لے لی جائے۔" باباجان حسب معمول خاموش رہے تو ان کی خاموشی سے بی بی جان مزید تپ گئیں۔

"آئندہ اس تندور میں بیٹھ کر جانا ہو تو خود جائے گا۔ یہ تو وہی مثال ہوئی۔ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے۔"

ناولٹ

باباجان سعید اب بھی کچھ نہ بولے۔ زیر لب مسکراتے اندر داخل ہو گئے۔ انہیں پتا تھا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی کوئی نہ کوئی خبر مل جائے گی۔

"ایک تو گاڑی گرم پھر گئے کہاں؟ اپنی بہن کے گھر ان کا مزاج ماشاءاللہ گاڑی کے انجن سے بھی گرم ہے۔" کمرے کی طرف جاتے ہوئے بی بی جان کی تقریر جاری تھی۔

"ارے میں آپ سے بات کر رہی ہوں۔" وہ مڑ کر بولیں تو باباجان کو غائب پا کر پارہ مزید چڑھ گیا۔

ندا ہنستی ہوئی آگے آئی۔

"بی بی جان! کیوں ناراض ہیں؟ کیا ہو گیا؟"

لاؤنج میں اپنی مخصوص اونچی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بی بی جان بڑبڑائیں۔ "تیسری جنگ عظیم اور کیا ہونا ہے۔"

"بی بی جان! یہ تیسری جنگ عظیم 300 مرتبہ تو ہو چکی ہے۔ اس میں آپ ہی جنرل ہیں، آپ ہی جاپان ہیں۔ کیوں اپنی جان جلاتی ہیں۔" ندا ہنس کر بولی۔

"کراچی کی چپکتی ہوئی گرمی، اس پر گرم گاڑی اور ملنے گئے تندور سے، جو ایک ٹھنڈا لفظ نہیں بولتیں۔"

ندا نے پاس آ کر بی بی جان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور بولی۔

"بی بی جان! میرا رزلٹ آ گیا ہے۔"

"کیا بنا؟" بی بی جان کا موڈ بدل گیا۔

"میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔"

"یعنی کلموہی وکالت شروع؟" بی بی جان کندھوں سے ندا کے ہاتھ ہٹا کر کھڑی ہو گئیں۔

"کتنا منع کیا تھا وکالت مت پڑھو، یہ کوئی پیشہ ہے۔ دن رات جھنڈے پکڑے سڑکوں پر پٹ رہے ہیں یا

پیٹ رہے ہیں' یا ہڑتال پر چلے گئے۔"

اس دوران بابا جان خاموشی سے اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے تھے اور اخبار اٹھا لیا تھا۔ بی بی جان ان کی طرف مڑ کر بولیں۔

"سن رہے ہیں آپ؟"

پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولیں۔ "یہ کیا سنیں گے' ان کو اللہ نے کان دیے ہیں' پھر بھی جنتی ہیں اور اب تو اخبار بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ ہرا ہی ہرا نظر آ رہا ہو گا۔"

ندا نے بی بی جان کے کندھے پکڑ کر انہیں بٹھایا۔

"بی بی جان! اللہ کے واسطے میری بات تو سن لیں' بابا جان کو میں بتا چکی ہوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے' وہی تو سب کچھ ہیں تمہارے کیا بات ہے؟"

ندا نے کرسی گھسیٹی اور بی بی جان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آج ایک آفر بھی آ گئی ہے۔"

بی بی جان نے سر پیٹ لیا۔ "یعنی سونے پر سہاگہ اب تم نوکری کرو گی؟ وہ کون لوگ ہیں جن کی قسمت پر بن آئی ہے۔"

بابا جان نے کن انکھیوں سے ندا کو دیکھا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"میں ذرا سائرہ کو دیکھ لوں' وہ آپ کا آرڈر تیار کر رہی ہے۔ آج رات کا ہے نا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی تو بی بی جان کو بھی آرڈر یاد آ گیا۔

"تو بھلا ان کی بہن کی محبت میں مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔"

کچن میں سائرہ آس پاس سے بے خبر' بالوں کو پیچھے جوڑے کی طرح لپیٹے' ڈوپٹہ کمر پر کسے' حلیم کے مسالے ناپ رہی تھی۔ بی بی جان تھکی تھکی سی آئیں اور کچن میں خاص ان کے لیے رکھی گئی اونچی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ارے بیٹی! اکیلے کام کر رہی ہو۔ کیٹرنگ کا کنٹریکٹ میں نے شروع کیا اور پڑ گئی تم۔ یہ سب تمہارے سسر کا قصور ہے۔ کرنی میں اپنی بہن کی محبت' بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ لاؤ مجھے دو' میں ادرک مرچیں وغیرہ کاٹ دوں۔ تمہارے سسر کو کوئی اور رشتہ دار یاد آ گیا تو یہ بھی تم پر پڑ جائے گا۔"

سائرہ خاموشی سے کام میں مصروف مسکراتی رہی۔

"بی بی جان! آپ ہی کا فیض ہے گا۔ میں بھلا آپ کی طرح نفاست سے کہاں کاٹ سکتی ہوں۔ مگر پہلے آپ تھوڑا دم لے لیں۔ فرخ آ جائے اسکول سے' سب کھانا کھا لیں' پھر آپ کو سب ہرے مسالے دے دوں گی۔"

اپنی تعریف سن کر بی بی جان کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی تو بولیں۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ ذرا دیکھوں تمہارے بابا جان فرخ کو لینے گئے یا نہیں؟ انہیں تو ہر کام یاد کروانا پڑتا ہے۔"

کچن کے باہر سے بابا جان نے آواز لگائی۔ "سائرہ بیٹی! میں فرخ کو لینے جا رہا ہوں۔"

"او کے بابا جان!" سائرہ نے مسکرا کر کہا اور واپس اپنے کام میں لگ گئی۔

بی بی پھر آرام سے بیٹھ گئیں۔ "لو سائرہ! [illegible] وہ ابھی تو فرخ کو آنے میں آدھا گھنٹہ لگے گا۔ اور یہ شاہ جہاں کب آئے گا؟ بھلا بتاؤ "ابھی آیا" کہہ کر گیا تھا اور اب تک غائب ہے؟ ان لوگوں کو جتنی چھوٹ دو بس پھیلتے ہی جاتے ہیں۔ اب روٹی بھی تمہیں ہی پکانا پڑے گی۔ ارے ماموں کو ایئرپورٹ ہی چھوڑنا تھا نا یا بنگلہ دیش چھوڑنے چلا گیا؟"

سائرہ نے جلدی جلدی روٹی پکائی۔ میز لگائی اور کیٹرنگ کا کھانا الگ رکھتے ہوئے بی بی جان سے کہا۔

"بی بی جان! آپ اس پر اپنا ٹیگ لگا دیں۔ میں ذرا سلاد کاٹ لوں۔"

"نمک چکھ لیا؟" بی بی نے مسالہ کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں چکھ لیا تھا۔" سائرہ نے باہر جاتے ہوئے' پھر زور سے بولی۔

"بی بی جان! میں فرخ کے کپڑے نکالنے جا رہی ہوں۔ آتے ہی نہائے گا۔ آج اس کا فٹ بال کا میچ بھی تھا" اور تب ہی سائرہ کے پاؤں سے فٹ بال ٹکرائی۔ زور سے ہنس کر سائرہ نے فٹ بال پاؤں سے ایک طرف کی۔ "لیجیے آ گیا میرا فٹ بالر۔"

کھانے کی میز پر فرخ زیادہ ہی خوش نظر آ رہا تھا۔ ایک انگلی اٹھا کر بولا۔ "میرے پاس ایک اچھی خبر ہے۔ اور دو بری خبریں ہیں۔"

ندا آرام سے بولی۔ "پہلے بری خبریں سناؤ۔"

"نہیں نہیں۔ پہلے اچھی خبر۔" فرخ نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ بری خبر پر ڈانٹ دیں گے تو میں کیا کروں گا؟" بابا جان فرخ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "چلو اچھی خبر سناؤ۔"

فرخ خوشی سے کھڑا ہو گیا۔ بی بی جان ڈانٹ کر بولیں۔

"بیٹھو' بیٹھ کر خبریں سناؤ۔"

ندا بی بی جان کو روکتے ہوئے بولی۔ "بی بی جان! سنانے دیں نا۔ ایک خبر ہی تو ہے' کوئی خبرنامہ تھوڑی ہے۔"

"تم ضرور بولو گی' ارے اپنی وکالت کا کوٹ پہنو' تب جھاڑنا۔"

"اچھا میں بیٹھ کر سناتا ہوں۔" بی بی جان کا موڈ دیکھ کر فرخ جلدی سے بیٹھ گیا۔

"میں نے آج دو گول روکے اور ہماری ٹیم دو گول جیت بھی گئی۔"

بابا جان اور ندا نے تالیاں بجائیں۔ سائرہ نے آہستہ سے کہا "گڈ!" اور روٹی لینے چلی گئی۔ بی بی جان نے بھی بلائیں لیں۔

"اچھا اب بری خبریں سناؤ۔" ندا ہنس کر بولی۔

"مجھے maths (میتھس) کا ایک پروجیکٹ ملا ہے جو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اسی ویک اینڈ میں ختم کرنا ہے اور دوسری بری خبر یہ ہے کہ میری ہوم ورک کی ڈائری ثمن کے ساتھ چلی گئی۔ اسی میں ساری detail (تفصیل) لکھی تھی۔"

بابا جان زور سے ہنسے۔ فرخ کے سر پر ایک ہلکی سی چپت رسید کی۔

"بہت سمجھ دار ہو گئے ہو۔ وہ ڈائری ثمن نے مجھے گاڑی میں لا کر دے دی تھی۔"

"آپ بھی بہت سمجھ دار ہو گئے ہیں۔" فرخ منہ بنا کر بولا پھر سائرہ کو دیکھ کر بے چارگی سے کہنے لگا۔

"ماں! یہ بتائیے کہ ابا اس ویک اینڈ میں آ جائیں گے نا؟ آپ لوگوں کو تو 5th کلاس کا میتھس آتا نہیں ہے۔"

"ارے تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔" بی بی جان مسکرائیں۔

فرخ گھبرا گیا۔ "کیا مطلب؟ یعنی آپ کروا دیں گی؟"

"گو میٹرک تو میں نے بھی نہیں کی ہے۔ کروا سکتی ہوں لیکن نیلو بیگم ہے میری' کس دن کام آئیں گے؟ وہ کروا دیں گے۔" بی بی جان نے آرام سے کہا تو سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔

تب ہی شاہ جہاں اندر آیا۔ خوب تیار' کنگھی پٹی جمائے' جو گر پہنے ہوئے۔ دیر سے آنے پر چہرے پر ذرا بھی پریشانی نہیں تھی۔

"کیوں جناب شاہ جہاں! بنگال کا موسم کیسا تھا؟ بڑی جلدی آ گئے؟" بی بی جان نے دیکھ لیا۔

"بی بی جان! جو مہمان کل جانا تھا' وہ آج گیا ہے۔ ہم سب ایئرپورٹ پر ہی بیٹھے رہے۔"

سائرہ برتن سمیٹنے لگی تو شاہ جہاں نے آگے آ کر سائرہ کو روکا۔ "بھابھی جان! آپ ہٹیے' میں کر لوں گا۔"

اس سے پہلے کہ بی بی جان کچھ کہتیں' سائرہ بول پڑی۔

"بی بی جان! آپ کے کیٹرنگ کے ٹیگ اور لیبل ختم ہونے والے ہیں پلیز جلدی سے اور بنوا لیں۔"

بی بی جان کا موڈ واقعی بدل گیا۔ "ذرا میری فائل رنا شاہ جہاں۔" کہتی ہوئی اٹھ کر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

دراصل بی بی جان نے وقت گزاری کے لیے کیٹرنگ کا کام شروع کیا تھا۔ کھانا پکانے کا انہیں ہمیشہ سے شوق تھا۔ شرجیل امریکہ چلا گیا اور راحیل کی شادی ہو گئی۔ بی بی کے پاس وقت ہی وقت تھا اور صحت بھی تھی۔ لہٰذا اس وقت اور صحت کا بہترین استعمال یہ تھا کہ اپنی صلاحیتوں کا بھی بہترین استعمال کیا جائے اور جس کے پاس سائرہ جیسی بہو ہو تو پھر کیا ہی کہنا۔ سائرہ بھی ساس کے ساتھ لگی رہتی۔ راحیل کے دفتری اوقات کچھ زیادہ ہی لمبے تھے۔ بینک کی نوکری میں اپنے آپ کو منوانا ہے تو دس 'گیارہ' بارہ کب بجتے ہیں' بھول جانا چاہیے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ بینکر اپنے بچوں کو صرف سوتا ہوا ہی دیکھتا ہے لہٰذا وہ ان کو نا پا بھی' دونوں ہاتھ دونوں طرف پھیلا کر۔

سائرہ سے بی بی جان کی خوب بنتی تھی۔ وہ ندا سے زیادہ سائرہ سے خوش رہتیں۔ ندا اور سائرہ کی بھی بہت دوستی تھی۔ ندا تھوڑی لاابالی' دلائل دیتے دیتے بی بی جان کو سیشن کورٹ کا جج بننے لگی تھی۔ ہر بات میں بحث اور جیتنا بھی ضروری۔ دونوں کے مزاج مختلف تھے اور شاید یہی وجہ ان کی دوستی کی بنیاد تھی کیونکہ دو ساتھ رہنے والے اگر ایک جیسے مزاج کے ہوں تو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔

بی بی جان روایتی ساسوں سے مختلف تھیں۔ ان کے لیے بہو' بیٹا' بیٹی سب ایک جیسے تھے۔ ہاں شرجیل کے امریکہ جانے سے وہ دکھی ضرور تھیں لیکن جب انہیں اندازہ ہوا کہ اب شرجیل پکا امریکی بن گیا ہے تو کسی حد تک حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

گلزار کی فلم "نمکین" انہیں بہت پسند تھی۔ کئی بار وی سی آر پر بھی دیکھی تھی۔ اپنی کیٹرنگ سروس کا نام اسی لیے نمکین رکھ لیا تھا۔ بی بی جان اور بابا جان نے پوری زندگی میں ایک ہی بات پر بغیر لڑے اتفاق کیا تو وہ تھا کیٹرنگ سروس کا نام تھا۔ فرخ کی پیدائش کے بعد تو جیسے گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔

بابا جان ہر رشتے کا حق نبھاتے تھے۔ کسی سے بحث نہیں۔ سب کے پاس وہ اتنی گنجائش چھوڑتے تھے کہ وہ اپنا فیصلہ خود کر سکیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد گھر میں رہنا' کتابیں پڑھنا' فرخ کے ساتھ باتیں اور سائرہ کا دل رکھنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ بابا جان صبح ٹہلنے جاتے تھے' واپسی میں بہو کے لیے موسم کے مطابق یا گیندے کے پھول توڑ کر کچن میں رکھ دیتے۔ اگر کبھی بابا سعید پھول نہ لا سکتے تو سائرہ کو وہ صبح بہت مختلف لگتی تھی۔

بابا سعید ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ ریحان نے لی۔ ریحان نئی دنیا' نئے زمانے کا نوجوان تھا۔ بال بہت جلدی سفید ہو گئے تھے جو اس کی پرسنالٹی پر بہت اچھے لگتے تھے۔ ایک گوری بیوی سے دھوکا کھا چکا تھا۔ بابا جان اکثر کہتے کہ گوریوں سے شادی ہو تو پہلی شادی ہوتی ہے' وہ بہت جلدی دوسری شادی کے لیے جگہ خالی کر کے چلی جاتی ہیں۔ اللہ بچائے ان گوریوں سے۔ ریحان اکثر ہی بابا سعید کے پاس آ کر ان کے تجربے سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ نئے زمانے کا تھا لیکن پھر بھی بابا سعید کو اپنا استاد مانتا تھا۔ باہر کے دروازے سے ہی اندر آتا' سیدھا بابا کے کمرے میں جاتا اور کام کر کے وہیں سے واپس۔

لیکن شرجیل امریکہ کیا گیا' وہ امریکیوں سے زیادہ امریکی ہو گیا۔ سال میں ایک چکر کرسمس کی چھٹیوں میں لگاتا تھا۔ ورنہ زیادہ رشتہ ٹیلی فون یا انٹرنیٹ پر تھا۔ بی بی کہہ کہہ کر تھک گئی تھیں کہ شادی کر لو مگر شرجیل مذاق میں اڑا دیتا۔

نیلو بیگم پڑوس میں رہتی تھیں' اولاد کوئی نہیں تھی۔ شوہر قدرت اللہ واقعی اللہ کی قدرت تھے۔ کچھ پڑھا لکھا تھا لیکن سب نیلو بیگم کے اسٹار پلس شوق نے زمین برد کر دیا تھا۔ تھکے ہارے دفتر سے آ

تھے اور نیلو بیگم کے ساتھ اسٹار پلس دیکھنے بیٹھ جاتے تھے۔ جب وہ کھانا دے دیتیں، کھا لیتے تھے اور اگر کبھی نیلو بیگم کی پسند کا ڈراما یا شو نہ آرہا ہوتا تو انہیں گول گپے یا چاٹ کھلانے کا فنٹن لے جاتے تھے۔ دن میں کئی بار نیلو بیگم منہ کا مزا بدلنے کے لیے بی بی جان کے گھر آجاتی تھیں۔ ان کو اس گھر کی ساس بہو سے بہت شکایت تھی کہ دونوں بہت سادہ کپڑے پہنتی ہیں۔ ایک دو چوڑیاں ہاتھ میں ڈالتی ہیں اور گھر میں کوئی بڑا مسئلہ بھی کھڑا نہیں کرتیں۔

بے چاری پھوپھی جان یہاں رہتی نہیں تھیں لیکن بی بی جان کے دماغ پر ہر وقت سوار رہتی تھیں۔ بھائی کی محبت اور بھاوج کے خوف سے ان کی ہمت نہیں تھی کہ بھائی کے گھر دو چار دن گزارنے آجائیں۔

اسی وجہ سے بابا خود ہی چلے جاتے تھے اور چاہتے یہ تھے کہ بی بی جان اور بڑی آپا کے درمیان کی دوریاں مٹ جائیں۔ بی بی جان کا خیال تھا کہ یہ کوئی کبڈی کا پالا نہیں ہے کہ جہاں چاہا چاک سے ایک لکیر کھینچ دی اور کبڈی کبڈی کہتے ہوئے پار کرلی۔ تمہاری کھینچی لکیر ان مٹ ہے میری زندگی میں پار نہیں ہوگی۔

☆ ☆ ☆

بی بی جان نے گھڑی دیکھی تو پریشانی سے برتن ہاتھ سے چھوٹ گئے۔

"ارے سائرہ، ندا کہاں ہو؟"

شاہجہاں دوڑا آیا۔ "کون گرا؟" جلدی جلدی برتن اٹھانے لگا۔

بی بی نے پھنکارا "کون نہیں، کیا گرا۔ برتنوں کی آواز نہیں سنی۔" پھر بڑبڑائیں۔ "سب کی اردو درست کرتی رہوں۔" پھر ڈانٹ کر بولیں "جاؤ سائرہ سے کہو کہ فرخ کو دیر ہوگئی۔ ذرا اپنے باباجان کو فون کریں۔"

شاہجہاں بھی گھبرا گیا۔ "ارے ہاں، دو بج گئے۔ دیر تو ہوگیا۔" بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

سائرہ فون کان سے لگائے کچن میں آئی۔

"امی! فون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن باباجان اٹھا نہیں رہے ہیں۔"

اسی وقت شاہجہاں فون اٹھائے آگیا۔ "بابا فون گھر پر چھوڑ گئے ہیں۔"

بی بی جان کو جیسے موقع مل گیا۔ "اور سن لو اب خبر بھی نہیں مل سکتی۔ بیٹی! تم ٹیکسی پکڑو اور اسکول چلی جاؤ۔"

"ٹھیک ہے بی بی جان! میں جاتی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" اسی وقت سائرہ کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ہیلو ہیلو جی۔ جی بابا جان؟" بی بی جان کی جیسے جان ہی نکل گئی ہو۔ اپنی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"جی اب کیا کریں؟ آپ وہیں رکیے میں آتی ہوں۔"

وہ تیزی سے کچن سے باہر نکلی تو نیلو بیگم سے ٹکرا گئی۔ نیلو بیگم اپنے مخصوص اسٹار پلس انداز میں تیار کھڑی تھیں۔

[illegible] شاہجہاں سے "بابا فرخ نہیں آیا ابھی تک۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔ یہ چابی پکڑو [illegible]۔"

"شکریہ نیلو آپا!" سائرہ نے چابی پکڑتے ہوئے ممنونیت سے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

نیلو بیگم بی بی جان کا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔ "آپ گھبرائیے مت۔ آپ کے بچوں کے ستارے بہت اچھے ہیں۔ [illegible] کہیں نہیں جائے گا۔"

"ہندی ہماری سمجھ میں آجاتی ہے۔ کچھ شدبد ہے۔ پانچویں کلاس میں تھے جب پاکستان آگئے تھے۔ دعا کرو نیلو بیگم! خدا خیر رکھے۔"

باباجان جب گھر واپس آئے تو حالت ایسی تھی جیسے جسم سے خون نچوڑ لیا ہو۔ سائرہ اسکول پہنچی تو اسکول بند ہوچکا تھا۔ وہ بدقت گاڑی چلا کر واپس آئی تو بے دم ہو رہی تھی۔

ریحان جو بابا سعید سے وقت لے کر دو بجے آیا تھا، گھر میں داخل ہوا۔ بی بی جان، ندا اور نیلو کو پریشان دیکھ

کر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ تب ہی فرخ فٹ بال پکڑے واپس آگیا۔ پتا چلا صبح اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے شاہجہاں کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنے دوست اکبر کے ساتھ اس کے گھر جائے گا اور وہی اسے چھوڑے گا لیکن حسب معمول شاہ جہاں بھول گیا اور سارا گھر جیسے ہل کر رہ گیا۔

نیلو بیگم تو ریحان کو دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔ انہیں ریحان بہت پسند تھا کئی بار کہہ چکی تھیں۔

"ریحان کسی اعلا پریوار کا سنسکاری لڑکا ہے۔ بال سفید ہیں تو کیا ہوا، ندا کے لیے بہت اچھا ہے۔ رشتہ ڈال دو۔" لیکن ریحان اس موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ شادی کے نام پر ہی گھبرا جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

راحیل ایک ماہ بعد واپس آرہا تھا۔ سائرہ نے اس کے لیے خاص طور پر اس کی پسند کے کھانے تیار کیے تھے۔

فرخ کا پروجیکٹ [illegible] رہتا تھا۔ نیلو بیگم کے میاں نے چھٹی کا دن فرخ کے ساتھ فٹ بال کھیل کر گزار دیا اور فرخ شام کو سب سامان پکڑے واپس آگیا۔ راحیل کو پروجیکٹ کبھی کروانا ہوگا۔

بی بی جان بھی بار بار کچن کا چکر لگاتی رہیں۔ نمکین کی کٹھر تک کی نوک پلک درست کرتی رہیں۔ باباجان کی طبیعت اب ٹھیک تھی۔ کل کی تھکن اتر چکی تھی۔ انہوں نے فرخ کو اس کے پروجیکٹ میں مدد کرنے کے لیے پاس ہی بٹھا لیا۔ پانچویں کلاس کا حساب کا پروجیکٹ بابا سعید کے لیے ضرور آسان تھا لیکن بابا سعید کی شکل دیکھتے ہی فرخ کے نہ ختم ہونے والے سوالات شروع ہو جاتے تھے۔ تب ہی ریحان آگیا تو شیطان کی آنت جیسا پروجیکٹ چند منٹوں میں ختم ہوگیا۔

فلائیٹ ایک تو لیٹ آئی تھی اوپر سے شہر کے حالات حسب معمول خراب تھے۔ راحیل نے فون پر بتایا کہ راستے بند ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور پتلی پتلی گلیوں سے نکل کر آرہا ہے۔

راحیل کا انتظار شکاگو میں بیٹھے شرجیل کو بھی تھا۔ دو بار فون کیا اور پاکستان کو بھلا برا کہا۔ بی بی جان نے فون پر ہی ڈانٹا۔

"تم پاکستان کو برا کہنے والے کون ہوتے ہو؟ جیسا بھی ہے ہمارا وطن ہے۔ تم نے اپنی دنیا بسالی ہے، ہمارے دلوں کو کیوں اجاڑتے ہو۔"

ندا نے شرجیل کو اطمینان دلایا کہ بھیا کے آتے ہی آپ کو فون کروا دوں گی۔

"ارے میری راحیل سے بات ہو رہی ہے، میں بی بی جان کو خوش کرنے کے لیے بار بار فون کر رہا ہوں۔" شرجیل نے ہنس کر کہا۔

"آپ ناکام رہیں گے۔ بی بی جان کو خوش کرنا ناممکن ہے۔" ندا نے آہستہ سے کہا۔

گیارہ بج چکے تھے۔ سائرہ نے فرخ کو زبردستی کھانا کھلا دیا اور سلانے کے لیے لٹا دیا۔ بابا بار بار اندر باہر ٹہلتے رہے۔ بی بی جان بھی انتظار کرتی رہیں اور پہلی بار شاید اتنی دیر تک بھوکی بھی رہیں۔ بھلا ان کا لاڈلا بیٹا ایک مہینے کے بعد آرہا ہے اور وہ اس کے ساتھ کھانا بھی نہ کھائیں؟ ٹیکسی کی آواز آئی سب چونک اٹھے۔ فرخ جو سب کے خیال میں گہری نیند سو رہا تھا، دروازے پر کھڑا ملا۔ بی بی جان اور بابا سعید کا جیسے رونگٹا رونگٹا کان بن گیا ہو۔ گاڑی کا ہارن سنتے ہی باہر دوڑے۔ سائرہ جلدی جلدی کھانے کی میز لگانے لگی۔ ندا کتاب پکڑے آئی اور سائرہ سے بولی۔

"سائرہ! تم بہترین بہو کے خطاب کے لیے مزید محنت مت کرو۔ میں برتن لگا لوں گی۔ تم جاؤ اپنے میاں کا خیر مقدم کرو۔"

سب لوگ گھر کے باہر کھڑے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور جلدی سے اترا، ڈکی کھولی، سوٹ کیس اتارا۔ سب کے چہروں کے رنگ اڑ گئے۔

"راحیل کہاں ہے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے پیچھے کا

دروازہ کھولا۔ راحیل سیٹ پر لیٹا ہوا تھا اور اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔

"کیا ہو گیا؟" سب ایک ساتھ چیخے۔

راحیل کا سفید چہرہ اکھڑی سانسیں ڈھیلی ہوتی بہت کچھ بتا رہے تھے۔ سائرہ زور سے چیخی۔

"ندا! فرخ کو اندر لے جاؤ۔ ہم لوگ آتے ہیں۔" سائرہ کسی طرح بھی جگہ بنا کر راحیل کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ بابا جان گاڑی نکالنے کے لیے دوڑے' انہوں نے کہا۔

"سائرہ! کارڈیو ویسکولر (Cardio vascular) پہنچو میں آتا ہوں۔"

ندا فرخ کو اپنے ساتھ چپکائے آنکھیں پھاڑے کھڑی رہ گئی۔ بہت دیر تک ندا بی بی جان اور فرخ ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہے۔

ایک آندھی چلی اور چراغ بجھ گیا۔ سب کے موبائل فون اور لینڈ لائن شور مچاتے رہے' چیختے رہے۔ کسی کے پاس سسکیوں کے علاوہ کچھ کہنے کو نہ تھا۔ یہ کیسا انصاف تھا؟ معصوم فرخ کیوں یتیم ہوا؟ ہنستی کھیلتی سائرہ کیوں خاموش ہوئی؟ بوڑھے ماں باپ کا گھر کیوں اجڑ گیا؟ ندا کیوں اکیلی رہ گئی؟ ان سب کی زندگی کیوں ایک ایسے موڑ پر آ کر رک گئی' جہاں چاروں طرف صرف اندھیرا تھا۔ جانے والے کا قصور کیا تھا؟ رہ جانے والوں کی غلطی کیا تھی؟ شکوہ کریں تو کس سے اور روئیں تو کس کے آگے؟

سب کے چہرے سفید اور آنکھیں خالی تھیں۔ گھنٹے دنوں میں اور دن ہفتوں میں گزرنے لگے۔

شرجیل آیا بھی لیکن یہاں کا نقصان پورا کرنے کے لیے نہیں' بلکہ تھوڑے دن کے لیے اپنا ایک فرض نبھانے کے لیے۔ یہ فرض دو دن آنے میں اور دو دن جانے میں اور تین دن گھر والوں کے دل بہلانے میں پورا ہو گیا۔

نوکری پر واپس جانا ضروری تھا۔ امریکہ میں نوکری سے چھٹی لینا ہو تو پورے سال کے پروگرام دفتر میں دینا پڑتے ہیں۔ اسے کب پتا تھا کہ اس کا بھائی مر جائے گا تو چھٹی لینا پڑے گی اور ساتھ ساتھ ماریا کے فون۔ وہ اسے یہاں کب رہنے دیتی؟ ماریا کافی عرصہ سے شرجیل کے ساتھ رہ رہی تھی اور شرجیل کو کچھ کچھ لگتا تھا کہ ماریا شادی کے لیے راضی ہو جائے گی۔ یہ خبر بھی شرجیل نے بی بی جان کو خوش کرنے کے لیے سنا دی تھی۔ اسے بس اس لمحے کا انتظار تھا جب وہ ماریا کو پرپوز کر سکے۔ یعنی موم بتی بھی ہو' ڈنر ٹیبل بھی ہو' گلاب کا پھول بھی ہو' چھٹی کا دن بھی ہو اور کسی طرح یہ پتہ چل چکا ہو کہ ماریا منع نہیں کرے گی۔ ماریا کی ماں امریکن تھی لیکن اس کا باپ ہندوستانی تھا۔ اس لیے امید تھی کہ امریکہ میں پیدا ہونے کے باوجود وہ تھوڑی تھوڑی دیسی بھی ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ فرخ نے واپس فٹ بال کھیلنا اور ہنسنا سیکھ لیا۔ ورنہ ان جیٹ لیگ کے زیر اثر چند دنوں میں کوئی جادو نہیں ہو سکتا تھا۔ [illegible] گوشہ دار آہستہ آہستہ [illegible] فون خاموش ہو گئے۔ [illegible] اتنا سناٹا تھا کہ [illegible] جاتے وقت بھی بی بی جان کچھ نہیں بولا۔ سب اپنی اپنی جگہ بت بنے بیٹھے رہے' صرف سائرہ گیٹ تک گئی۔

☆ ☆ ☆

ندا نے جاب جوائن کر لی اور گھر میں خاموشی اور گہری ہو گئی تھی۔ نمکین کو جو آرڈر ملتے تھے' وہ بار بار منع کرنے کی وجہ سے پلٹ گئے۔ پھر بھی کچھ ایسے کلائنٹس تھے جو بی بی جان کے پاس آئے بھی زور بھی دیا اور سمجھایا بھی۔ بی بی جان کی سمجھ میں تو نہ آیا سائرہ کی سمجھ میں آ گیا۔

حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اگر سائرہ نہ سنبھالتی تو یہ سب کچھ بکھر جاتا۔ راحیل کے جانے کے بعد تھوڑا بہت دفتر سے ملا تھا وہ کب تک ساتھ دیتا؟ بابا سعید کی ریٹائرمنٹ کے بعد سے راحیل اور سائرہ نے بابا سے ایک پیسہ بھی لینے سے منع کر دیا تھا۔ صبح میں بابا کے چنے ہوئے موگرے اور چنبیلی کے پھول ہی سائرہ کے

دولت تھے۔

سائرہ نے نمکین کی ذمہ داری پکڑ لی۔ نمکین کیا زندہ ہوا' بی بی جان کی کچن میں پڑی کرسی آباد ہو گئی۔ بابا ندا اور بی بی جان کی نوک جھونک بھی کبھی کان میں پڑ جاتی تھی۔ ندا نوکری میں بہت خوش تھی۔ گھر آ کر جب کوئی بات بتاتی تو بی بی جان پرانی والی ماں بن جاتیں' جن کو وکیل اچھے نہیں لگتے تھے اور کرد صاحب کی شکل تو بہت ہی بری لگتی تھی۔ جب وہ بال جھٹک جھٹک کر بولتے تھے تو بی بی جان تقریباً "ٹی وی توڑنے کو تیار ہو جاتیں۔

نمکین کے آرڈر شروع ہو گئے۔ گھر والے بات کرنے لگے۔ نیلو بیگم جو غم زدہ گھر والوں کو دیکھ کر بہت دکھی ہو جاتی تھیں' وہ بھی واپس اپنے موڈ میں آ گئیں۔ کبھی کبھی سائرہ سے کھانوں کے نسخے بھی مانگتی تھیں۔ سائرہ کے کچن میں پھولوں کی بہار پھر شروع ہو گئی۔ سچ ہے غم جیسا بھی ہو' صبر اس سے بڑا ہوتا ہے۔ غم [illegible] زندہ [illegible] سکھاتا ہے۔ غم [illegible] سکھاتا ہے' صبر امید کے پھل دار درخت کھڑے کرتا ہے۔ اس گھر میں اب زندہ لوگ رہتے تھے۔

یہ ایک سال بہت کڑا تھا بہت کٹھن تھا۔ انسان کا امتحان بھی اسی وقت ہوتا ہے۔ اندھیرے کے آخر میں کوئی کبیر نظر نہ بھی آئے تو اسے اپنے تصور میں دیکھ [illegible] چاہیے۔ سب نے سائرہ اور فرخ میں وہ روشنی ڈھونڈ لی۔ سائرہ آئی بہو بن کر تھی' پھر بیٹی بن کر رہی۔ بابا کی بیٹا اور بیٹی دونوں بن کر سب کچھ سنبھال لیا۔

☆ ☆ ☆

نیلو بیگم حسب معمول بغیر اطلاع کے گھر میں گھسیں۔ لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا۔

"ارے کوئی ہے؟ ہال خالی پڑا ہے۔ نہ آدم نہ آدم زاد۔" ہال کہنا انہوں نے اسٹار پلس سے سیکھا تھا' اسی وقت شاہجہاں اندر آیا۔ نیلو بیگم کے پاس آ کر آہستہ

سے کہنے لگا۔
"آہستہ بولیے' ہماری سائرہ بی بی کا انٹرویو ہو رہا ہے۔"

"انٹرویو؟" نیلو بیگم کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔
"جی انٹرویو مگر آپ ذرا آہستہ بولیے۔ ٹی وی چینل سے لوگ آئے ہیں۔"
نیلو بیگم نے تو دل تھام لیا "ارے غلط گھر میں آگئے۔" یہاں کون ٹی وی دیکھتا ہے۔ ان کو کیا پتہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ٹی وی سے تعلق تو میرا ہے۔"
شاہجہاں کو غصہ آگیا۔ "آپ چپ ہو گا یا بی بی جان کو بلاؤں؟"
اسی وقت بی بی جان باہر نکل کر آگئیں۔ "یہ کون شور..." نیلو پر نظر پڑی۔ "ارے نیلو بیگم تم؟ کیا ہو گیا؟ اندر انٹرویو ہو رہا ہے۔ مجھ سے بھی بات کی اب سائرہ سے بات کر رہے ہیں۔"
نیلو نے تقریباً روتے ہوئے کہا "کیوں؟"
"بتاتی ہوں۔ بتاتی ہوں۔" بیٹھ کر بی بی جان نے گہری سانس لی۔
"شاہجہاں! جاؤ نیلو بیگم کو ٹھنڈا پانی پلاؤ۔"
شاہجہاں پانی لایا۔ نیلو بیگم نے پی بھی لیا لیکن دل تھا کہ ٹھہرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
ٹیلی ویژن چینل نے سائرہ کو ایک کوکنگ شو کی آفر کی تھی' جو سائرہ نے بابا اور بی بی جان کی خوشی کے لیے مان لی تھی۔ بی بی جان کا خیال تھا کہ آج نمکین کو وہ رتبہ ملا' جو ملنا چاہیے تھا۔ سائرہ کی صلاحیتوں پر انہیں پورا بھروسا تھا اور اس سے زیادہ اپنی ترکیبوں پر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر سائرہ نے میرے نسخے استعمال کیے تو کامیابی یقینی ہے۔ بابا جان کا خیال تھا کہ سائرہ نے ہم میاں بیوی کی خوشی کے لیے اپنے چہرے پر ایک پرسکون نقاب چڑھالیا ہے۔ اب جبکہ وہ روز ایک کوکنگ شو کرے گی تو اس کے پاس سوچنے کا وقت ہی نہیں رہے گا۔ اس کا دن بھی مصروف گزرے گا' اور ہمارے اوپر سے یہ بوجھ اتر جائے گا کہ وہ ہمارے لیے اپنے دکھ چھپائے گھومتی ہے۔

ندا گھر میں بھی کبھی ہی ملتی تھی لیکن رات کے کھانے کے وقت سائرہ سے دن بھر کی رپورٹ ضرور لیتی تھی۔ کہنے کو کوکنگ شو کی صرف ایک ہفتے کی پانچ ریکارڈنگ ہی ہوئی تھیں' لیکن سائرہ کے چہرے سے دکھ کی ایک پرت اتر گئی تھی۔ بابا جان اور ندا اس کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بہت خوش تھے اور بی بی جان اپنے نمکین کو پہچان مل جانے کی وجہ سے خوش تھیں۔
ناراض تھیں تو نیلو بیگم۔ ریکارڈنگ کے دوران بھاری بھاری ساڑیاں پہن کر' جوڑا بنا کر' چوڑیاں چھن چھن کرتی' زیور کی دو کان کان اور گلے میں سجائے ایک دو چکر ضرور لگاتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ریحان ہفتے میں دو تین چکر لگاتا تھا۔ اب صرف بابا جان کے لیے نہیں بلکہ گھر والوں کے پاس بھی بیٹھتا تھا۔ بی بی جان کا دل بہلاتا تھا' فرخ سے دوستی بڑھا رہا تھا' ندا سے بحث و مباحثہ کرتا تھا۔ سائرہ پہلے ہی کم گو تھی اب تو بات کرنے کو زیادہ کچھ تھا بھی نہیں۔
نیلو بیگم کی ریحان نے نہیں سنی تو نیلو بیگم بپھر گئیں۔
"بی بی جان! ندا سے کہیے اس سے دوستی بڑھائے' دیکھا بھالا' صورت شکل والا شریف آدمی ہے اور ویسے بھی آپ کی بیٹی کسی 26' 25 سال کے بندے کی باندی بن کر رہ نہیں سکتی۔ ایک بات اور بتاؤں' دھوکا کھایا ہوا مرد دوسری بیوی کی بہت قدر کرتا ہے۔ آپ ندا کو سمجھائیے' کالے کوٹ میں کچھ نہیں دھرا۔ کالے کوٹ سڑکوں پر جلسے جلوس نکالنے میں میلے سفید ہو جاتے ہیں۔"
بات یہ بی بی کے دل کی بھی تھی لیکن وہ کہتی تھیں "بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ میری وہ پہلے ہی دشمن ہے اور راستہ بدل لے گی۔" بابا جان سے بھی بہت بار ذکر کیا' لیکن وہ ہمیشہ سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ ویسے بھی انہوں نے جو راستہ اپنایا تھا' وہ کسی کا را

دنیا نہیں تھا۔ سب کو جینے کا حق اس کی خوشی کے حساب سے دیتے تھے۔
چھٹی کا دن تھا۔ ندا دل بھر کر سوئی اور جب اٹھی' ہر طرف خاموشی دیکھی تو سمجھ گئی کہ سائرہ کی ریکارڈنگ شروع ہو گئی ہے۔ اشارے سے شاہجہاں کو چائے کا آرڈر دے کر اپنے کمرے میں واپس جانے لگی۔ اسی وقت کسی بچھل پیری کے چلنے کی آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو نیلو بیگم پائل چھنکاتی گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ندا نے جلدی سے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں لے گئی۔ باہر رہ جاتیں تو ریکارڈنگ ٹیم کو اپنا وزٹنگ کارڈ بار بار دیتیں اور سائرہ میں کیڑے الگ ڈالتیں۔
کمرے میں آتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھوں سے ندا کا ہاتھ پکڑ کر اسے پلنگ پر بٹھایا۔
"میری بات سنو! یہ جو تمہاری بھاوج ہے سیدھی سادی' ہلکے رنگ کے کپڑے پہنتی ہے۔ ایکٹنگ اور ... [illegible] ... معلوم نہیں۔ اس کو سمجھاؤ کہ یہ کام جو وہ کر رہی ہے' مجھے دے دے۔ جو پیسے اسے ملتے ہیں وہ ملتے رہیں گے۔ مجھے تو بس ٹی وی پر آکر مشہور ہونے کا شوق ہے۔
ارے ندا! کس قدر بدشکل' تلی' پھیچر لڑکیاں اور عورتیں مشہور ہو جاتی ہیں' میں ایک بار ٹی وی پر نظر آئی تو لوگ بھول جائیں گے۔ کون پرینکا' کون سوہانا' کون گل' سب پیچھے پڑ جائیں گی۔"
شاہجہاں چائے لے آیا۔ ندا نے جلدی سے اپنا کپ اٹھایا اور دوسرا نیلو بیگم کی طرف بڑھایا لیکن انہوں نے چائے پر توجہ نہ دی۔
"اچھا ایسا کرو۔ تم روز باہر جاتی ہو' لوگوں سے ملتی ہو گی' مجھے کسی چینل پر کام دلا دو۔ مجھے پتہ ہے تمہاری بھاوج تو منہ سے ایک لفظ نہیں نکالے گی' تم ہی میرے کام آؤ گی۔ ایک دفعہ میں ٹی وی اسکرین پر آگئی بس... لولی وڈ بولی وڈ' ایکتا کپور سب میرے پاؤں چھوئیں گے۔ سب ہیروئنیں پانی بھرتی رہ جائیں گی۔"

"یہ بتائیے کہ آپ ساڑی میں کم سے کم کتنی پنیں (Pins) لگا سکتی ہیں؟ کتنی بھاری ساڑی پہن کر اور کتنا من زیور پہن کر سو سکتی ہیں؟ کتنی جاسوسی کر سکتی ہیں؟ کتنے راز ہضم کر سکتی ہیں؟"
ندا نے مذاق میں بات ٹالنے کی کوشش کی۔
"یہ کیا بات کی تم نے' تم اس دنیا کو نہیں جانتی ہو۔" وہ برا مان گئیں تو ندا نے جلدی سے کہا۔ "اچھا اچھا میں کوشش کروں گی۔"

☼ ☼ ☼

نمکین نے ٹیلی وژن پر بھی اور اخباروں میں بھی اپنی جگہ بنالی۔ سائرہ کی ترکیبوں کا اور سادگی کا ذکر ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ بی بی جان کی موجودگی بھی کافی وزن دار تھی۔ ان کے جملے دہرائے جانے لگے۔ ان کے ٹوٹکے زبان زد عام و خاص تھے اور اس سے زیادہ ان کی بامحاورہ بات چیت لوگوں کو بہت اچھی لگتی تھی۔
ان ہی دنوں شرجیل نے فون پر اپنی شادی کی اطلاع دی۔ بی بی جان نے دل تھام لیا۔ بہت سمجھایا کہ بیٹا سوچ لو۔ فیصلے اس طرح نہیں کیے جاتے۔ شادی گڑیا گڈے کا کھیل نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ شرجیل کو چونکہ کرسمس کی چھٹیاں' موم بتی' انگوٹھی' ہوٹل میں بکنگ اور گلاب کا دل بھول مل گیا تھا' لہٰذا اب وہ فیصلہ بدلنے والا نہیں تھا۔
"خیر تم جانو تمہارا کام جانے۔ ہم بڈھے کب تک تمہارے پیچھے دوڑیں گے۔" بی بی جان چپ ہو گئیں۔
چپ ہو جانے کی ایک وجہ اور بھی تھی' وہ یہ کہ اب وہ شہرت کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ درد بھی کم ہو گیا تھا۔ بابا جان سے لڑائیاں بھی کم ہو گئی تھیں اور سب سے بڑی بات ندا سے تعلقات میں بہتری آگئی تھی۔ انہیں کون سا امریکن ماریا کو بھگتنا یا برتنا تھا۔ کبھی کبھی منہ سے دعا ہی نکل جاتی تھی۔ آخر ماں جو ٹھہریں۔
مصروفیت اور شہرت دونوں کی موجودگی میں سارہ کا

ہیولا کچھ کمزور پڑ گیا تھا۔ ایک اور بات بی بی کی سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ تھی کہ مئی میں شادی طے کی اور دسمبر میں شادی کریں گے؟ بابا سعید نے سمجھایا۔

"آپ اپنے دماغ کو کیوں تکلیف دیتی ہیں؟ انہیں ان کی طرح سے کام کرنے دیں۔"

دوسری خبر یہ آئی کہ ریسپشن (Reception) کے لیے ایک حیدر آبادی جوڑا بنوا دیجیے۔ حیدر آبادی کی ضرورت یوں پڑی کہ ماریہ کے باپ کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا، حالانکہ ان کا تعلق سارہ کی ماں سے ڈھائی سال ہی رہا تھا اور دنیا سے بھی پچھلے سال ختم ہو گیا تھا۔ بی بی جان اور سائرہ وقت نکال کر ڈزائنرز کے چکر لگانے لگیں۔ ان کے پاس اگلے سال تک وقت نہیں تھا۔ خدا خدا کر کے کسی ڈزائنر نے رحم کھایا۔

تیسری خبر یہ آئی کہ شادی میں بی بی جان اور بابا سعید کو ضرور آنا ہے۔ ابھی تک تو قرب قیامت تھا، لیکن بی بی جان کے نزدیک یہ خبر قیامت سے کم نہیں تھی۔ صاف منع کر دیا۔

"میں نہیں جاؤں گی، پاگل سا کاٹ لے، جب بھی نہیں جاؤں گی۔"

بابا جان خود بھی جانے میں خوش نہیں تھے لیکن کسی کا دل توڑنا ان کے نزدیک گناہ کبیرہ تھا۔ سردی کا سوچ کر بی بی جان کی ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں۔ فرخ اور نمکین کا نشہ ایسا تھا کہ ان دو کے بغیر وہ کچھ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ اسی ادھیڑ بن میں نومبر آ گیا۔ ٹکٹ شرجیل نے بھجوا دیے تھے۔ یہاں بھی کچھ سمجھوتا سا ہو گیا تھا۔ سائرہ نے وعدہ کیا تھا۔

"میں ہر جملے میں ناظرین کو آپ کی کمی کا احساس دلاؤں گی اور احساس دلانا کیا ضروری ہے، نمکین آپ کے بغیر بالکل پھیکا ہو گا لیکن جو کام لیا ہے، وہ کرنا ہے میرا دل لگے یا نہ لگے۔"

چوتھی خبر یہ آئی کہ شرجیل نے نوکری بدل لی ہے۔ اب وہ واشنگٹن چلا جائے گا اور ماریہ فی الحال شکاگو میں ہی رہے گی۔ وہ کوشش کر رہی ہے کہ اس کو بھی واشنگٹن میں اچھی ملازمت مل جائے۔ اس خبر سے یہاں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ بابا سعید اور بی بی جان کے لیے برابر تھا کہ وہ شکاگو جائیں یا واشنگٹن بلکہ بی بی تھوڑا سا خوش تھیں۔

"چلو اچھا ہوا شادی سے پہلے دو تین مہینے الگ الگ رہیں گے۔ وہاں کے معاشرے میں شرم یا بے شرمی لغت میں ہے ہی نہیں۔ اچھے بھلے لڑکے ماں باپ کا پیسہ خرچ کرا کے دور دیس کا سفر کرتے ہیں۔ کچھ ہی دنوں میں جانے کا مقصد اور وطن میں رہ جانے والوں کے دکھ درد بھول کر کسی گوری کالی کے پہلو میں جگہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اب جو بھی ہے قسمت میں لکھا ہے کہ امریکہ جانا ہے تو وہاں بھی جائیں گے۔"

پانچویں خبر کے لیے نومبر کی سات تاریخ کو شرجیل کا فون آیا۔ فرخ جو سونے لیٹ گیا تھا، کود کر بھاگا۔

"چاچو کا ہو گا۔" اس سے پہلے ندا فون تک پہنچ گئی تھی، لیکن فرخ نے ایک چھلانگ لگائی اور ندا سے پہلے فون اٹھا لیا۔

"ہیلو چاچو! How are you"

چاچو کی آواز میں جان کم تھی۔ جذبات نہیں تھے۔ فرخ کے لیے یہ آواز انجانی تھی۔

"آپ چاچو ہی ہیں نا؟"

"ہاں یار! کسی بڑے کو فون دو۔" شرجیل نے کہا۔

"چاچو! میں بڑا ہو گیا ہوں آپ مجھ سے بات کیجیے۔"

ندا فون کے پاس بے چین کھڑی تھی، سائرہ بھی آ گئی تھی۔ دونوں اتنا ضرور سمجھ گئی تھیں کہ شرجیل پریشان ہے۔

"اچھا۔ تم بابا جان کو فون دو۔" فرخ کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا، اداس ہو گیا۔

"پھوپھو! تم بات کر لو۔ چاچا مجھ سے بات نہیں کر رہے ہیں۔" ندا نے فون پکڑا۔

"ہاں بھیا! سب خیریت ہے نا؟ کیا ہو گیا؟" بی بی جان اور بابا جان بھی آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر سوال تھے۔ شرجیل کہہ رہا تھا۔

"ندا ہم شادی نہیں کر رہے ہیں۔"

ندا کی آواز حلق میں دب گئی "شادی نہیں کر رہے ہو۔" پھر کچھ ہمت کر کے پوچھا۔ "کیوں بھیا؟"

بی بی جان کے کان میں بھی آواز پڑی۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا، جس پر بابا سعید کو تھوڑی الجھن ہوئی۔

"یار! ماریہ شکاگو نہیں چھوڑنا چاہتی اور میں واشنگٹن میں بہت خوش ہوں، لہٰذا ہم نے سوچا کہ شادی پھر کبھی کسی اور سے۔" شرجیل نے دبے دبے الفاظ میں کہا۔

ندا نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ فرخ وہیں جا چکا تھا، سائرہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ آہستہ سے پوچھا۔

"بھیا! بابا جان سے بات کریں گے؟"

"نہیں پھر بعد میں فون کر لوں گا۔ تم انہیں بتا دینا۔" یہ کہہ کر شرجیل نے فون بند کر دیا۔

اس پانچویں خبر نے بی بی جان کو نئی جان سے خوش کیا اور بابا سعید بھی دل ہی دل میں پرسکون تھے۔

☆ ☆ ☆

ان کی صبح ایک نئی طرح کی تھی۔ بی بی جان اپنی خوشی سنبھال نہیں پا رہی تھیں، بابا جان سے بولیں۔

"آپ بھی میری باتوں میں آ کر رب سے اپنی بڑی بہن سے ملنے جاتے ہیں۔ لے دے کے ایک ہی تو بہن ہیں آپ کی، اور آپ میری خوشی کے لیے ان سے اتنا کم مل پاتے ہیں۔ میں تو گناہ گار ہوں، آپ کیوں گناہ کرتے ہیں۔ ان کے پاس جایا کریں بلکہ آپا بہت خوش ہوں گی جب انہیں پتا چلے گا کہ آپ کا بیٹا ایک جھٹکے سے قلابازی کھاتے کھاتے بچ گیا۔ انہیں بتائیے کہ سونامی آتے آتے پلٹ گیا۔ میں بھی دفتر میں ریکارڈنگ میں پھنسی ہوئی ہوں اور ہاں، آپا سے پوچھیے گا ضرور کہ میرا کام کیسا لگ رہا ہے۔"

پہلے تو بابا جان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، مل مل کر بی بی جان کو دیکھ رہے اور پھر بغیر وقت خراب کیے ریحان کو فون کر دیا۔

"بیٹے! آج مت آنا، کل شام کو ملاقات ہو گی، کچھ مصروفیت ہے۔"

جلدی سے کڑک کرتا پاجامہ پہنا، نئے سلیم شاہی پہنے اور آپا سے ملنے چلے گئے۔

صبح گیارہ بجے کے نکلے شام کے چھ بج گئے تھے، بابا نے نہ فون کیا نہ آئے۔ بی بی جان ریکارڈنگ ختم کر کے نکلیں اور نظر دوڑائی، بابا کی کرسی خالی تھی۔

ندا دفتر سے واپس آ گئی۔ رات کے کھانے کی تیاری ہونے لگی۔ سائرہ نے فرخ کو بلا کر کھانا کھلا دیا۔ بی بی جان سے بھی کہا۔

"آپ بھی کھا لیجیے بابا جان شاید وہیں کھا لیں۔"

اب بی بی جان کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔

"ارے وہ دن میں دو بار کھانا کیسے کھلائیں گی؟ وہ ایک کپ چائے پر ٹرخانے والی ہیں۔"

سائرہ نے صبح کے ڈائیلاگ بھی سنے تھے، یہ سن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ بی بی جان نے کھانے سے انکار کر دیا "بے چارے میرے کہنے پر گئے ہیں، میں ان کا انتظار کروں گی۔ سائرہ بچے! تم بھی کھانا کھا لو۔"

تھکی ہوئی سائرہ نے بھی دوسری دفعہ کہنے کا انتظار نہیں کیا۔ جھٹ پٹ کھانا کھا لیا۔

بی بی جان کے لیے بھوک ناقابل برداشت ہوئی تو سوچا جب آئیں گے تو دیکھا جائے گا۔ دو آدمیوں کا کھانا لگوایا اور اکیلے کھانا کھانے بیٹھ گئیں۔ آج وہ واقعی کھانا زہر مار کر رہی تھیں۔ اپنے آپ کو کوس رہی تھیں کہ میں نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ بھگتوں گی اب۔

تب ہی مسکراتے ہوئے تر و تازہ بابا جان گھر میں داخل ہوئے۔ آج دل جیسے ہلکا ہو گیا تھا۔ بی بی جان کو کھانا کھاتے دیکھا تو کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ بی بی جان نے دل پر جبر کیا اور بڑے ضبط سے پوچھا۔ "کھانا؟"

بابا جان نے اسی طرح مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے ہم دونوں نے آج کلفٹن میں باربی کیو ٹونائٹ پر کھانا کھایا ہے، آپ کھائیے۔" بی بی جان کے تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ سامنے رکھی ہوئی پلیٹ زور

سے کھسکائی۔

"یہاں سب انتظار کرتے رہے ہیں تو اب تک بھوکی بیٹھی تھی اور اب کھڑوں گی بھی نہیں۔ شاہجہاں! یہ برتن سمیٹو۔"

باباجان نے کچھ نہ بولنے میں ہی خیریت جانی۔ بی بی جان کمرے میں گئیں اور باباجان اپنی اسٹڈی میں چلے گئے۔ دوسرے دن شام تک بی بی جان تقریباً" کمرے میں ہی بند رہیں۔ سائرہ کے علاوہ کسی سے زیادہ بات نہیں کی۔

شام کو ریحان آیا۔ گھر میں سناٹا دیکھ کر اور کچن میں کھٹ پٹ سن کر کچن کی طرف ہی چلا گیا۔ بی بی جان کی کرسی پر باباجان بیٹھے تھے۔ سائرہ کام کرتے ہوئے ان سے باتیں بھی کرتی جارہی تھی۔ بابا سعید باربار کل کے دن کی رپورٹ دے رہے تھے۔ سائرہ مزے لے لے کر سن رہی تھی۔ لیکن دونوں بہت دھیمی آواز میں بات کررہے تھے۔ ریحان اندر آیا تو کچن کا ماحول دیکھ کر مسکرادیا۔ باباجان نے ہاتھ ملا کر کہا۔

"یار! باہر سے کرسی اٹھالو۔ یہیں بیٹھ جاؤ' باہر بمباری کا خطرہ ہے۔"

ہنس کر ریحان نے کہا۔ "تو یہ بار شیلٹر ہے۔"

پھر وہ سب دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سائرہ بہت کم گو تھی لیکن ریحان کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ وہ ہر بات کا جواب دل سے اور تفصیل سے دیتی گئی۔

دو تین دن میں آندھی ٹھہر گئی۔ موسم میں خنکی آگئی۔ آخر نمکین' ان کے پیار کے بغیر کیسے چلتا؟ خود ہی کچھ سوچ کر بی بی جان نے محکمہ موسمیات کا چارج سنبھال کر گھر کا موسم ٹھیک کردیا۔ پھر نوک جھونک باتیں' جھگڑے' بحث سب کچھ شروع ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

موسم اچھا دیکھ کر بابا سعید نے ایک بار پھر ریحان سے دوسری شادی کے متعلق بات کی۔ ریحان نے ڈرتے ڈرتے بہت محتاط اور مناسب لفظوں میں' سائرہ کی تعریف کی اور اپنے دل کی بات کہہ دی۔ باباجان کو حیرانی نہیں ہوئی۔

ریحان کے دل کی بات باباجان کے دل کی آواز تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ سائرہ اور بی بی جان سے بات کی جائے؟ ان کا خیال تھا کہ سائرہ بہت مشکل سے راضی ہوگی۔ بی بی جان کی طرف سے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ انہیں یقین تھا کہ سائرہ سے ٹوٹ کر محبت کرنے والی بی بی جان' سائرہ کا بھلا ہی سوچیں گی۔

"گرین ٹی پئیں گے؟" بی بی جان نے بہت محبت سے بابا سعید سے پوچھا۔

"اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ فوراً" منگوائیے۔ بہت دن سے ہم دونوں نے گپ بھی نہیں لگائی ہے۔"

شاہجہاں نے دو پیالیوں میں گرین ٹی رکھی۔ بی بی جان نے اپنی مخصوص کرسی بابا کے قریب کھینچ لی اور شاہجہاں کے جاتے ہی چپکے سے بولیں۔

"بہت دن سے آپ سے ایک بات کرنا چاہ رہی تھی۔"

"کیسی بات؟" باباجان چونک کر بولے۔

"میں سوچتی ہوں۔ ریحان بہت اچھا لڑکا ہے۔ بقول نیلو بیگم کے ایک شادی ٹوٹ جائے تو لڑکا ... قابل قبول ہوجاتا ہے۔"

باباجان کو اپنے کانوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ سچ پوچھیے تو میں بھی یہ سوچ رہا تھا۔"

"ناقابل یقین! یعنی ہم دونوں ایک ہی بات ایک وقت میں سوچ رہے تھے؟ یہ بھی قرب قیامت کی نشانی ہے۔" بی بی جان نے کہا تو بابا سعید کو ہنسی آگئی۔

"آپ تو تیس سال سے قرب قیامت کی نشانیاں دیکھ رہی ہیں۔"

پھر کچھ دیر سوچ کر بابا کہنے لگے۔ "اچھا یہ بتائیے۔ سائرہ سے بات کون کرے گا؟"

"میں کروں گی۔ سائرہ سے بات کرنے میں کیا ہے۔ ساس بہو دن کے تین چار گھنٹے ریکارڈنگ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو ندا کا ہے' وہ تو انسن اور کروشنے کے لیے نکل پڑی ہیں' وکیل صاحب ناک میں نکیل ڈالتا ہے۔"

باباجان چپ ہوگئے اور جلدی سے بات آئی گئی کردی۔ سوچا کہ یہ موقع ٹھیک نہیں ہے۔ قرب قیامت ہے تو قیامت آبھی سکتی ہے۔ بی بی جان ندا کے لیے ریحان کو سوچے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے فی الحال خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی۔

☼ ☼ ☼

بابا سعید کی منشا دیکھ کر ریحان بھی کھل اٹھا تھا۔ اپنے اکیلے ہونے کا اسے دکھ ضرور تھا لیکن اس نے بابا سعید میں اور بی بی جان میں ماں باپ ڈھونڈ لیے تھے۔ اب کام کے بغیر بھی کبھی آجاتا تھا اور نظروں ہی نظروں میں سائرہ کی ہاں ڈھونڈتا تھا۔ بابا سعید کے جواب کا انتظار کرتا تھا۔ ایک دن موقع دیکھ کر بابا سعید نے ندا سے کہا۔

"بیٹی! تمہارے خیال میں سائرہ اپنی زندگی سے خوش ہے؟"

"پتا نہیں۔" ندا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن خوش نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اب اس کے لیے دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔"

"اور اگر دوسرا کوئی راستہ ہو تو۔"

"کیا مطلب؟ سائرہ کے لیے کیا اور بھی کوئی راستہ ہے؟" ندا چونک کر بولی۔

"ریحان کیسا لڑکا ہے؟" ندا چونک گئی۔

"کیا ریحان اس کے لیے مان جائے گا؟"

"ریحان نے مجھ سے خود یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ اب تم یہ کام کرو کہ سائرہ سے اس کی منشا پوچھو۔"

ندا کچھ گم صم سی ہوگئی پھر پھیکی سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولی۔

"ریحان کی طرف سے اطمینان ہے تو سائرہ سے پوچھنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ضرور مان جائے گی۔ تھوڑی جھجک ضرور کرے گی۔ بھیا کی یادوں سے نکلنا آسان بھی نہیں ہے۔ بس اب یہ کام میرا ہے۔"

پھر سوچ کر بولی "بی بی جان؟ ان سے کون پوچھے گا؟"

بابا نے ندا کا ہاتھ دبا کر سمجھایا۔ "یہ مرحلہ گزر جائے' وہ میں دیکھ لوں گا' اللہ مالک ہے۔"

ندا کو زور کی ہنسی آگئی۔ "اللہ ہی مالک ہے۔"

☼ ☼ ☼

نیلو بیگم حسب معمول گھر میں گھسی چلی آئی تھیں۔ بی بی جان اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی تھیں' آکر بڑی فکرمندی سے بولیں۔

"ایک بات بتائیے اکثرا کے گھر کے حالات ٹھیک ہوجائیں گے؟"

بی بی جان اچھل پڑیں "کس کے حالات خراب ہیں؟ اللہ خیر کرے۔"

بی بی جان کی کم فہمی پر نیلو بیگم کو بہت رحم آیا۔ "آپ تو کچھ نہیں جانتی ہی نہیں بی بی جان! سارا گھر اس سے ناراض ہے۔ خیر آپ چھوڑیے۔ بڑے پریواروں میں ایسا کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ بتائیے کہ ریحان اور ندا کی بات کچھ آگے بڑھی؟"

"نمکین کے کام دن بدن بڑھتے جارہے ہیں۔ کبھی سعید سے بات کرنے کی فرصت مل بھی جائے تو ان کی کوئی مصروفیت نکل آتی ہے۔ ان کی آپا بھی دن رات فون کرتی رہتی ہیں۔ سوچ رہی ہوں کہ اب بات کرہی ڈالوں۔ اصل مسئلہ یہ بھی ہے کہ وکیل صاحبہ کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔"

بی بی جان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "ہماری قسمت دیکھو' ایک بیٹا امریکہ گیا اور امریکہ کا ہی ہوگیا۔ ایک بیٹا اللہ میاں نے بلالیا۔" گہری سانس لے کر بی بی جان نے آنکھیں صاف کیں۔ "اور ندا میں کوئی لڑکیوں جیسی بات ہی نہیں ہے۔ بات کرو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں میں ندا سے بات کروں گی۔"

بی بی جان گھبرا گئیں "نہیں نہیں تم کیوں؟ میں کر لوں گی۔ بلکہ سائرہ کرلے گی۔"

فرخ کی گیند ٹپ ٹپ کرتی آئی اور پیچھے پیچھے فرخ آیا۔ فرخ کو دیکھ کر نیلو بیگم نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"میں بھول ہی گئی تھی۔ قدرت اللہ نے اس کو بلایا ہے۔ آج دونوں کا میچ ہے۔ اچھا رب راکھا۔"

بی بی جان نے چونک کر دیکھا۔ پھر مسکرا کر۔

"رب راکھا۔"

☼ ☼ ☼

فرخ کو سلانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے سائرہ بہت شدید تنہائی محسوس کرتی تھی۔ اس وقت ندا کو کمرے میں دیکھ کر خوش ہو گئی۔

"ارے تم آگئیں؟ میں کچھ اور مانگ لیتی۔" پلنگ پر چڑھ کر ندا نے پاؤں سمیٹے۔

"آج تم سے باتیں کرنے کا موڈ ہو رہا تھا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کافی پیو گی؟"

"پلیز پلیز ضرور مگر میں بناؤں گی۔ کبھی تو میں تمہیں آرام دوں۔"

سائرہ کو ہنسی آئی۔ "تم ندا ہی ہو نا؟"

"تم کوئی اور ہی سمجھو۔" اٹھ کر ندا کچن میں چلی گئی۔ فٹافٹ دو مگ کافی کے پکڑے گنگناتی ہوئی آگئی۔ کرسی گھسیٹ کر بیڈ پر پاؤں پھیلا کر لمبی سانس لی۔

"تم کب تک اس طرح رہو گی؟" میرا خیال ہے کہ تمہیں اب اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"اپنے بارے میں کیا سوچوں ندا! میرا یہاں تم سب کے علاوہ کون ہے؟ جن چچی نے ہاسٹل میں ڈالا تھا جیسے ہی ان کو پتہ چلا کہ مجھے اسکالر شپ مل رہا ہے انہوں نے پلٹ کر خبر نہ لی۔ بس پھر میں اور میری تنہائی۔ بن ماں باپ کے بچوں کا خاص کر لڑکیوں کا کیا حشر ہوتا ہے تم جانتی ہو۔ راحیل نہ ملتے تو تم لوگ نہ ملتے۔ تم لوگ نہ ملتے تو نمکین نہ ملتا۔"

"بول چکیں؟ میرا مطلب ہے کہ تم شادی کے بارے میں سوچو۔"

"شادی کے بارے میں تو تمہیں سوچنا چاہیے اور بھلا مجھ سے کون شادی کرنے آئے گا؟ ایک ادھیڑ عمر کی بقول نیلو بیگم کے، دو ایک گیارہ سال کے بچے کی ماں۔" سائرہ نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہا۔

سائرہ نے ہنس کر کافی کا مگ ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

"تمہاری کل چھٹی ہے اور تم میری چھٹی کرا رہی ہو۔ صبح تو گھر کے کام بہت ہوتے ہیں۔ بابا جان پھول لاتے ہیں، میں انہیں تازہ تازہ رکھنا چاہتی ہوں۔ بی بی جان اور بابا دونوں کو عادت ہے کہ میں ان کے ساتھ ناشتے کی میز پر رہوں اور میری بہن! نمکین کی چھٹی نہیں ہے۔ کل دو آرڈر ہیں۔ پلیز تم یہ کافی ختم کرو اور بھاگ جاؤ۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ ابھی کچھ دیر پہلے تم کہہ رہی تھیں باتیں کرنے کا موڈ ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ ایک بات آخری بات سن لو۔ تم ادھیڑ عمر نہیں ہو مجھ سے دو تین سال بڑی ہو گی اور تم یہاں عمر بھر نہیں رہنے والی ہو اپنا فیوچر ڈیسائڈ کرو۔"

یہ کہہ کر ندا اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کو بابا سعید نے بہت سا پانی اور ہمت پا کر بی بی جان سے پھر بات کرنے کی ہمت کی۔ لیکن اس دفعہ ایجنڈا بالکل صاف رکھا۔

"ایک بات بتائیے بی بی! سائرہ کے لیے آپ نے سوچا ہے؟"

"سوچنے والی میں کب سے ہو گئی۔ اللہ میاں نے اس کے لیے سوچ لیا ہے۔ وہ مصروف ہے۔ کام میں لگی ہے۔ اس کی مرضی کا کام ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ اللہ نے اسے بیٹوں سے بڑھ کر ہمارا سہارا بنایا ہے۔"

"آپ کی بیٹی اگر خدانہ کرے بیوہ ہو جائے تو آپ ایسا ہی سوچیں؟" بابا جان نے دکھ سے کہا۔ بی بی جان ناراض ہو گئیں۔

"واہ یہ کیا بات ہوئی؟ اللہ نہ کرے۔ بری باتیں کوئی آپ سے کروالے۔ بیٹے آپ ندا کا سوچیں جو مادر پدر آزاد گھوم رہی ہے۔ سائرہ کا ذکر آپ کہاں سے آئے؟ بیٹے کا دکھ ہم نے جھیلا، بلکہ میں نے جھیلا۔ آپ مردوں کے دل کا حال تو پتا ہی نہیں چلتا اور میں اس کی شادی کر دوں؟ میرے بیٹے سے میرا اکلوتا فرخ ہے؟ میری بہو جو میرا سب سے بڑا سہارا ہے چھنی جائے؟"

"ریحان سائرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" بابا جان نے صاف صاف کہا۔ بی بی جان کو تو جیسے آگ لگ گئی، جہاں بیٹھی رہ گئیں، سانس آگے آگئی۔

"یہ چکر کب سے چل رہا ہے؟ یعنی میری ناک کے نیچے کھیل رچایا جا رہا ہے۔"

"آپ انسان کو وہاں پہنچا دیتی ہیں جہاں وہ بے قابو ہو جاتا ہے۔ یہ جملہ اس معصوم بے زبان بچی کے لیے آپ نے کیسے کہا۔ آپ کا وہ دل کہاں گیا جو کہتا تھا کہ میری بیٹی تو سائرہ ہے۔ بے مہار ندا ہے تو بات کرنا ہے۔ بہرحال میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ سائرہ کی مرضی ہے مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میں اس کو اس [illegible] کہ وہ میرا [illegible] بنانے [illegible] اور اس کے لیے [illegible] ہے۔ آپ نے [illegible] بننے کی اداکاری کی اور ایک ہی جھٹکے میں سارا [illegible] نہیں۔ مجھے بہت زیادہ ہی دکھ اور افسوس ہو رہا ہے۔"

یہ کہہ کر بابا کمرے سے باہر نکل گئے۔ بی بی جان [illegible] بیٹھی رہیں۔ آج راحیل ٹوٹ کر یاد آرہا تھا۔ [illegible] تھیں کہ بابا جان فیصلہ کر لیں تو سنتے نہیں [illegible] شاید انہوں نے زندگی میں دو تین ہی فیصلے کیے [illegible] گے۔ اب معاملہ میرے ہاتھ میں یا میری رائے کا [illegible] نہیں ہے۔

سائرہ کے لیے جو سخت جملہ منہ سے نکل گیا تھا، وہ [illegible] کھٹک رہا تھا۔

تب ہی سائرہ کی آواز آئی۔ "بی بی جان! آئیے [illegible] سے بنائے ہیں۔ گرم گرم چائے اور سموسے۔ [illegible] سے آئیے۔" بی بی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ [illegible] بھی کیسے؟ آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ اٹھ کر [illegible] گئیں۔ لیکن غیر ارادی طور پر سائرہ سے نظر نہیں ملا سکتی تھیں۔ مشکل سے ہی چائے زہر مار کی زبردستی سموسہ بھی چکھا۔ پھر رات کو کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ سوچتی تھیں شاید سائرہ ہی منع کر دے۔ فیصلہ انسان نہیں کرتا تعین کرنے والا تو رب العزت ہے۔

☼ ☼ ☼

بی بی جان کو نمکین کے خاص مسالہ جات خریدنے گزری جانا تھا۔ جہاں ان کی خاص دوکان تھی۔ دوکان صبح صبح کھلتی تھی اور نماز ظہر پر بند ہو جاتی تھی۔ بی بی جان کو یہ بات بھی اچھی لگتی تھی۔

بی بی جان کے نکلتے ہی ندا نے اپنے دفتر فون کیا کہ آج وہ دیر سے آئے گی۔ تین چائے کے کپ تیار کیے اور بابا جان کی اسٹڈی میں آگئی۔

"کہاں ہو سائرہ؟ بابا جان اور میری بنائی ہوئی چائے لائبریری میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

دونوں لائبریری میں داخل ہوئیں۔ بابا سعید پیالیوں میں چائے ڈال رہے تھے۔ سائرہ کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ "آپ کیا کر رہے ہیں؟ پلیز آپ بیٹھیے۔"

سائرہ نے بابا سعید کے ہاتھ سے کیتلی لے لی اور بیٹھ گئی۔ بابا نے سائرہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ندا کی آنکھوں میں آنسو آگئے جو اس نے چھپا لیے۔ ندا جانتی تھی یہ لمحہ بابا کے لیے کتنا تکلیف دہ ہے۔ سائرہ کے سر پر پیار کر کے بابا سعید نے کہا۔

"میری بچی تو میری زندگی ہے۔ میرے لیے بیٹا بھی ہے بہو بھی ہے اور لاڈلی بیٹی بھی ہے۔" سائرہ کچھ سمجھی اور نہیں بھی۔ آنکھیں اٹھا کر بابا سعید کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیا ہوا؟ آپ کیوں پریشان ہیں بابا سعید؟"

"تجھے آج میرا ایک کہنا ماننا پڑے گا۔ تو نے میرے سب فرائض ادا کرنے میں میرا ساتھ دیا ہے۔ ایک فرض میرے اوپر اور قرض ہے۔ میرا ساتھ دینا ہو گا۔"

سائرہ نے بابا سعید کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "ایسے کیوں کہہ رہے ہیں۔ آپ حکم دیجیے۔"

"میرے اوپر راحیل بہت بڑی ذمہ داری ڈال گیا ہے۔ میں اور بی بی کب تک تیرا ساتھ دیں گے؟ ماں باپ کو پہلے جانا ہوتا ہے۔ وہ اور بات ہے کہ ہمارے ساتھ گھڑی الٹی چل پڑی۔ اپنی قسمت سمجھ کر صبر کر لیا۔ لیکن تجھے میں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

سائرہ کے آنسو گر رہے تھے۔ سر نیچے تھا اور کچھ بولنے کے قابل نہیں تھی۔ ندا بھی بار بار اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

بابا پھر بولے۔ "ریحان بہت اچھا لڑکا ہے۔ فرخ اسے اپنا دوست مانتا ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ میں تجھے مجبور نہیں کرتا لیکن میں تجھے آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے تھوڑا وقت دیں بابا جان!" وہ آہستہ سے بولی۔

"تو اچھی طرح سوچ لے بیٹا! لیکن میری خوشی اسی میں ہے۔"

سائرہ نے خالی خالی آنکھوں سے بابا جان اور ندا کو دیکھا اور باہر جاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "جی بابا جان!"

☼ ☼ ☼

ریحان کام کے دوران بار بار بابا سعید کا چہرہ دیکھتا تھا۔ اپنا جواب ڈھونڈتا تھا۔ اپنے خواب کی تعبیر چاہتا تھا۔ بابا سمجھ گئے تھے۔ وہ ریحان کے چہرے پر سوال اور بے چینی دیکھ رہے تھے۔ آہستہ سے کہا۔

"میں نے سائرہ سے بات کی ہے۔ اس نے کچھ وقت مانگا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی۔" ریحان کو تھوڑا سا اطمینان ہوا۔

رات کو پھر ندا نے سائرہ کے کمرے میں پناہ ڈھونڈی۔ وجہ یہ تھی کہ بی بی جان ندا سے شادی کرنے کو کہہ رہی تھیں۔

ندا کا چہرہ دیکھ کر سائرہ ہنسی۔

"کیا ہوا؟ بچ کر آئی ہو؟"

"ہاں!" ندا نے پلنگ پر چڑھ کر پیر پھیلا دیے۔

"یار! تم کتنی خوش قسمت ہو۔ تمہیں کوئی ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ ایک میں ہوں۔"

"پہلی بات یہ کہ مجھے کوئی ٹوٹ کر یا پھوٹ کر نہیں چاہتا۔ دوسری بات یہ کہ تمہیں چاہنے والوں کی لائن لگائی جا سکتی ہے، لیکن وہ تمہارے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ پچھلے دو تین برسوں میں تمہارے لیے دو تین سو رشتے تو آئے ہوں گے۔"

ندا ناراض ہو کر بولی۔ "تمہارے خیال میں ٹیلی فون پر آنے والے رشتے سے یا بی بی جان کے ساتھ سموسہ کھانے کے لیے آنے والی خواتین کے بیٹوں سے میں شادی کر لوں؟"

سائرہ کو ہنسی آ گئی۔ "حق تو سب کو ہے۔"

"اب آگے تم بی بی جان کا جملہ بولو گی: جہاں ہیری ہو گی وہاں پتھر تو آئیں گے۔ مجھے کسی پتھر سے شادی نہیں کرنا۔"

"میرا مطلب ہے کہ میں اگر شادی کروں گی تو اس سے کروں گی جو مجھے چاہے گا۔ جیسے ریحان تمہیں چاہتا ہے۔"

سائرہ ایک دم اچھل پڑی۔ "کیا مطلب وہ مجھے کیسے چاہ سکتا ہے۔ میری بہن! یہ چاہت ضرورت ہوتی ہے۔ بہت سی شرائط کے ساتھ اور اگر میں ہاں کہوں گی تو شاید میں بھی ضرورت کے تحت ہی کہوں گی۔"

"ہاں کہہ دو، اسی میں تمہاری بہتری اور خوشی ہے۔" ندا سنجیدہ ہو کر بولی۔

سائرہ نے چہرہ جھکا لیا۔ آنسو بے قابو ہو گئے پھر ہمت کر کے بولی۔ "بابا جان ٹھیک کہتے ہیں، وہ کب تک میری ذمہ داری اٹھائیں گے۔ میں شادی کر بھی لوں مگر فرخ کو اس گھر سے دور کیسے کروں گی؟ بی بی جان کو تمکین کے ساتھ تنہا کیسے کروں گی؟ بابا سعید کی دلجوئی اور تمہاری دوستی... سب کچھ ایسے ہی ادھورا رہ جائے گا۔"

ندا نے خوشی سے سائرہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"دیکھو فرخ جہاں بھی ہو گا، وہ اسی گھر کا بچہ ہے۔ ریحان فرخ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں اور ایک بات اگر بابا سعید نے ریحان کو اچھی طرح نہ پرکھا ہوتا تو کبھی بھی یہ بات تم تک نہ آتی۔ اس طرف سے تو تم بے فکر رہو۔ میری پیاری بہن! میرے بوڑھے ماں باپ کے اوپر سے کم از کم ایک ذمہ داری تم کم کر سکتی ہو۔" سائرہ نے مسکرا کر اور پیار سے ڈانٹ کر کہا۔ "اور ذمہ داری جو تم کم کر سکتی ہو؟" ندا بولی۔

"میرا کیس اس وقت پینڈنگ (التوا) میں ہے۔ اپنی بات کرو۔ اچھا ایسا کرتے ہیں کہ تمہاری اور ریحان کی ٹھیک ٹھاک قسم کی ملاقات کروا دیتے ہیں۔ تمہارے دل میں جو سوال اٹھ رہے ہیں ان کا جواب مل جائے گا اور ریحان بھی اگر کچھ پوچھنا چاہے تو پوچھ سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" سائرہ نے سر نیچا کر کے کہا۔ "لیکن [illegible] مجھے [illegible] ذہنی طور پر [illegible] ہونے کے لیے وقت چاہیے۔"

"سائرہ! تم ہر معاملے کو پولیس ریمانڈ میں کیوں ڈال دیتی ہو؟ اگر ریحان سے مل لو گی تو فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا۔" ندا نے ہنس کر کہا۔

بس تگ و دو میں ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ سائرہ ہر اس [illegible] کو ٹوٹتا دیکھ رہی تھی جو اس نے بڑی محنت سے [illegible] تھی اور جب اسے بی بی جان کی مخالفت کا پتہ چلا تو وہ سچ کانپ گئی، لیکن بابا جان نے سارے مراحل خود ہی طے کیے۔ بی بی جان کو بھی رضامند کر لیا اور ریحان کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ بابا جان کو اپنے باپ کی جگہ ہی سمجھتا تھا۔ سائرہ کی کچھ شرائط تھیں جن پر ریحان بہ خوشی رضامند تھا۔ طے یہ ہوا کہ ریحان کے دفتر جانے کے بعد اپنے گھر کا کام ختم کر کے سائرہ اپنے میکے آ جایا کرے گی۔ (بی بی اور بابا جان کا گھر اب سائرہ کا میکا ہی تھا) بابا سعید فرخ کو اسکول سے گھر لے آیا کریں گے۔ وہ فرخ کا ہوم ورک اور دوسری پڑھائی کروائیں گے۔ گر کوئی پروجیکٹ ہے تو ریحان کروائے گا۔

سائرہ تمکین کا سب کام نمٹائے گی۔ اس کے بعد وہ فرخ کو لے کر اپنے گھر چلی جایا کرے گی۔ اس طرح اس گھر کی دنیا اسی طرح آباد رہے گی۔

ریحان اور سائرہ اب ہر بات بی بی جان اور بابا سعید کے سامنے ہی ڈسکس کرنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

نکاح کی تاریخ طے ہوئی تو بی بی جان نے نیلو بیگم کو بلا بھیجا۔ نیلو بیگم کچھ نہ سمجھتے ہوئے دوڑی چلی آئیں۔

آتے ہی بی بی جان سے سوال جڑ دیا۔ "کیا سائرہ راضی ہو گئی؟"

بی بی جان کی آنکھیں تعجب سے باہر نکل آئیں۔

"تمہیں کس نے بتایا؟ یہ شاہجہاں اس کی تو میں خبر لوں گی۔"

"ارے میں پوچھ رہی ہوں کہ سائرہ کوکنگ شو میں میری اینٹری پر راضی ہو گئی؟" نیلو بیگم جلدی سے بول پڑیں۔

"ارے نہیں نیلو بیگم!" بی بی نے چڑ کر کہا۔ "تم پہلے میری بات سنو۔ رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے زیادہ ہمارے لیے تم ہو تو میں نے سوچا۔"

نیلو بیگم نے جھٹ بات کاٹ دی۔ "پہلے آپ میری ایک بات سن لیں۔ آپ سائرہ اور شرجیل کا ڈیرہ وٹو (Diervatto) کروا دیں۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟" بی بی جان کانپ گئیں۔ بغیر وقفہ لیے نیلو بیگم نے بتایا۔

"گلال کا بھی ڈیرہ وٹو ہوا تھا۔ سسرال کے گھر میں جب کوئی بیوہ رہ رہی ہو تو اس کی شادی دوسرے بھائی سے کروا دی جاتی ہے۔ آپ فٹافٹ شرجیل سے کہیے کہ آپ اور سائرہ کے گلے میں منگل سوتر ڈال دے۔"

"نیلو بیگم! تم پاگل ہو گئی ہو۔" بی بی جان ناراضی سے بولیں "میری بات تو سنو۔ اپنی کہے جا رہی ہو۔"

"کم آپ بھی نہیں بول رہی ہیں۔" نیلو نے ناراض ہو کر کہا۔ "ٹھیک ہے بتایئے میں اب بولی تو جو چور کی سزا وہ آپ کی، سوری میرا مطلب۔"

بی بی جان نے چڑ کر کہا "تمہارا مطلب میں سمجھ گئی۔ تم میری بات سنو۔ اگلے ہفتے سائرہ کا نکاح ہے۔" نیلو بیگم نے دل تھام لیا۔

"میرے دل کی بات پوری ہو گئی۔ شرجیل آ گیا کیا؟"

بی بی جان نے پھر ڈانٹا "نیلو بیگم تم بات سنو گی یا نہیں؟"

"اچھا اچھا معاف کر دیں۔ بتایئے؟" پھر بی بی جان شروع ہوئیں۔

"اگلے ہفتے سائرہ کا نکاح ریحان کے ساتھ ہے۔" نیلو بیگم اچھل پڑیں۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ یعنی اب تمکین کا شو میں کروں گی؟"

اب بی بی جان نے بھی اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگا لیے۔

"وہ کون سا لمحہ تھا جو میں نے تمہیں بلوایا؟ سنو غور سے ہم خاندان کے چار چھ لوگوں کو ہی بلا رہے ہیں اور پڑوس سے صرف تمہیں اور کاردار صاحب کے گھر والوں کو بلا رہے ہیں۔ یہ بات تم تک ہی رہے۔ لوگ مبارک باد کے بہانے فون کریں گے یا باتیں بنانا شروع کر دیں گے، لہٰذا بابا جان کا خیال ہے کہ نکاح میں جتنے لوگ ضروری ہیں بس اتنے ہی آئیں۔"

نیلو بیگم سے نہ رہا گیا۔ "آپ کو یقین ہے کہ ریحان دو جوان [illegible] شادی کرنا چاہتا ہے، ڈرائے نہیں؟"

[illegible]

نیلو بیگم کچھ دیر سوچتی رہیں پھر اٹھ کر بے چین سی ادھر ادھر دیکھتی رہیں اور چلی گئیں۔

اس شادی کی نہ کوئی تیاری ہوئی، نہ شامیانے لگے، نہ مہمان جمع ہوئے، نہ ڈھول بجا۔ نہ کسی نے رخصتی گائی بس دلہن رخصت ہوئی۔

فرخ آج گھر پر ہی رک گیا تھا۔ وہ دن کی چھٹی کے بعد ماں کے پاس چلا جائے گا۔ بی بی جان اور بابا سعد کے دکھ الگ الگ تھے لیکن آنسو سائرہ کی وداعی کے لیے ہی تھے۔ سائرہ کی آنکھیں سونی تھیں۔ اسے اپنے مستقبل میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن ندا کی آنکھوں میں وہ آنسو تھے جو اپنی بہت پیاری چیز کسی پیارے کو سونپتے وقت ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی تھی کہ کسی کو بتا نہ سکے کہ وہ ریحان کو پسند کرنے لگی تھی۔

آصفہ عنبر قاضی

میں زندگی کو اپنے طور اور ڈھب سے جینا چاہتا تھا مگر اس ڈر سے کہ "لوگ کیا کہیں گے؟" نہیں جی پایا۔ میں نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تو اپنی ماں کو بھی لوگوں کے خوف میں مبتلا پایا۔ ہمارے گھر کو کسی چیز نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا اس خوف نے کہ "لوگ کیا کہیں گے؟" مجھے لگتا تھا گھر کے ہر کونے اور کھدرے میں لوگ چھپ کر بیٹھے ہیں، جو ذرا سی بھول چوک پر طعنے دیں گے، ہنسیں گے اور حیرت سے منہ میں انگلی داب لیں گے۔ ہمارے نجی معاملات بھی جیسے [illegible] کے ہاتھ میں تھے۔ ابا اور اماں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے [illegible] طویل غور و خوض کرتے کہ لوگ باتیں تو نہ بنائیں گے۔ ہر فیصلے میں تیسرا اور اہم فریق وہ ہی ہوتے، ان ہی لوگوں کی وجہ سے مجھے کبھی کبھی خود پہ مصنوعی غلاف چڑھانا پڑتا۔

میں میاں فضل کریم کا بیٹا تھا جو مولوی ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت بھی چلاتے تھے۔ اپنے ہم عمر لڑکوں کو دیکھ کر میرا بھی دل پتلون اور کوٹ پہننے کو چاہتا مگر اس ڈر سے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ مولوی صاحب کا بیٹا فرنگیوں کا لباس پہنتا ہے، میں شلوار قمیص پہنتا اور کبھی موقع ملتا تو دوستوں کے ساتھ چھپ چھپ کر فلمیں دیکھتا۔ مجھے کبھی کبھی خود پر اینگلو انڈین کا گمان ہونے لگتا جو پورے ہندوستانی تھے نہ انگریز، میں ملا بھی نہ بن سکا اور ماڈرن ازم سے بھی دور رہا۔

میں تین بہنوں کے بعد بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہوا تھا، میرے سفید پوش والدین کے لیے اللہ کا تحفہ بجا طور پر کافی تھا۔ مگر محلے والوں کے خوف سے اور رشتہ داروں میں اپنی ناک اونچی رکھنے کی خاطر انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر میری پیدائش کی خوشی منائی۔ گلی کے نکڑ پر ابا کا چھوٹا سا دیسی دواخانہ تھا۔ جس سے بمشکل گزر بسر ہو رہی تھی، میرے عقیقہ پر جو خرچا [illegible] وہ سب قرض لیا گیا تھا۔ پیدائش پر جو مٹھائی اور [illegible] جوڑے تقسیم کیے گئے [illegible] ان کا قرض اتارنے میں ابا کو [illegible] سال لگ گئے اور ان دنوں گھر میں کھانے کو صرف [illegible] [illegible]

میں [illegible] [illegible] تین [illegible] بہنیں [illegible] بیل کی طرح اماں، ابا کے سینے پر دھری تھیں۔ [illegible] منگنی میرے ماموں زاد سے ہو چکی تھی، زینب میٹرک کر چکی تھی اور عاشی باجی نے مڈل تک پڑھنے کے [illegible] قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ میں انٹر کے بعد مزید [illegible] [illegible] [illegible] تھی، [illegible] صحت [illegible] پہلے جیسی نہ تھی، میں کچھ دن تو دواخانے پر بیٹھا رہا، بے سود۔ آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا۔

"کل میرے شاگرد کا بیٹا ملنے آیا تھا مطب [illegible]" رات کو کھانا کھاتے ہوئے جب میں بھی پاس بیٹھا [illegible]، ابا نے اماں کو مخاطب کیا۔

"وہ ملک احسان کا بیٹا؟" اماں نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہی، پچھلے کئی سالوں سے باہر ہوتا ہے۔ [illegible] نے اپنے اجمل کی بات کی ہے اس سے کہ [illegible] باہر کوئی کام دھندا تلاش کردے۔" ابا نے [illegible] پانی اٹھاتے ہوئے کہا، میں سامنے والی چارپائی پر [illegible] بیٹھا تھا۔

"پھر کیا کہا اس نے؟" اماں متجسس ہوئیں۔

"کہہ رہا تھا جلد ہی کاغذات [illegible] [illegible] کام بن جائے گا۔" [illegible] نے اطمینان سے کہا۔

"ہو جائے تو اچھا ہے۔ ان کا بیٹا کیا باہر گیا، وارے نیارے ہو گئے ان کے، یہ اتنا بڑا گھر بنایا ہے انہوں نے [illegible] میں۔" اماں حسرت سے تصویر کشی کرتے ہوئے بولیں، حالانکہ انہوں نے ان کا شہر والا گھر دیکھا تک نہ تھا۔ تھوڑی دیر [illegible] تھا، [illegible] [illegible] کھلے بالوں سے۔

"پر [illegible] کے لیے پیسوں کا بندوبست بھی تو کرنا ہے، میں سوچ رہا تھا کسی سے ادھار پکڑ لوں پھر ادا کر دوں گا۔" ابا کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے بولے۔

"یہ بھی ٹھیک ہے حکیم صاحب! خیر سے اجمل باہر چلا گیا تو پھر کاہے کی کمی۔" وہ فخر سے میری طرف دیکھ کر بولیں۔

میں یوں ہی بیٹھا رہا۔ مجھے اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کا بہت قلق تھا، میرے لیے کمانے سے زیادہ

پڑھائی مکمل کرنا اہم تھا۔

"اجمل میاں! بولتے کیوں نہیں ہو، گونگے کا گڑ کھالیا ہے کیا؟" اماں نے قدرے درشتی سے کہا تو میں نے جیسے "ابا کی مرضی" کہہ کر چپ سادھ لی۔

* * *

میرا بیرون ملک جانا آپا کے جہیز کے لیے بھی بہت ضروری تھا۔ وہ اپنی عمر کی چھبیسویں منزل پر پہنچ گئی تھیں۔ مگر اماں اور لوگوں کا مطلوبہ سامان ابھی تک خریدا نہیں گیا تھا۔

ڈیڑھ ماہ کے بعد میرا کویت کا ویزا لگ گیا۔ سب گھر والے میرے ملک سے باہر جانے پر بہت خوش تھے۔ اداس تھا تو صرف میں مگر یہ سوچ کر دل کو ڈھارس بندھائی کہ اچھے وقت کے لیے برا وقت تو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں بھون سکتا تھا، ابا کے بس میں کہاں تھا کہ وہ تین بیٹیوں کی رخصتی کرسکتے، کویت آکر میں نے آرام کو اپنی لغت اور ترجیحات سے نکال دیا۔ صرف اکیس سال کی عمر میں، میں اپنے دیس سے دور تنہائی کی زندگی بسر کرنے آگیا تھا۔

میں سیسہ پگھلانے والی فیکٹری میں ایک ادنیٰ سے درجے پر کام کرنے لگا۔ میری سماعتیں مشینوں کی گھرر گھرر اور شور کی اتنی عادی ہوگئی تھیں کہ مجھے سکوت ہولانے لگتا تھا۔ فیکٹری سے چھٹی ہوتی تو اوور ٹائم لگالیتا۔ مالکان مزدوروں کے جسم کا تیل نکال لیا کرتے تھے اور میں بھی تقریباً" فراموش کر بیٹھا تھا کہ میں مشینی پرزہ نہیں بلکہ گوشت پوست کا زندہ انسان ہوں۔

مجھے کویت آئے ہوئے تیسرا سال ہونے کو آیا، میرے خون پسینے کی کمائی میرے والدین کی فکر کم کررہی تھی۔ میں نے سنا تھا، آپا کی بہت دھوم دھام سے شادی ہوگئی ہے، اماں نے من چاہا جہیز بھی دیا، جس پر خاندان اور محلے والے حیرت اور حسد بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ میں آپا کی شادی میں شریک ہونا چاہتا تھا کہ اس بہانے سب سے ملاقات بھی ہوجاتی، مگر ابا نے سختی سے منع کردیا کہ آنے جانے میں اتنا خرچا اٹھ جاتا ہے کہ اس سے چھوٹی کا آدھا جہیز بن سکتا تھا۔ میں نے ابا کی خواہش [illegible] جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

میں نے فیکٹری کے مینیجر سے تنخواہ میں اضافہ کرنے کی استدعا کی، انہوں نے چند سو دینار کا اضافہ [illegible] مجھے ایک بار پھر ہمت پکڑنے پر اکساتا اور میں پہلے سے زیادہ دل جمعی سے کام میں لگ جاتا۔

ابا نے فون پر بتایا تھا کہ انہوں نے گھر کی نئے سرے سے تعمیر کروائی ہے، چھت پر موجود اٹاری گرا کر اسے دو منزلہ خوب صورت مکان کی شکل دے دی گئی تھی۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں اپنے مکان کی تصویر بناتا رہتا۔ زینب باجی کا رشتہ بھی طے ہوگیا تھا اور عنقریب شادی ہونے والی تھی، مجھے جہیز کی اشیا کی ایک طویل فہرست فون پر سنائی گئی، جس میں بہت سی چیزیں غیر ضروری تھیں، میں نے دبے لفظوں میں اظہار کیا تو اماں کو ناگوار گزرا۔

"[illegible] آج کے دور میں اتنا تو کرنا پڑے گا، [illegible] [illegible] رخصت کیا تو لوگ کیا کہیں گے۔"

ایک بار پھر وہ ہمارے فیصلے پر اثر انداز ہوئے تھے۔ میں نے فون رکھ دیا۔ زینب کی شادی پر میں نے پاکستان جانے پر اصرار نہیں کیا، مجھے پتا تھا وہ سب میرے لیے اداس ہوں گے اور اس بار ابا مجھے خود شادی میں شرکت کرنے پر زور دیں گے مگر میرا انتظار، انتظار ہی رہا۔ میرا وہاں جانا اتنا ضروری نہیں تھا جتنا ملک سے باہر رہ کر کمانا۔ زینب باجی کی شادی بھی میرے بغیر ہوگئی۔

* * *

مجھے کویت میں کام کرتے چھ سال ہوگئے تھے۔ ابا نے دواخانہ بیچ دیا تھا، وہ ابا جو اپنی جسمانی کمزوری کے پیش نظر کبھی کبھار معجون لے لیا کرتے تھے، اب گھر میں بیٹھ کر مہنگی مہنگی ملٹی وٹامن ادویات کھاتے تھے۔ کچھ ماہ بعد اماں نے فون پر میرے رشتے کی بات [illegible]

وہ میری پھوپھو زاد مہرین سے میرا رشتہ طے کرنا چاہ رہی تھیں۔ کماؤ پوت ہونے کی وجہ سے اب رشتے خود [illegible] ان کے پاس آرہے تھے۔ انہوں نے مہرین کا [illegible] کرلیا، میں بہت خوش ہوا، مہرین کا سراپا میری [illegible] میں گھوم گیا، وہ ایک معصوم اور دلکش لڑکی تھی، میں بچپن سے ہی اس کا مداح تھا اور اسے دل میں [illegible] رہتا تھا۔

میں اماں کے فیصلے پر مسرور سا ہوگیا اور خیالوں ہی خیالوں میں مہرین کو اپنی بیوی کے روپ میں دیکھنے لگا۔ [illegible] ماہ بعد عاشی کی [illegible] تھی، ابا نے مجھے بھی آنے کے لیے کہا، میں نے خوشی خوشی سامان باندھا، فیکٹری سے صرف ایک ماہ کی چھٹی مل سکی، مگر میں اس پر بھی مطمئن تھا۔ میں سات سال بعد پاکستان آیا تھا۔ گھر کے [illegible] بدل چکے تھے۔ ابا پہلے سے زیادہ صحت مند [illegible] رہے تھے۔ سات سال [illegible] اور ان تھک محنت نے میرے [illegible] کردیا تھا۔ میرا جسم [illegible] اماں کے [illegible] منظر [illegible] عاشی کی [illegible] میری منگنی [illegible] [illegible] ایک ماہ گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا، اس عرصے میں دو تین بار مہرین سے [illegible] میں [illegible] زندگی کے خواب [illegible] واپس آگیا۔ ابھی زندگی کے لیے [illegible] باقی تھی۔ میں ایک بار پھر مشین کا پرزہ بن گیا [illegible] جہیز میری عرق ریزی کے بغیر مکمل نہیں [illegible] تھا۔ میں عمر کے تیسویں سال میں تھا، مگر لگتا [illegible] کا تھا، اضمحلال اور پژمردگی میرے چہرے کا حصہ بن چکی تھی۔ بندہ مزدور کے اوقات کس قدر تلخ [illegible] ہیں، مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔ میں تھک گیا تھا۔

میں نے سنا تھا، مہرین کے گھر والے شادی پر اصرار کررہے تھے۔ مگر ابا انہیں مزید انتظار کرنے کا کہہ کر مطمئن ہوگئے۔ وہ بیٹی والے تھے اور بیٹی کو کتنا عرصہ دہلیز پر بٹھائے رکھتے۔ اماں نے اب کی بار مجھ سے فون پر بات کی تھی تو وہ مہرین کے گھر والوں کے رویے سے نالاں نظر آرہی تھیں، ان کی باتوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ ابھی مزید دس سال بھی میری شادی کے حق میں نہیں تھیں۔

اسی سال عاشی کی شادی بھی ہوگئی، میرا وہاں موجود ہونا ہر بار کی طرح اتنا ضروری نہیں تھا۔ عاشی کی شادی کے کچھ روز بعد اماں نے فون پر مجھے جو خبر سنائی، مجھے نڈھال کردینے کے لیے کافی تھی۔ مہرین کے گھر والوں نے رشتہ ختم کردیا تھا۔ وہ اتنا لمبا انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ میرا خوابوں کا نگر زمیں بوس ہوگیا تھا۔ میری یہاں پہ رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہوگئی تھی۔ پچھلے تین سالوں سے جس لڑکی کو میں سپنوں میں اپنے ہمراہ دیکھ رہا تھا۔ اس سے یوں دستبردار ہوجانا اتنا آسان نہیں تھا۔ میں ایک دم ٹوٹ پھوٹ سا گیا تھا۔ میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا تھا۔

اس شام مجھے کمر میں اینٹھن سی محسوس ہوئی، مگر میں نے توجہ نہیں دی، اب میں نے اپنے آپ کو اہمیت دینا چھوڑ دی تھی۔ جب درد زیادہ بڑھا تو ڈاکٹر کے پاس چلا گیا، اس نے تشخیص کیا کہ زیادہ دیر کھڑے ہو کر کام کرنے کی وجہ سے میری ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے۔ اس نے کچھ دوائیں لکھنے کے بعد آرام کا بھی مشورہ دیا، میں تلخی سے مسکرا دیا اور نسخہ ہاتھ میں پکڑ کر کلینک سے باہر آگیا۔ اس تکلیف کے بعد میں نے اوور ٹائم لگانا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے سانس کی تکلیف بھی ہونے لگی، سیسہ پگھلانے والی فیکٹری کے مضر ذرات میرے پھیپھڑوں کو متاثر کرنے لگے تھے۔ میں نے دانستہ طور پر اپنی گرتی صحت کا اماں اور ابا سے ذکر نہ کیا، ان کو خواہ مخواہ پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

میری جلاوطنی کو پندرہ سال ہوچکے تھے۔ اور ان پندرہ سالوں نے میری جوانی، شوخی اور بانکپن کو نگل لیا تھا۔ میں اجمل کریم ویسا نہ رہا تھا جیسا تھا۔

* * *

شیو کرتے ہوئے میں نے آئینے میں دیکھا تو ایک

لمحے کو میرے حرکت کرتے ہاتھ رک سے گئے۔ میرے سر میں سیاہی کم اور سفیدی زیادہ تھی۔ چہرے پر زردی تو پہلے ہی کھنڈی تھی اور اب چاندی کے ان تاروں نے جیسے میرے [illegible] پر مہر تصدیق ثبت کردی تھی۔ میں نے بے دلی سے منہ دھویا اور آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔ رات کو اماں نے بتایا تھا کہ ابا کی طبیعت بہت خراب ہے اور مجھے جلد از جلد آجانا چاہیے۔ میں نے دوسرے روز ہی فیکٹری سے چھٹیاں لیں اور پاکستان واپس آگیا۔ ابا کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ ان کا دایاں حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ میں ان کی پائنتی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ تیمارداری کرنے والے آتے تو ان کے بجائے میری پرسش کرتے کہ ابا کی نسبت میں زیادہ کمزور لگتا۔ اب ابا کی حالت ایسی نہ تھی کہ میں دوبارہ ملک چھوڑ کر چلا جاتا ویسے بھی اتنا کما کر یہاں بھیج دیا تھا کہ گزر بسر آرام سے ہو سکتی تھی۔

میں نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ابا کا علاج ہو رہا تھا مگر ڈاکٹر زیادہ پرامید نہ تھے۔ میں اپنی سی کوشش میں لگا رہا۔ میری تینوں بہنیں اپنی اپنی ازدواجی زندگی میں خوش و خرم تھیں۔ وہ کبھی کبھی آتیں اور تھوڑی دیر ابا کے پاس بیٹھ کر چلی جاتیں۔

میں کوئی کاروبار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن فی الحال کچھ دن آرام کرنا چاہتا تھا۔ پندرہ سالوں کی تھکن میری پور پور میں اتر گئی تھی۔

اب لوگ آتے تو مجھے دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرنے سے نہ چوکتے۔ میرے گھر کے کونوں کھدروں سے بھی لوگوں کی آنکھیں جھانکنے لگی تھیں۔ تمسخر سے بھری ہنستی ہوئی اور ترحم آمیز نظریں اور میں ان سے چھپتا پھرتا۔ دن بھر کے فقرے جو میری سماعتوں سے ٹکراتے، رات کو مجھے سونے نہ دیتے۔

"اے ہے! یہ اپنا اجمل ہے۔ دیکھو تو کیسا کھوسٹ ہو گیا ہے۔ میں تو سمجھی جوان بچے ہوں گے پر ابھی تک کنوارا پھر رہا ہے۔"

گلی کا موڑ مڑتے ہوئے خالہ زبیدہ نے کسی سے آہستگی سے کہا تھا۔ مگر میں نے سن لیا تھا اور پھر ساری رات اس بات پر کلستا رہا۔ اماں نے ایک دو جگہ میرے رشتے کی بات کی مگر چل نہ سکی۔ وہ آخر مجھ سے [illegible] اور پھر چپ سادھ لی۔ ایک شام آپا آئیں تو اماں نے بات چھیڑی۔

"کلثوم! اپنے اجمل کے لیے بھی کوئی لڑکی تلاش کرو۔ اب تو لوگ باتیں بنانے لگے ہیں، خیر سے چالیس کا ہونے والا ہے۔" اماں نے پلنگ صاف کرتے ہوئے آپا سے کہا۔

"دیکھتی ہوں اماں!" وہ اپنے بیٹے کے منہ میں نوالہ ٹھونستے ہوئے لاپروائی سے بولیں۔

"ہاں مگر ذرا جلدی۔ تیرے ابا کی حالت بھی آئے روز خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے، میں چاہتی ہوں وہ بھی بیٹے کی خوشی دیکھ لیں۔"

"کوشش کرتی ہوں اماں! پر اجمل کی عمر دیکھی ہے آپ نے؟ اب تو جو بھی اور جیسا رشتہ بھی ملے قبول کر لیں [illegible] بھائی جیسے [illegible] شادی ہو گی تو اب کوئی مشکل سے ہی ملے گی۔"

برآمدے میں بظاہر منہ پر بازو رکھے میں جاگ رہا تھا۔ آپا کی بات سن میرا دل [illegible] کٹ سا گیا تھا۔ آپا بات شاید بھول چکی تھیں کہ ان کی کلائیوں میں چھن چھن کرنے والی سونے کی چوڑیاں اور [illegible] بابر اور محسن بھائی کی نئے ماڈل کی موٹر سائیکل میری دن رات خواری کا ثمر تھی۔ میں ایک طویل سانس کھینچ کر رہ گیا۔

"مگر تمہاری چھوٹی نند بھی تو ہے، اس کی بابت بات چلا کے دیکھو۔" اماں کو اچانک خیال آیا۔

"توبہ کریں اماں! اس کی اور اجمل کی عمر میں فرق دیکھا ہے۔ محسن تو کبھی نہیں مانیں گے، ان کے سامنے یہ بات بھی مت کیجیے گا۔" وہ تڑپ کر بولیں۔

"مگر بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟" اماں مصر تھیں۔

"آپ سمجھ نہیں رہیں۔ اماں! پہلے کی بات اور تھی، اجمل کی صحت دیکھیں اور پھر اب تو وہ پاکستان آگیا ہے، وہاں ہوتا تو بات بن سکتی تھی، اب بے روزگار مرد کو کون بیٹی دے گا، میں سنعیہ کو بیٹھے بٹھائے کے پلے باندھ دوں، لوگ کیا کہیں گے۔"

[illegible] نے کٹھور لہجے میں کہا تو میں تلخی سے مسکرا دیا۔ [illegible] لوگوں نے اس وقت کیوں کچھ نہیں کہا، جب میں [illegible] اکیس سال کی عمر میں پیسہ کمانے کی مشین بن گیا [illegible] کسی نے میرے بارے میں نہیں سوچا، لوگوں نے [illegible] وقت کچھ کیوں نہیں کہا، جب کسی بہن کی شادی پر [illegible] موجود نہیں تھا اور لوگ اس وقت کیوں نہیں [illegible] جب جو فرمائشوں اور لالچ کے پیش نظر میری [illegible] میری شادی کی جاتی رہی اور وہ لڑکی بھی میری زندگی [illegible] نکل گئی جسے میری بیوی بنانے کا کہا گیا تھا۔ یہ [illegible] غلط موقع پر کیوں بولتے ہیں، سوچ سوچ کر [illegible] [illegible] سامنے [illegible] مضمحل تو میں [illegible] آپا کی بات نے [illegible] کی ذرا سی [illegible] ختم کر دی۔

* * *

[illegible] نے ہمت نہیں ہاری تھی، انہوں نے رشتے [illegible] والی ایک خاتون سے رابطہ کیا اور ان کی مراد [illegible] جلد ہی [illegible] انہوں نے اس کو ایک گھر دکھایا۔ وہ دن [illegible] کلثوم کے ساتھ لڑکی دیکھنے گئیں اور پسند [illegible] وہ لوگ بھی مجھے قبولیت کی سند بخش کے [illegible] میرے دل پر جو مردنی سی چھائی ہوئی تھی، وہ ذرا [illegible] سی گئی۔ بہت سادگی سے نسبت طے کی گئی۔ [illegible] آتے جاتے لڑکی کے سلیقے اور سگھڑاپے کے [illegible] پڑھا کرتیں اور میں ابا کی پائنتی پر بیٹھا دل ہی [illegible] مسرور ہوتا رہتا۔

[illegible] کو اب شادی کی جلدی تھی، جیسے ہی شادی کی [illegible] طے ہوئی میں نے از سر نو اپنا جائزہ لیا اور مایوسی [illegible] جسم تو میرا اسی طرح خستہ استخوان تھا۔ مگر بالوں کو رنگا جا سکتا تھا، میں نے سر کے بالوں اور مونچھوں پر خضاب [illegible] جوبن لانے کی سعی کی اور اس میں کسی قدر کامیاب بھی رہا۔ گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں، میں اگرچہ کسی معاملے میں دخل نہیں دیتا تھا، مگر دیکھتا ضرور تھا۔

میری ہونے والی دلہن کے لیے مختصر سی بری تیار کی گئی تھی، جس میں سستے اور عامیانہ قسم کے کپڑے اور جوتے شامل تھے۔ بہرحال جو بھی تھا، میں اسی پر مطمئن تھا کہ میری تنہائی بھی اب ختم ہونے کو تھی۔ ابا کی بیماری کے پیش نظر بہت سادگی سے شادی انجام پائی۔ بہت کم لوگوں کو گھر میں مدعو کیا گیا تھا اور بارات کا استقبال کرنے والے بھی گنے چنے لوگ تھے، یہ اور بات کہ ان گنے چنے لوگوں کی دبی دبی سرگوشیاں بھی میری سماعتوں کو زخمی کرتی رہیں۔ خضاب میرے بالوں کی سفیدی تو چھپا گیا تھا، مگر گزرے ماہ و سال کی جو تلخ پرچھائیاں میرے چہرے پر ثبت تھیں، وہ کسی کی نظر سے مخفی نہیں تھیں۔

شادی کی پہلی رات کی اولین ساعتوں میں ہی یہ عقدہ کھلا کہ میرے لیے بڑے چاؤ سے لائی جانے والی عظمیٰ لڑکی نہیں خاتون تھی۔ اگر عمر مجھ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھی۔ میں اپنی سوختہ بختی پر ایک بار پھر مسکرا دیا تھا۔ خوشی اس لیے بھی ہوئی کہ اب عمروں کا فرق نہیں تھا، ورنہ اس تضاد پر بھی دنیا بہت کچھ کہتی۔ عظمیٰ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی، کم از کم اس معاملے میں، میں خوش قسمت ثابت ہوا تھا۔ وہ ایک سفید پوش گھرانے سے آئی تھی اور بہت صابر اور قانع تھی۔ میں اس کا اور وہ میرا خیال رکھتی تھی، مجھے لگا میرے دلدر دور ہو گئے ہیں۔

میں اپنے ساتھ جو تھوڑے بہت پیسے لایا تھا، وہ شادی اور ابا کے علاج پر صرف ہو گئے تھے۔ اب میں سنجیدگی سے کوئی کاروبار کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے کاروبار کے لیے سرمائے کی فکر نہ تھی کیونکہ

عاشی کی شادی کے بعد بھی میں کئی سال تک اماں کو باقاعدگی سے پیسے بھیجتا رہا تھا جو یقیناً "میری شادی اور کاروبار کے لیے اماں نے محفوظ کر لیے تھے۔ اب مجھے ان پیسوں کی ضرورت تھی۔ زیادہ نہیں تو میرا اندازہ تھا کہ چھ، سات لاکھ کی رقم ضرور ہوگی، دوسرے روز میں نے اماں سے رقم کی بابت پوچھا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگیں۔

"میں ہر ماہ آپ کو چالیس سے پچاس ہزار تک بھیجتا رہا ہوں، وہ کہاں گئے؟" میں حیران تھا۔

"ارے کہاں جانے تھے۔ تیری تین بہنوں کی شادیوں پہ اتنا خرچ اٹھا پھر یہ بڑھتی ہوئی مہنگائی..." وہ سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔

"وہ تو ٹھیک ہے اماں! پر ان تینوں کی رخصتی کے بعد بھی میں نے سات سال مزید وہاں لگائے اور برابر پیسہ بھیجتا رہا، وہ کہاں گئے اور آپ دو افراد کا خرچ کتنا ہو سکتا ہے۔"

میں [illegible] سے قاصر تھا کہ وہ لاکھوں روپیہ آخر [illegible] کہاں گیا، پھر جلد ہی یہ معمہ حل ہو گیا۔ اماں کو اچانک یاد آگیا کہ انہوں نے دو سال پہلے زینب کے میاں کی فرمائش پہ گاڑی خرید کر دی تھی تقریباً ساڑھے چار لاکھ تو اس مد میں بینک سے نکل گئے تھے اور پچھلے سال آپا کلثوم نے گھر علیحدہ بنایا تو وہ اکثر محسن بھائی سے مانگتے تھے، لیا تو قرض تھا مگر وہ لے کر شاید فراموش کر بیٹھے تھے۔ اماں نے کل ملا کر اسی ہزار میرے ہاتھ پر رکھا تھا، میں گنگ سا اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہا تھا اور عظمیٰ مجھے۔ بڑی مشکل سے ضبط کیے بیٹھا تھا۔

میری خواری اور جلاوطنی میرے اپنے کام نہیں آئی تھی۔ میں اتنی مسافرت بھوگنے کے بعد بھی خالی ہاتھ رہ گیا تھا۔ عظمیٰ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے دبایا تھا، میں چپ بیٹھا تھا اور کر بھی کیا سکتا تھا، ایک خوش حال زندگی بسر کرنے کے سارے خواب ملیامیٹ ہو گئے تھے۔ رات کو اس نے اپنی سونے کی چوڑیاں میرے سامنے بیڈ پر لا کر رکھ دیں۔

"آپ کو بزنس کرنا ہے تو یہ بیچ دیجئے، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی تو میں اس کے چہرے کو دیکھنے لگا، میں خونی رشتوں کا ڈسا ہوا تھا اسے [illegible] شک سے دیکھنے لگا۔

"نہیں۔ تم اسے اپنے پاس رکھو، میں نے سوچا ہے کہ پھر کویت چلا جاؤں، آخر کچھ تو کرنا ہے۔" میں نے چوڑیاں اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں! آپ کہیں نہیں جائیں گے۔"

وہ میرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے آپ کی ضرورت ہے پیسوں کی نہیں۔" اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔ "ہم روکھی سوکھی کھائیں گے، اپنی تو ہوگی۔ بڑا بزنس نہ سہی، کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرلیں، مگر یہاں رہ کر۔"

اس نے میرے دل میں محبت کی بے پایاں [illegible]

[illegible] ضرورت تھی۔۔۔ جو [illegible] مشکل۔

وطن سے دوری کا عرصہ تمام کیا تھا۔ وطن سے باہر رہ کر پیسہ کمانے کے لیے کتنی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا احساس ان لوگوں کو نہیں ہوتا جو گھر بیٹھ کر پورا [illegible] دینار وصول کرتے رہتے ہیں۔ میں [illegible] سالوں [illegible] دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

میں نے [illegible] کی بات پر عمل کیا اور اسی ہزار سے شروعات کرنے کا سوچا۔ گلی کے نکڑ پر میں نے ایک دواخانہ [illegible] لیا تھا۔

اٹھارہ برس بعد میں وہیں تھا جہاں سے چلا تھا، مجھے اب اس بات کی مطلق پروا نہیں تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔

سائرہ عارف

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غرور ہے۔ بچپن کا منگیتر باوجود خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے ٹکر لے کر ان سے شادی کرلی۔ لیکن کبھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انھیں اپنی بڑی بیٹی ماہین سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل وصورت میں ددھیال پر پڑی ہے۔ جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان کا پرتو ہے۔ سارا علوی اور میرب ہر وقت ماہین کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس سے ماہین اپنے رنگ کے معاملے میں حساس ہوگئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کریمیں لا کر دیتی ہے اور یہ [illegible] ہوتی ہے۔ گھر میں وہ نواز اکرم کے قریب ہے، لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے نفسیاتی طور پر تنہا کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے، لیکن سارا علوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی کے گھر آنے سے کتراتی ہے۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب [illegible]

[illegible] اپنے شوہر [illegible] کے انتقال کے بعد [illegible] اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ [illegible] کے بچپن کا دوست [illegible]

ناولٹ

کاشف کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر کرتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے جب کاشف ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دور رہے لیکن کاشف اقبال کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقد ثانی کر لیتی ہے۔

شادی کے فوراً بعد اقبال اپنا اصلی روپ دکھاتا ہے اور ماں بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا خرچہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف [illegible] نواز اکرم کے یہاں بطور ڈرائیور کام کرتا ہے اور کبھی کبھار ہی ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۴
چوتھی قسط

"یہ کاشف آج کل کچھ زیادہ ہی گھر آنے لگا ہے۔" سارہ کو وہ معمولی سا کلرک جو کبھی کبھار ڈرائیور کا فرض بھی ادا کر دیتا تھا، کبھی بھی پسند نہیں آیا تھا۔ حالانکہ کاشف خوب صورت، خوش شکل اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ فرماں بردار بھی تھا۔ اس کے باوجود وہ سارا کی گڈ بک میں جگہ نہیں پا سکا تھا کیونکہ اس کی ساری خوبیوں پر اس کی ایک خامی غریب ہونا ہی غالب تھا۔

سارا کو غربت سے نفرت تھی۔ وہ ہر اس بندے سے دور بھاگتی تھی جس کے اندر اسے اپنے ماضی کی چھوٹی سی جھلک بھی نظر آتی تھی اور ہر وہ چیز جو اسے احساس دلاتی کہ یہ غربت کی علامت ہے یا اسے کوئی غریب استعمال کرتا ہو گا۔ اسے سارا نواز پسندیدگی کے باوجود ویگن بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اور یہی معاملہ کاشف کے معاملے میں بھی تھا۔

پہلے کبھی کبھار، پھر بار بار اور اب روزانہ کسی نہ کسی کام سے وہ ضرور گھر کا چکر لگاتا بھلا سارا کی نظروں سے کیسے اوجھل رہ سکتا تھا اسی لیے اس نے رات کو نواز اکرم سے بھی اس کے آنے کا سبب پوچھا تھا۔

"کاشف اچھا لڑکا ہے سارا! تمہارا کیا خیال ہے؟" نواز اکرم کے سوال در سوال پر اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

"کس سلسلے میں؟"

"ماہین کے لیے۔" نواز اکرم کے جواب دینے سے قبل ہی وہ سمجھ گئی تھی مگر اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی۔

"ماہین کے لیے، ہاں اچھا ہے مگر ماہین سے چھوٹا ہے شاید۔"

"بہت زیادہ نہیں۔ ایک دو سال کا فرق ہو گا بس۔"

"ہوں۔ تم نے اس سے بات کی؟" سارا کی نظر پر نواز اکرم بھی سامنے تھا۔

"ابھی تو نہیں کی، فی الحال تو میں جانچ رہا ہوں اسے۔ بات تو اس کے والدین سے ہی ہو گی۔"

"ہوں۔ بس زیادہ جانچ پڑتال میں نہ پڑو۔ وہ راضی ہو جائے تو ٹھیک ہے۔" اس کی بے رخی نے پل بھر کو نواز کے سیاہ چہرے کو مزید تاریک کر دیا تھا۔ کیسی اجنبیت اور بے زاری ہوتی تھی ماہین کے لیے اس کے چہرے پر جیسے کسی غیر کی بات ہو رہی ہو۔

"میں اسے گھر بلانا چاہتا ہوں۔ تاکہ تم اس سے مل کر اس سے بات کرو۔"

"میں۔ میں کیا بات کروں گی اس سے، تم کر رہے ہو تو ٹھیک ہے۔" سارا نے منہ بنایا۔

"میں باپ ہوں، تم ماں ہو، اگر تم اس کے والدین کو انوائیٹ کرو گی تو زیادہ اچھا لگے گا۔" نواز کی بات پر اس نے بہ دیر سوچا۔

"لوگ بے روز گھر آرہا ہے وہ۔ کر دوں گی بات۔" سارا نے نخرے سے کہا گویا اس کی سات نسلوں پر احسان کیا تھا اور نواز اکرم بھی یوں خوش ہوا تھا جیسے سارا نے اسے کوئی بڑا اعزاز بخش دیا اور نواز اکرم تو سارا کی ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر خوش ہو جاتا تھا کیونکہ سارا اسے خوش ہونے کا موقع کم ہی دیتی تھی اور اب نواز اکرم نے جو نئی ذمہ داری اس کے سر پر ڈالی تھی تو اسے کاشف کے متعلق اور بھی زیادہ سوچنا پڑ رہا تھا۔

"لگتا ہے ماہین بھی اس میں انٹرسٹڈ ہے جب ہی تو ہر روز بازار کے بہانے ملاقات کی جا رہی ہے۔ ویسے اچھا ہے، یہ ماہین کا عذاب سر سے اترے گا تو تب ہی میرب کی باری آئے گی۔ ادھر آیان واسطی نے بھی مچا رکھی ہے۔ اس کاشف کو تو صبح ہی بلا کر فارغ کرتی ہوں۔ اسے کیا ماں باپ کا کیا مسئلہ ہو گا۔" سارا بے سنجیدگی سے تمام پہلوؤں پر غور کر رہی تھی۔

"السلام علیکم آپا!" ایک دم شہزاد نے آکر اس کے کان میں کہا تھا کہ وہ خوف سے اچھل ہی پڑی۔ بڑی گہری سوچ میں گم تھی وہ۔ خوف سے "ہاں" کہہ کر دل پر ہاتھ رکھے اپنی اٹکی سانسوں کو سنبھال رہی تھی پھر گھور کر شہزاد کو دیکھا۔

"ڈرا دیا تم نے شہزاد۔ توبہ بھئی، کہاں غائب رہے تھے۔ بتا کر تو جایا کرو نا۔ پتا ہی نہیں چلتا کب منظر سے غائب ہو جاتے ہو، پریشان کر دیتے ہو تم۔"

"ارے آپا! ایک مشورہ دوں، میرے لیے پریشان نہ ہوا کریں۔ مست بندہ ہوں۔ دو نمبر ویگن میں بیٹھا تو سلمیٰ آپا کے پاس جا اترا۔ دو دن وہاں لگ گئے۔ وہاں سے بین خالو کے ہاں چلا گیا۔ بس ایسے ہی گھومتے گھومتے ہفتہ نکل گیا۔"

"تم بھی نا کیا کٹی پتنگ کی طرح یہاں وہاں ڈولنے کا شوق ہے تمہیں؟ ٹک کر بیٹھا کرو گھر میں اور سلمیٰ بھابھی کے ہاں جاتے تمہیں شرم نہیں آئی؟ اس عورت نے تمہیں دھکے دے کر نکالا تھا۔ بھابھی ہو کر ایسا غیروں سا سلوک کیا اور تم پھر بھی اس کے گھر جا پہنچے۔ تف ہے بھئی! تمہیں عقل نہیں آسکتی۔" سارا کا غصہ اس کی ایسی حرکتوں کی وجہ سے آسمان کو چھو لیتا تھا۔ اب بھی اس کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"قسم سے آپا، اس بار بہت اچھا سلوک کیا انہوں نے، میں تو حیران ہی رہ گیا۔ اسی لیے دو دن بھی وہاں گزار دیے۔"

"ہوں، اچھا سلوک ایسے ہوں گے تم نے دو چار ہزار اسے۔ لالچی عورت ہے وہ۔"

"نہیں آپا! میرے پاس تو ایک سو روپیہ تھا صرف، جو میں نے کرایہ دے دیا۔ واپس پیدل آیا ہوں۔"

"اچھا بس جاؤ اب اپنے کمرے میں۔ نہا دھو کر کپڑے بدلو، کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے فقیروں والا، بلکہ ان سے بھی بدتر۔ چلو!" سارا کے لیے شہزاد کو برداشت کرنا اب دشوار ترین ہو رہا تھا۔ اس کے الجھے بکھرے بال، میلے کچیلے کپڑے، گرد سے اٹے پاؤں اس کی طویل مسافت کو ظاہر کر رہے تھے اور واقعی طویل مسافت سے ہی تو آیا تھا۔ کہاں لاد کھیت اور کہاں ڈیفنس اور پیدل سفر سارا نے افسوس سے اسے دیکھا۔ وہ اٹھا۔

"بچیاں ٹھیک ہیں نا آپا؟ کہاں ہیں؟"

"اپنے اپنے کمروں میں ہیں اور تم جاؤ اب! نواز نے تمہیں اس حلیے میں دیکھا تو کیا کہے گا۔" اس نے اسے احساس دلانا چاہا تھا کہ وہ کس ابتر حلیے میں ہے، مگر وہ شہزاد ہی کیا جو سمجھ لے۔

"آپا۔ نواز بھائی مجھے کچھ نہیں کہتے اور اگر کہا بھی تو میں ان سے کہوں گا کہ آپ مجھے دو، چار جوڑے سلوا دیں نا۔ اگر میرا حلیہ برا لگ رہا ہے تو حلیہ ٹھیک کروا دیں۔ کیسا آئیڈیا ہے؟"

اس نے خوش ہو کر چٹکی بجائی تھی۔ سارا کا غصہ اس کے سرخ و سفید چہرے پر مزید لالی بن کر ابھرا تھا۔

"خبردار، جو تم نے نواز سے ایسی ویسی کوئی بات کی۔

تمہاری ان ہی گھٹیا باتوں کی وجہ سے وہ ہمیں کم تر سمجھتا ہے۔ میرا سارا بھرم، رعب کھو دیتے ہو شہزاد! خدا کے لیے اپنے کمرے میں جاؤ اور ریپورٹ بدلو۔"

"جی۔" شہزاد نے مسکین سی شکل بنا کر بہن کو دیکھا اور خاموشی سے مزید کچھ کہے بنا اٹھ کر چلا گیا تھا ورنہ سارا سے اس سے بھی بڑھ کر لعن طعن کی توقع تھی۔

"دماغ خراب کر دیتا ہے یہ بے وقوف۔ سلمیٰ بھابھی کے پاس اسے جانے کی ضرورت کیا تھی۔ ابھی پیسوں کے لیے فون کر دے گی۔ لالچی عورت۔"

سارا جلتے کڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی اور ایسے میں وہ ماہین اور کاشف والا قصہ بھی بھول گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"گھر، گاڑی اور اب بینک بیلنس۔" کاشف نے چیک ہوا میں لہرایا۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کی امید چمک رہی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ نواز اکرم کی مہربانیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور کیوں، وہ یہ بھی جانتا تھا۔

"ماہین۔" نام کا ایک بینک چیک اس کے ہاتھ لگ گیا تھا جس میں وہ اپنی مرضی کی رقم بھر سکتا تھا۔

"بڑا پیار کرتی ہے مجھ سے وہ۔" اس نے ہنستے ہوئے خود سے کہا تھا۔

"مگر رانی بھی تو تجھ سے پیار کرتی ہے۔" کوئی جیسے اس کے سامنے اس کا کان کھینچے کو کھڑا تھا وہ چونکا۔

"ہاں۔۔۔ رانی مجھ سے اور میں رانی سے محبت کرتا ہوں، مگر ماہین کی محبت کے بغیر تو ہم دونوں کی محبت ہی بے کار ہے کیونکہ۔۔۔ وہ یک دم چونک کر سیدھا ہوا تھا۔ کوئی آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے آفس ٹیبل پر دھری فائل اٹھا کر اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ جیسے بہت دیر سے یہی مصروفیت ہو۔

"کاشف صاحب، آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔" گل خان پیغام دے کر جا چکا تھا۔ کاشی نے منہ بنا کر دائیں طرف رکھی فائل اٹھائی۔

"کم بخت بھوتا نہیں ہے۔ صبح شام دیا تھا اور اب واپس فائل مانگ رہا ہے۔ مشین سمجھتا ہے مجھے، چل بھئی اٹھ یار!" وہ فائل اٹھا کر کھڑا ہوا۔ دروازے کے پیچھے لگے چھوٹے سے آئینے میں اس نے خود کو دیکھا۔ اپنی ٹائی کی ناٹ درست کی۔ بالوں میں کنگھی کی ٹشو سے ماتھا اور ناک صاف کی۔

"گرمی سے پسینہ ناک اور ماتھے پر تیل کی طرح چمک جاتا ہے۔ یہ پورشن آئلی اور کالا لگتا ہے، خیر۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے ٹشو سے اچھی طرح اپنا منہ صاف کیا اور نواز اکرم کے کمرے کی جانب چل دیا۔ شیشے کا بے حد خوب صورت دروازہ دھکیلتے ہی ٹھنڈی لہر اس سے ٹکرائی تھی۔

"ایک دن یہ آفس میرا ہوگا نواز اکرم، صرف میرا۔" ایک خیال سانپ کی طرح اس کے دماغ میں رینگ گیا تھا۔ بے ساختہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری تھی اور جب وہ کمرے میں داخل ہوا۔ تو نواز اکرم نے اس کے فریش، مسکراتے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔

"آؤ کاشف! حمید صاحب کا فون آیا تھا کہ انہیں کنسائنمنٹ جلدی چاہیے۔ میں نے تمہیں سارے Details (تفصیل) چیک کرنے کو کہا تھا۔"

"سر! میں اسی فائل پر کام کر رہا ہوں۔ یہ دیکھیں آپ۔ سامان کی ڈیٹیل تو میں نے جمع کر لی ہے۔ بس اب اسے مزید ری رائٹ کرتا ہے اور اس کے ساتھ تفصیل بھی لکھنی ہیں۔"

"یعنی ابھی کافی کام باقی ہے۔" تفصیل سن کر نواز کے چہرے پر ہلکی سی ناپسندیدگی ابھری تھی اور ماتھے پر ایک بڑی رگ بھی، مگر اس کے باوجود وہ کچھ نہیں بولا۔ لحاظ کر گیا تھا اس کا، ورنہ ایسی کوتاہیاں وہ اتنی جلدی معاف کرنے والا نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے، اسے جلدی سے مکمل کر کے لے آؤ۔ آج ہی ہم یہ فائل ورک پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ کو دیتے ہیں۔ وقت کم مقابلہ سخت ہے بیٹا۔ بزنس کے اصولوں میں ایک سنہری اور اہم اصول یہ ہمیشہ یاد رکھنا۔ وعدہ خلافی نہیں ہونی چاہیے، جو ڈیٹ آپ کسٹمر کو دیتے ہیں؟ اسی پر ڈیلیوری ہو اور اگر نہیں کر سکتے تو پھر کوئی ڈیٹ بھی مت دو اوکے۔"

نواز اکرم بہت سنجیدہ تھا، بزنس کے معاملے میں وہ ایسا ہی تھا۔ خطرناک حد تک سنجیدہ اور یہ ہی وہ ساکھ تھی جو اسے دن دگنی، رات چوگنی ترقی دے رہی تھی۔

"اوکے سر! میں۔۔۔ میں آج یہ کام مکمل کر کے آپ کو دے کر جاؤں گا۔" اس نے عزم۔۔۔ اور بڑے حوصلے سے کہا اور فائل اٹھا کر باہر نکل گیا۔ نواز اکرم بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"ہوں۔" اس کی ہوں خاصی معنی خیز تھی۔ کاشف بہت ہنس مکھ اور ذہین نوجوان تھا۔ وہ اسے شروع سے پسند کرتا تھا۔ انتہائی مستعد اور حوصلہ شکن حالات میں بھی اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ تنہا ہو کر بھی پڑھتا تھا، نوکری کر رہا تھا اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ آگے بڑھنے کی امنگ تھی۔ بس کشش تھا، بس موقع کی تلاش میں تھا اور یہ موقع اسے نواز اکرم دے رہا تھا۔

ماہین کے لیے کاشف کو سارا اور ثروت دونوں نے اوکے کر دیا ہے۔" نواز اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"اور اب تو وہ اس قابل بھی ہو گیا ہے کہ ماہین کو کسی بھی قسم کا کوئی احساس کمتری نہیں ہوگا۔ آہستہ آہستہ میں اسے کچھ اور سرمایہ دے کر الگ بزنس کروا دوں گا اور۔۔۔"

نواز اکرم کی سوچ کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا اور اس کے آفس کے ایک چھوٹے سے کیبن نما آفس میں بیٹھے ہوئے کاشف کی سوچ کا دائرہ سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو گیا تھا جس کا نام ماہین تھا اور اب اسے اس کمپنی کا بزنس پارٹنر بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

"آج امی کی طرف جاؤں گا۔" آفس میں بیٹھے ہوئے ہی اس نے فیصلہ کیا تھا۔ "اب امی سے فائنل بات کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

ابھی کل ہی تو اسے ماہین نے دو لاکھ کا چیک دیا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ میں تم سے نہیں لوں گا۔" اس نے فوراً چیک اسے واپس کیا تھا۔

"کیوں۔۔۔ تمہارے اور میرے پیسے میں کوئی فرق ہے، جب مجھے ضرورت ہوگی میں تم سے مانگوں گی۔"

"مگر یہ تمہاری پاکٹ منی ہے اور تم نے اسے اپنے لیے رکھا تھا، میں۔۔۔ میں کہیں اور سے۔"

"بس۔۔۔ کہیں اور سے نہیں۔ رکھو یہ میرے پاس بینک میں جمع تھے۔ اپنے لیے ہی جمع تھے اور اپنے لیے ہی دے رہی ہوں۔" ماہین نے مسکراتے ہوئے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا تھا۔

"تم بہت اچھی ہو ماہین! یہ پیسے سچ پوچھو تو مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو یہ سب تمہارے لیے، تمہاری شاپنگ پر خرچ کروں گا۔ [illegible] میں تمہارے معیار کے مطابق تمام چیزیں لاؤں گا، تاکہ تمہاری ممی اور میرے کو باتیں بنانے کا موقع ہی نہ ملے۔" کاشف کی باتوں نے ماہی کے چہرے پر گلزار کھلا دیے تھے۔ اسے وہ پل یاد آئے تو پلکیں خود بخود شرم سے جھک گئیں۔

اس کی باہوں کا حصار، اس کے ہاتھوں کا وہ گرم لمس جب ساحل سمندر پر وہ بہت بے تکلفی سے اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا تو وہ تڑپ کر اس کے حصار سے نکلی تھی۔

"بس۔" وہ جلدی سے آگے آگے چل دی تھی۔ کاشف نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"سنو تو، یار رکو، کہاں بھاگی جا رہی ہو تم۔"

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔" وہ نہ جانے کیوں اس سے خوف زدہ تھی یا خود سے خوف زدہ تھی مگر اسے یک دم یہ احساس ہوا تھا کہ اب یہاں رکنا

کسی بڑی نادانی اور پھر خطرناک غلطی کا سبب بھی ہو سکتا ہے۔

"تم مجھ سے ڈر گئی تھیں نا کہ میں۔۔۔ تم جانتی ہو ماہی تم میرے لیے کیا ہو، ایک مقدس جذبہ۔۔۔ میں تمہارے بارے میں ایسی ویسی کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔ کجا کہ اس پر عمل کرنا۔" واپسی پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے کاشی نے کہا تو اسے اس پر بہت پیار آیا تھا۔

"میں تم سے نہیں، خود سے ہی ڈر گئی تھی۔" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ چاہے جانے کا احساس کتنا حسین ہوتا ہے کہ کوئی آپ کو سوچتا ہے، آپ کے لیے اپنا وقت صرف کرتا ہے، کسی کے نزدیک آپ اہم ہیں، یہ احساس اتنا جان دار، حسین ہوتا ہے کہ ہمیں مدہوش کر دیتا ہے اور مدہوشی میں جذبات غالب آجائیں تو۔۔۔ اس نے کپکپا کر جھرجھری لی۔

"میں جانتا ہوں تمہاری چوائس اور ان شاء اللہ سب کچھ تمہاری چوائس کے مطابق ہوگا۔" کاشی بڑے عزم سے کہہ رہا تھا۔ ماہین نے آئینے میں مسکرا کر کاشی کو دیکھا۔

"بات طے نہیں ہوئی اور منگنی کی پلاننگ کرنے لگے ہو۔"

"بات تو طے ہی سمجھو، مجھے یقین ہے تمہارے بابا مجھے پسند کر چکے ہیں اور اب وہ مجھے اپنی لاڈلی، پیاری بیٹی کا ہاتھ ضرور تھما دیں گے۔" کاشی کے لہجے کا یقین بتا رہا تھا کہ وہ بہت پر امید ہے۔

"اور تمہاری امی؟" ماہین کی بات پر اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میری امی، میری خوشی میں خوش ہوں گی۔ ان کی طرف سے تو کسی انکار یا ناپسندیدگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی بہت نائس اور بے چاری سی خاتون ہیں وہ۔ اکلوتے بیٹے کی خوشی میں خوش رہنے والی اور دعائیں کرنے والی۔"

"مجھے بہت شوق ہے تمہاری امی سے ملنے کا، جب سے تم نے اپنی زندگی کے بارے میں بتایا ہے، میرا اس عظیم اور بہادر عورت سے ملنے کو دل چاہتا ہے۔"

"ضرور ملنا۔۔۔ بس چند دنوں کا انتظار اور ہے۔"

"چند دن اور۔۔۔ اور ان چند دنوں میں ماہین کے بینک بیلنس سے جتنی رقم نکلوا سکتے ہو، نکلوا لو کاشف جان! موقع اچھا ہے۔" اس نے خباثت سے مسکراتے ہوئے فون اٹھا کر نمبر ملایا۔

"ہیلو!" کھنکتی، شوخ، امنگ سے بھرپور آواز اس کے رگ و پے سے ساری بوریت اور اداسی سمیٹ کر لے گئی تھی۔

"ہیلو میری رانی، کیسی ہے؟ کیا کر رہی تھی؟" کاشف نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر بڑے مست سے انداز میں اس سے پوچھا۔ جواباً رانی بھی بڑے بھرپور انداز میں ہنسی۔

"تیرے بارے میں ہی سوچ رہی تھی، کتنے دنوں سے نہیں [illegible] تھا کاشی کا [illegible] ہو گیا تھا۔"

"ہائے ظالم [illegible] باتیں [illegible] ابھی [illegible]؟"

"نہیں۔۔۔ ابھی تو اماں بھی گھر میں نہیں ہے۔" اس نے بھولپن کی انتہا کی تھی۔

"پھر تو اور بھی اچھا موقع ہے۔" [illegible] خیزی سے ہنسا۔ "آجاؤں!"

"نہیں۔۔۔ ایسے نہیں، بارات لے کے آ، بینڈ باجوں کے ساتھ، سجی ہوئی، پھولوں والی گاڑی میں تب میں آؤں گی تیرے ساتھ۔"

"ہائے میری بلبل، ایسے ہی آؤں گا، بس تھوڑا سا صبر کر لے، اور ہاں سن شام کو تجھ سے ایک ضروری بات کرنی ہے، اماں کے پاس آجانا۔" وہ جانتا تھا رانی کا شکی اور طبیعت کا سخت باپ کاشی کو گھر نہیں آنے دے گا، اس لیے اس نے رانی کو امی کے پاس بلا لیا تھا تاکہ تسلی سے اسے اپنے اور ماہین کے بارے میں بتا سکے۔

"کیا ضروری بات؟ فون پر ہی بتا دے نا۔"

"معذرت تمہارا کر میرا۔۔۔ شام کو ٹھیک چھ بجے تیرا انتظار کروں گا۔ اوکے بائے۔"

"حسن کے نخرے تو دیکھو۔" اس نے فون رکھ کر زیر لب ایک گالی دی اور [illegible] کھول کر پوری توجہ سے کام کرنے لگا۔

"وہ کالا بھینسا۔ کام کے معاملے میں بہت سخت ہے، ٹکریں مارتا ہے۔"

بڑبڑاتے ہوئے اس نے نواز اکرم کی شان میں مزید گستاخی کی اور وہ ایسے القابات سے تو نواز اکرم کو اکثر ہی یاد کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ماما۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ یہ کون سا ڈنر سیٹ رکھا ہے آپ نے، کرسٹل والا کیوں نہیں نکالا؟"

میرب ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے آئی تھی۔ ناپسندیدگی سے ناک چڑھا کر بولی۔

"ارے کیا ہے، یہ سیٹ بھی اصلی ڈانس کا ہے میں نے دیا ہے۔"

"ہاں وہ ایسے والا ہی ہے، آیان واسطی کی مدر آ رہی ہیں، خالد۔۔۔ خالد۔۔۔"

"جی باجی!" خالد منٹوں میں حاضر تھا۔ سارا نے خار کھاتے دیکھا، کبھی کبھی تو بدتمیزی کی سرحد پار کر جاتی تھی۔

"خالد! یہ ڈنر سیٹ فوراً بدلو۔ بی سی کا کھانا ان برتنوں میں سرو ہوگا۔" میرب نے تنفر سے برتنوں کو دیکھا۔ خالد فوراً ساری سجائی ہوئی پلیٹیں اٹھا کر لے گیا تو۔ ماہین خاموش تماشائی بنی سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ آج آیان واسطی اور اس کی ماں کو سارا نے کھانے پر انوائیٹ کیا تھا اور صبح سے ہی گھر بھر میں میرب نے افراتفری مچا رکھی تھی۔

"یہ کشن بدل دو، یہ گلاس سیٹ اٹھا لو، وہ لیمپ یہاں رکھو، یہ کرسٹل پیس وہاں۔" اس ادل بدل اور اٹھا پٹخ سے خالد اور صفائی والی ماسی ہلکان ہو گئے تھے۔ ہر چیز کرتا گھر بھی اسے گندا لگ رہا تھا اور گھر کے بعد

کچن کی باری آئی تھی تو یہاں بھی مین مینو شروع ہو گئی تھی۔

"کھانا پی سی سے آئے گا۔"

"خالد سب کچھ بنا لیتا ہے۔" سارا نے اسے احساس دلایا۔

"ہاں! مگر اس کا اسٹینڈرڈ پی سی جیسا تو نہیں ہو گا نا۔" میرب تو آسمان سے تارے توڑ کر بھی لانے کو تیار تھی۔ اس قدر اتاؤلا پن سارا کو بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے میرب۔ عالیہ واسطی کوئی اس ملک کی پریذیڈنٹ نہیں ہے، نہ ہی کوئی توپ چیز۔ اس شہر میں اس جیسی بہت سی سوشل ورکر خواتین پھرتی ہیں۔ تم کمپلیکس کا شکار کیوں ہو؟ ہم کسی سے کم نہیں ہیں۔" سارا کو اس کا خود سے بڑھ کر عالیہ کو توجہ دینا بالکل پسند نہیں آیا تھا اور نہ ہی وہ ایسا چاہتی تھی کہ میرب عالیہ واسطی کے سامنے دبی ہوئی ممی ٹائپ بہو بنے۔

"کمپلیکس۔۔۔ نو ماما۔۔۔ میں کامپلیکس کا شکار نہیں ہوں، صرف یہ چاہتی ہوں کہ کوئی مجھ سے متعلق کسی بھی کمی کا احساس نہ کرے۔ ہمارے یہاں ہر چیز ایسی [illegible] اور پرفیکٹ ہو کہ آیان واسطی کو ہماری حیثیت کا احساس ہو جائے، وہ ہمیں محض نو دولتیا نہ سمجھے۔ کیونکہ آنٹی عالیہ ایٹی کیٹس اور مینرز پر بہت زور دیتی ہیں۔" میرب نے ماں کو سمجھایا۔

"ہوں۔ یہ سو کالڈ قسم کی دانشور خواتین اور ان کے ایٹی کیٹس شعبدہ بازی ہے ساری، خیر تم جو چاہتی ہو کر لو۔"

سارا نے اس کے بگڑتے موڈ کو دیکھ کر فوراً ہی پسپائی اختیار کر لی تھی۔ ماہین نے بے ساختہ اپنا ہونٹ کاٹا۔ اسے پل بھر میں۔۔۔ وہ شام یاد آ گئی تھی جب کاشف کو سارا علوی نے بلایا تھا۔

"ماہین! خالد سے کہو کاشف کے لیے چائے لے کر آئے اور فریج میں کیک پڑا ہو گا وہ بھی ساتھ لے آئے۔" آدھا بچا ہوا کیک، تین کباب، تین سموسے اور پلیٹ میں تھوڑے سے نمکو۔ ماہین کو۔۔۔ [illegible] شرم سی آئی تھی۔ ایسی چائے تو وہ عام روٹین میں [illegible] والے مہمانوں کے سامنے بھی نہیں پیش کرتے تھے گویا کاشف ان سے بھی گیا گزرا ہے۔

"ماما کو یہ احساس نہیں کہ کاشف کا پہلے رشتہ اور تھا۔ مگر اب۔۔۔ اب وہ اس گھر کا داماد بننے والا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ملازموں والا سلوک کیوں کر رہی ہیں۔"

پچیس منٹ کی اس ملاقات میں گیارہ منٹ کاشف نے چائے پی تھی۔ پانچ منٹ میں سارا علوی نے [illegible] تین سوال پوچھے تھے۔ مختصر ترین سوال۔

"تمہاری فیملی۔۔۔"

"صرف امی ہیں اور کوئی نہیں۔" کاشف نے سر جھکا کر نروس سے لہجے میں جواب دیا تھا۔ بھلا سارا علوی کے سامنے اسے نظر اٹھانے کی جرات کہاں تھی۔

[illegible]

بڑوں کے درمیان ہی طے ہوتے ہیں۔"

"جی۔۔۔ ضرور۔۔۔" کاشف نے [illegible] سر جھکا کر جواب دیا تھا۔ باقی چائے کپ میں ہی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور اس ٹھنڈی چائے کو گرم ہاتھوں [illegible] تھامے وہ بیٹھا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تم چائے پیو، یہ بسکٹ لو، میں اب [illegible] جا رہی ہوں۔ امی کو ضرور لانا۔" اس نے جاتے جاتے رک کر دوبارہ تاکید کی اور پھر وہ چلی گئی۔

"کاشف! تمہاری چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے نا۔" فوراً اس کے قریب آ بیٹھی۔

"ہاں۔۔۔ اف توبہ۔۔۔ تمہاری ماما کا رعب۔" اس نے کب کا رکا ہوا سانس بحال کیا تھا۔

"تم یہ ٹھنڈی چائے مت پیو، میں گرم کروا دیتی ہوں۔"

"نہیں، نہیں، ٹھیک ہے۔" اس نے ایک ہی [illegible] سا گھونٹ لیا اور کپ میز پر رکھ دیا۔

"تمہارے بابا۔ میرے لیے صرف آفس میں بااختیار ہوتے ہیں۔ گھر میں تو سب سے بڑھ کر وہ میرے بابا ہی ہیں مگر تمہاری ماما تو آل ان آل [illegible] ہیں۔"

"نہیں۔ بس ان کی پرسنالٹی ہی ایسی ہے وہ تو سب ہی کو سخت مزاج لگتی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔" اس نے اپنی طرف سے بھرپور وضاحت دی تھی مگر کاشف سارا علوی کو بچپن سے جانتا تھا۔ اور اسے ماہین کی صفائی کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اسی لیے تو اس کے چہرے پر ابھرنے والی طنزیہ مسکراہٹ دیکھ کر ماہین کچھ بھی بول نہیں پائی تھی۔

اور اب۔۔۔ آیان واسطی کے لیے کیا جانے والا یہ سارا اہتمام۔ فرق کہاں تھا اور کس کے بیچ تھا۔ دولت اور غربت کے درمیان یا خوب صورتی اور بدصورتی کے درمیان یا سب سے بڑھ کر محبت اور نفرت کے درمیان۔

محبت اور نفرت کے درمیان فرق کو مٹایا نہیں جا سکتا کیونکہ دنیاوی مال و دولت کی حرص اور طمع وقت [illegible] کے ساتھ [illegible] سب سے کم زیادہ ہوتی رہتی ہے مگر محبت کے ساتھ نفرت کو بدلا نہیں جا سکتا۔ جہاں معاملہ نفرت کا ہو وہاں سارے اصول و ضوابط قاعدے قانون بھلا دیے جاتے ہیں۔ نفرت عدل و انصاف کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ حق تلفی ہوتی ہے تو دوسرا فریق چیختا ہے مگر وہ تو چیخ بھی نہیں سکتی تھی۔ بچپن سے اسی حق تلفی کا شکار تھی وہ۔ سارا نے ہمیشہ ماہین پر میرب کو فوقیت دی۔ چھوٹا بچہ چھوٹا بچہ کہہ کر اسے گھر بھر کی آنکھ کا تارا بنا رکھا تھا۔ بڑی ہوئی تو یہ فرق مزید سمجھ میں آنے لگا کہ بات صرف چھوٹے بڑے کی نہیں ہے۔ یہاں تو معاملہ پسند ناپسند کا ہے۔

نواز اکرم، سارا علوی کو پسند نہیں تھا اور اس کی ناپسندیدگی کی سزا ماہین کو بھگتنا پڑ رہی تھی کہ وہ بالکل باپ جیسی تھی اور میرب خود سارا علوی کو اپنی شبیہہ لگتی تھی۔

مگر فرق صرف یہ ہی ایک نہیں تھا۔ حیثیت اور رتبے کا بھی تھا۔ آیان واسطی کے مقابلے میں کاشف کی حیثیت زیرو تھی اور رتبہ۔۔۔ ایک معمولی آفس ورکر اور یہ ہی وہ تفرقات تھے جن کی وجہ سے یہ خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر ہر چیز بدل چکی تھی۔ میرب کی نگرانی میں خالد پھرکی بنا ہوا تھا۔ جوسز کے گابلٹز (جام) کو ٹشو لپیٹتے ہوئے جو فتح مندی اور طمانیت میرب کے چہرے سے نظر آ رہی تھی، وہ ماہین کو کبھی بھی اپنے چہرے پر نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا دل دھڑکتا رہتا تھا خدشات سے۔۔۔ اور یہ خدشات نہ جانے کیسے اس کے چہرے پر بھی نظر آ جاتے تھے۔ تب ہی تو وہ خوف زدہ سہمی ہوئی، ڈرپوک اور احساس کمتری کا شکار لگتی تھی۔

"اسے یقین ہے کہ اسے رد نہیں کیا جائے گا۔" ماہین نے رشک سے میرب کو دیکھ کر سوچا۔ "اور میں۔۔۔" وہ طنز سے خود پر ہنسی۔

"مجھے تو کبھی بھی اس بات کا یقین نہیں رہا کہ میں منتخب ہو جاؤں گی۔ ہاں، نا کے بیچ لٹکا یہ وجود۔ اور جب انکار ہوتا ہے تو پھر پارہ پارہ بکھرتا اعتماد۔ ہاں اب۔۔۔ اب جب کاشی کی امی آئیں گی تو۔"

"ماہین۔۔۔! کیا بات ہے، تم گھنٹہ بھر سے مجھ پر نظر جمائے بیٹھی ہو، کیا بہت پیاری لگ رہی ہوں۔ اپنی آنکھ کا کاجل میری کنپٹی پر لگا دو، کہیں نظر نہ لگ جائے۔"

اسے احساس ہی نہیں ہوا اور میرب نے اس کی بے خودی کو محسوس کر لیا تھا جب ہی قریب آ کر اتراہٹ سے بولی تھی۔ وہ چونکی۔

"ہاں پیاری تو تم لگ رہی ہو، بس اب آیان کی امی تمہیں پسند کر لیں۔"

"آیان کی امی مجھے پسند کر لیں۔ مجھے۔۔۔ ہاہاہا۔" میرب نے اس کی بات پر زوردار قہقہہ لگایا تھا، پھر افسوس سے اسے دیکھا۔

"چچ چچ۔۔۔ کتنا ڈر گئی ہو تم۔۔۔ مگر خیر تمہارا بھی کیا قصور ہے۔ تمہیں آج تک کسی نے پسند جو نہیں کیا مگر تم میرے بارے میں فکر مت کرو۔ میں ریجیکٹ نہیں ہو سکتی ہوں۔" اس نے بڑے غرور سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر گویا ماہین کی تشفی کر دی تھی۔ اور

ماہین اپنی جگہ جم سی گئی تھی۔ کوشش کے باوجود اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا تھا ورنہ ہی وہ منظر سے غائب ہو سکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میرب ریجیکٹ نہیں ہو سکتی پھر بھی اس نے یہ بات کیوں کی۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا۔

"کیوں فضول میں اس کے منہ لگ کر باتیں سنتی ہو۔ اٹھو جا کر اپنے کمرے میں پڑھو۔ خوامخواہ دل جلانے کو یہاں آ بیٹھی ہو۔" کوئی اس کے اندر چھڑی تھامے کھڑا تھا۔ وہ بے ساختہ اٹھی۔

"سنو۔" وہ لاؤنج سے گزری تو میرب نے اسے پکارا اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"آیان لوگوں کے سامنے آنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔"

"کیوں؟" وہ حیرت سے ٹھٹکی۔

"کیا ضروری ہے کہ ساری دنیا کو یہ وضاحت دی جائے کہ تم ہے۔۔۔ پھر مائنڈ مت کرنا۔ رونے دھونے بیٹھ جاؤ گی۔" وہ ۔۔۔ کی آخری حد پار کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتی تھی۔ ماہین کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اس نے سر ہلا کے دیکھا اور پھر پلٹ کر تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

"بے وقوف' پاگل ہو تم۔ کیوں۔۔۔ کیوں اس کے منہ لگیں' آج تو وہ خود کو عرش پر پہنچا ہوا دیکھ رہی ہوگی۔" اپنے کمرے میں آ کر سارا غصہ کمرے کی چیزوں پر نکال کر خود کو کوس کر اس نے کتاب اٹھالی۔ اب مہمانوں کے جانے کے بعد ہی اسے کمرے سے نکلنا تھا۔

☼ ☼ ☼

عالیہ واسطی اور سارا دونوں کھانے کے بعد باتیں کر رہی تھیں۔ میرب' آیان کو اپنے کمرے میں لے گئی تھی۔ مطلع صاف دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنا پاؤں کمرے سے باہر نکالا۔ دونوں لاؤنج میں تھیں۔

"السلام علیکم۔" آج پہلی بار اس نے مسکراتے ہوئے بڑا بھرپور سلام کیا تھا۔ کسی بھی آنے والی مہمان کو اور سارا نے جس طرح حیرت سے ٹھٹک کر اسے دیکھا تھا' اس سے اسے ایک کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔

"وعلیکم۔۔۔" عالیہ نے پل بھر میں اپنی حیرانی پر قابو پایا تھا اور فوراً" مسکرائی تھیں۔ سوالیہ نظروں سے سارا کو دیکھا۔

"یہ۔۔۔" سارا کے گلے میں جیسے کچھ اٹکا تھا۔

"ماہین۔۔۔ میرب کی بڑی بہن ہوں آنٹی میں۔" وہ بڑے مزے سے اپنا تعارف خود کروا کر عالیہ کے عین برابر جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔

"اچھا اچھا۔۔۔ تو تم ماہین ہو۔۔۔ اچھا۔" عالیہ نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے جس انداز میں کہا تھا' ماہین کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ حیرت کا اظہار کر رہی تھیں یا خوشی کا' لیکن اتنا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس سے واقف ضرور ہیں۔ غائبانہ تعارف' جس کا انہوں نے کچھ دیر بعد خود ہی اظہار بھی کر دیا تھا۔

"آیان نے بتایا تھا مجھے ۔۔۔ بھی تھیں۔۔۔ کیا کرتی ہو آج کل؟"

"بی اے پرائیویٹ امتحان کی تیاری۔" ماہین سارا کے چہرے پر پھیلی خفگی اور غصہ نظرانداز کرنے میں مزا آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی سارا کی بے بسی اس وقت عروج پر ہے ورنہ وہ ماہین کو جادو کی چھڑی سے غائب کرنے میں پل نہ کرتی۔

"باقی ٹائم کیا کرتی ہو۔"

"جو میرب نہیں کرتی۔" اسے اب اس ۔۔۔ میں مزا آنے لگا تھا۔ وہ۔۔۔ مسکراتے ہوئے بڑی محبت سے اور میٹھے لہجے میں عالیہ سے بات کر رہی تھی۔

"میرب کیا نہیں کرتی۔" عالیہ واضح چونکی تھیں اور سارا کا تو دم رک گیا تھا۔

"جو میں کرتی ہوں آنٹی! ایسے ہی بس گھریلو کام وغیرہ۔" اس نے سارا کو دیکھا۔

"اوہ۔۔۔ یہ تو اچھی عادت ہے۔" عالیہ ہنسی تھیں۔ اسی پل وہاں میرب اور آیان آ گئے تھے۔ میرب ا۔۔۔ کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔

"اور کیا کیا کرتی ہو تم۔" عالیہ کی پوری توجہ ماہین کی طرف تھی۔ میرب نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا جب کہ ماہین کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ سارے پرانے بدلے آج چکانے کا موقع مل گیا تھا۔ جیسے وہ میرب کی وجہ سے جلتی تھی' آج اس کی وجہ سے میرب جل رہی تھی۔

"کوکنگ' پینٹنگ' فلاور میکنگ' مجھے تو گھر کے کاموں سے بہت محبت ہے۔ یہ جو سامنے دیوار پر فلاور ارینج منٹ لگی ہوئی ہے نا' یہ میں نے بنائی ہے۔"

"واؤ۔۔۔ زبردست۔۔۔ بہت پیاری ارینج منٹ ہے۔ مجھے بھی پھولوں سے بہت لگاؤ ہے۔"

"سچ! یا ذوق لوگوں کو ہی پھولوں سے محبت ہوتی ہے۔ ورنہ یہاں تو ایسے بھی ہیں جو صرف اور صرف مادی چیزوں کو اور بے جان مگر قیمتی ڈیکوریشن پیسز پسند کرتے ہیں۔" اس کے طنز پر میرب کا رنگ واضح بدلا ۔۔۔ اپنے ماہین کے سامنے آنا ۔۔۔ گوارا نہ تھا مگر پھر بھی وہ آ گئی تھی' ماما کے ۔۔۔ کرنے کے باوجود بھی۔ اب ماہین بھی اسی طرح آئے گی۔" اس نے پروا کیا کر گویا دل میں ارادہ باندھا تھا۔

"آنٹی! آپ آئیں نا' میں آپ کو اپنی آرٹ ۔۔۔ دکھاتی ہوں۔"

"نہیں ماہ! یہ ضرور آپ کو دکھانا ہوگی۔ میرب کا ۔۔۔"

آیان نے بھی فوراً" اس کی تائید کی تھی۔

"آپ بھی آئیں نا سارا!" جاتے جاتے انہوں نے پلٹ کر سارا کو بیٹھے دیکھ کر کہا تھا۔ سارا جو ماہین کی کلاس لینے کے لیے رک گئی تھی۔ اسے دیکھ کر مسکرا کر اٹھ گئی۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ اور اب باہر مت آنا۔" جاتے جاتے پل بھر کو اس کے قریب رک کر اس نے آہستہ سے ماہین کو وارننگ دی اور پھر تیزی سے چلتی ہوئی ان کے ساتھ مل گئی۔ ماہین کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔

اس نے ہونٹ بھینچ کر انہیں جاتے دیکھا۔ دھند کی چادر آنکھوں کے آگے چھا گئی تھی۔

"ماما نے کبھی میرب کو اس طرح پابند نہیں کیا۔ میرب کو مہمانوں کے سامنے آنے سے نہیں روکا اور مجھے۔۔۔ مجھے کہتی ہیں' باہر مت آنا پچھلی بار جو رشتہ بگڑا تھا وہ بھی تو میرب کو دیکھ کر ہی خواتین نے انکار کر دیا تھا۔ اس سے پہلے' پھر اس سے پہلے۔" اس کے حلق میں گولا سا اٹکا تھا۔ وہ یک دم اٹھی اور اپنے کمرے کی جانب بھاگ گئی۔ اندر آتے ہوئے شہزاد نے بڑی ہمدردی اور پیار سے اسے دیکھا۔۔۔ کچھ دیر لاؤنج میں کھڑا ہوا پھر وہ بھی ماہین کے کمرے کی جانب چل دیا۔

"ماہی۔" وہ بستر پر اوندھے منہ دھواں دھار رو رہی تھی۔ شہزاد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بیٹا!" اس کی محبت اور ہمدردی پر ماہین نے سر اٹھا کر اسے بے بسی سے دیکھا تھا۔

"ماموں۔۔۔ ماموں۔" اس کا اتنا دل بھر آیا تھا کہ وہ بول بھی نہیں سکی اور دوبارہ سر تکیے پر رکھ کر رونے لگی۔ شہزاد نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"یقیناً" آپا نے اسے ڈانٹا ہوگا۔ بہت زیادتی کرتی ہیں آپا۔" اسے اپنی بہن کی عادت اور ماہین کے ساتھ زیادتی کا پتا تھا۔ اس زیادتی پر وہ جب بھی احتجاجاً" آپا سے کچھ کہتا تھا تو وہ الٹا اسے ہی ڈانٹ دیتی تھیں۔

"تم چپ رہو' تمہیں کیا پتا' خود اپنی ہوش ہے تمہیں' جو دوسروں کی وکالت کرنے آ گئے ہو۔ میرے معاملات میں دخل مت دیا کرو۔" اور بے چارہ شہزاد "تین میں نہ تیرہ میں" کی مثال خاموش ہو جاتا تھا۔

"میری پیاری بچی ہو تم تو' روتی کیوں ہو؟ چپ کرو ماہین۔ اللہ تمہیں صبر کا بہت اچھا پھل دے گا۔ چپ' بس چپ۔"

وہ بچوں کی طرح اسے بہلا رہا تھا؟ مگر ماہین کے آنسو تو خشک ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔

"مجھے بھوک لگی ہے' کس سے کھانا مانگوں' آپا تو

مجھے کبھی بھی کھانا نہیں دیں گی۔"
شہزاد نے بے بسی اور معصومیت سے منہ بنا کر کہا تو روتی ہوئی ماہین نے یک دم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ شہزاد کے چہرے پر عجیب سی بے بسی تھی جیسے کوئی بچہ بھوک سے نڈھال ہو اور اسے کھانے کو نہ ملے۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔
"میں لاتی ہوں۔" وہ فوراً" اٹھ کر چلی گئی تھی۔ شہزاد کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ اسے فی الحال تو بہلانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
"مگر ایسا کب تک چلے گا۔ اب یہ سمجھ دار ہے۔ بڑی ہے اب تو پاپا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" وہ وہاں ہی بیٹھا اداسی اور فکرمندی سے سوچتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ تیار ہو رہی تھی' جب اقبال وہاں آ گیا تھا۔
"اوئے استانی! بلے بھئی بلے' بڑی ٹور نکالی ہے۔ اتنا سج دھج کے کہاں جا رہی ہے' ہمیں تو تو نے کبھی بن دھج کے نہیں دکھایا۔ اوئے سہاگن ہو کر بھی بیوہ جیسی شکل بنائے پھرتی ہے۔" کانوں میں بندے ڈالتے ہوئے اس نے پل بھر کو رک کر اسے دیکھا۔
"تجھے کیا' میں جہاں بھی جاؤں' تو جہاں جہاں جاتا ہے مجھے بتا کر جاتا ہے کیا؟"
"اوئے استانی! ہیرا منڈی کی گلیوں کا تجھے کیا پتا' میرے آنے جانے کو چھوڑ' تو بول کدھر کا پروگرام ہے اور دیکھ سچ سچ بتانا۔"
"کام سے جا رہی ہوں۔" فاخرہ نے جان چھڑائی تھی۔
"کس کام سے؟ دیکھ سیدھی طرح بول' تیرا مجازی خدا ہوں میں۔ حق ہے میرا تجھ سے پوچھ گچھ کرنا۔" فاخرہ کو اس کی بات پر کرنٹ لگا تھا۔ اس نے تڑپ کر اقبال کو دیکھا۔
"مجازی خدا اور اس کے حقوق تو تجھے یاد ہوتے ہیں' مگر بیوی اور اس کے حقوق بھول جاتا ہے تم کبھی وہ۔"
"اوئے بس کر۔ بات کو نہ مت' سیدھی طرح بول' کہاں جا رہی ہے۔ کوئی یار آشنا تو نہیں ہے۔" اقبال اس کی بات کاٹ کر بولا تھا۔
"اقبال۔ شرم کر' شرم کر! ایسی بات کرتے ہوئے تجھے حیا نہیں آئی؟ میرے بارے میں ایسی بات کہتے ہوئے۔ جانتا نہیں مجھے۔" فاخرہ کے دکھ اور بے بسی سے آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ اس نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ پھر بے بسی سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ یک دم جیسے پیروں سے جان نکل گئی تھی' اقبال نے چند لمحے اسے بغور دیکھا۔
"اوئے عورت ذات کا کیا علم۔ بڑی بے وفا ہوتی ہے یہ قوم۔ خیر تیری وفاداری پر تو مجھے کوئی شک نہیں ہے۔ تو دل پر نہ لینا میری بات۔ بس یوں ہی منہ سے نکل جاتا ہے۔ اگر تو بتا دیتی تو۔" وہ پل بھر میں بات پلٹ گیا تھا اور ساتھ ہی اسے تسلی بھی دے دی تھی۔
"میں کاشف کے ساتھ نواز صاحب کے گھر جا رہی ہوں۔"
"نواز صاحب! کاشی کے باس' سیٹھ نواز اکرم۔ تو ان کے گھر کیوں جا رہی ہے؟" اقبال بے حد حیرت سے پوچھ رہا تھا۔ فاخرہ نے یک دم اپنی زبان دانتوں تلے دبائی' کاشی نے منع کیا تھا کہ کسی کو بھی نہیں بتانا۔ اور خاص طور سے اقبال کو تو بالکل بھی نہیں۔ جب کہ وہ اس کی باتوں سے جذباتی ہو کر اسے بتا گئی تھی۔
"وہ۔۔۔ وہ اس نے بلایا ہے مجھے۔ اس کی بیگم ملنا چاہتی ہے۔" فاخرہ نے بات بنائی۔
"پر کیوں' اس کی بیگم کا تیرے ساتھ کیا یارانہ ہے۔ کہیں وہ بھی کسی اسکول میں استانی تو نہیں لگی رہی؟"
"نہ جی' وہ تو سیٹھ کی بیوی ہے' خیر۔"
اقبال کو بال کی کھال نکالنے کی عادت تھی۔ وہ جب تک اصل بات اگلوا نہیں لیتا تھا اگلے بندے کو چھوڑتا نہیں تھا۔ فاخرہ نے بے بسی سے اسے دیکھا۔
"مجھے کیا پتا' اب جا کر ہی پتا چلے گا نا' اس سے ملوں گی تو ہی معاملے کا علم ہو گا۔ اور جو مجھے کہے گی' تجھے بھی بتا دوں گی۔ اب جا' میری جان چھوڑ۔ مجھے ہوئے کاشی آنے والا ہے۔"
اس نے بمشکل اپنی جان چھڑائی تھی۔ اقبال جواب میں خاموش ہو گیا۔ نہ جانے واقعی اسے سمجھ نہ آیا تھا یا یوں ہی مصلحتاً خاموش ہوا تھا۔ بہرحال اس خاموشی سے فائدہ اٹھا کر فاخرہ فوراً" وہاں سے غائب ہوئی تھی۔ وہ اس کے منہ بہت کم لگتی تھی۔ لڑائی جھگڑے میں بھی کم بولتی تھی۔ اقبال طعنے تشنے دینے کے بعد گالی گلوچ اور پھر ہاتھ اٹھانے پر اتر آتا تھا اسی لیے وہ اسے زیادہ سے زیادہ نظر انداز کرتی خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی تھی۔
"کاشف! یہ تو اچھا نہیں کر رہا ہے۔ رانی تیرے بچپن کی منگیتر ہے بیٹا۔ اسے دھوکا۔"
"وہ جانتی ہے۔ دھوکا نہیں دیا اسے میں نے۔" کاشف نے اس کی بات کاٹی۔ فاخرہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
"جانتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ۔۔۔"
"ہاں اماں۔۔۔ وہ راضی ہے' بہت اچھی ہے وہ۔ باپ مجبور' باپ کی پریشانی کو دور کرنا کون سا بری بات ہے۔"
"نواز اکرم کو رانی کے بارے میں پتا ہے۔"
"توبہ کرو اماں! کیا بات کر رہی ہو' تم اسے رانی کے بارے میں پتا چل گیا تو وہ کبھی بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہو گا۔"
"پھر جھوٹ بول کر اپنی زندگی کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔" فاخرہ کو اس کی بات پر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔
"اماں۔ تو بات نہیں سمجھ رہی ہے' ماہین کی وجہ سے نواز صاحب بہت پریشان ہیں۔ بے چاروں کی زندگی عذاب بن گئی ہے اور خود ماہین بھی۔ اماں کسی کے کام آنا بری بات ہے کیا۔" فاخرہ اس کی باتوں پر الجھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ وہ سیدھی بات نہیں کر رہا تھا۔ وہ پھر اگر سچ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور اسی لیے فاخرہ کو فکر ہو رہی تھی۔
"اماں! تیرا بیٹا بہت جلد لاکھوں پتی بلکہ کروڑوں پتی بن جائے گا۔ نواز صاحب کی ساری دولت ان ہی دونوں بچیوں کے نام ہے اور ماہین کے لیے تو ان کی خصوصی عنایت ہو گی۔ وہ پیسے سے بیٹی کی بدصورتی ڈھانپنا چاہتے ہیں۔" کاشف کی بات پر وہ چونکی تھی۔
"کیا مطلب! کیا بہت۔۔۔ بہت بدصورت ہے۔"
فاخرہ نے بھی روایتی ماؤں کی طرح اپنے خوب صورت بیٹے کے لیے ایک خوب صورت' پیاری سی بہو کا سوچ رکھا تھا اور رانی اس اسٹینڈرڈ پر پورا اترتی تھی۔ گوری چٹی' پیاری اور کم عمر' جب کہ ماہین کے بارے میں کاشف نے بتایا تھا کہ اس کی بدصورتی کی وجہ سے ابھی تک اس کا کوئی رشتہ نہیں آیا ہے۔ عمر گزر رہی ہے۔ اس کا باپ نواز اکرم اس کی وجہ سے بے حد پریشان ہے اور اب وہ اس کی شادی کاشف سے کرنا چاہتا ہے۔
"یہ تو کچھ لینے اور دینے کا سودا ہو رہا ہے اور اس طرح کی سودے بازی کامیاب نہیں ہوا کرتی کاشف!"
اس نے کچھ دیر بعد گہرا سانس لے کر اسے دوبارہ جتایا۔ کاشف نے پل بھر کو سامنے سے نظر ہٹا کر ماں کو دیکھا۔
"اماں! جب دونوں فریقوں کا سودے بازی میں برابر' برابر کا منافع ہو تو بہت کامیاب ڈیل ہوتی ہے۔ بزنس کی باریکیاں تو مجھے نہ سمجھا۔ کاروباری طریقے میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ بس تو فکر نہ کر اماں! اور جیسے میں نے تجھے سمجھایا ہے ویسے ہی کرنا' بیگم نواز کے سامنے زیادہ مت بولنا' اقبال کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"
کاشی نے اسے اچھی طرح سمجھایا' تو وہ خاموش ہو گئی۔ اگرچہ اسے یہ سب پسند نہیں تھا' مگر مجبوری تھی۔ پیاسی ممتا برسوں بعد بیٹے کی محبت سے سیراب ہو رہی تھی' اسی لیے محض اس کی ناراضی کے ڈر سے خاموش بھی ہو گئی تھی۔
سارا علوی کے گھر اس کا استقبال بہت نارمل طریقے سے ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ تو صوفے پر اکڑ کر بیٹھی تھیں۔ محض مسکرا کر ہلکا سا سر خم کر کے اسے سلام کا جواب دیا تھا البتہ نواز اکرم نے بڑی گرمجوشی محبت اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ماہین کو دیکھ کر وہ کچھ مایوس

ضرور ہوئی تھی۔ اس کا اور رانی کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ مگر وہ اب بیٹے کی پسند تھی تو اسے بھی اپنی پسندیدگی دکھانی تھی۔ کھانے کی میز پر اہتمام بہت زیادہ نہیں تھا مگر پھر بھی اسے اچھا لگا تھا۔ وہ خود بھی شرمیلی اور محتاط طبیعت کی مالک تھی۔ زیادہ دیر خاموش ہی رہتی تھی۔ ہاں ماہین ضرور تمام وقت اس کے ساتھ چپ بیٹھی رہی تھی اور اس سے بات کر کے فاخرہ کو احساس ہوا تھا کہ وہ صورت کی بھلے اچھی نہ تھی مگر سیرت کی بہت ہی اچھی تھی، ہنس مکھ، ملنسار اور سادہ سی۔ وہ اپنی ماں اور بہن کے رویوں پر شرمندہ تمام وقت تلافی کی کوشش کرتی رہی تھی اور ایک یہ ہی بات فاخرہ کو اس کی بہت اچھی لگی تھی اور جس کا اظہار اس نے کھل کر کیا تھا۔

”صورت کا کیا کرنا ہے، سیرت اچھی ہو تو بہو گھر کو جنت بنا دیتی ہے۔ اس کی ماں، بہن کتنی خوب صورت تھیں مگر عادتیں توبہ توبہ انسان کو انسان نہ سمجھیں اتنا نخرہ اتنا غرور۔“

”شکر ہے اماں! آپ کو وہ پسند آئی ہے میں نے کہا تھا نا وہ بہت اچھی ہے، اسی لیے تو میں یہ پسند کرنے کو تیار ہو گیا ہوں۔“

”مجھے لگتا ہے یہ لوگ شادی جلدی کریں گے۔“ اس نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”کیونکہ سارا علوی کہہ رہی تھی ہم نے چھوٹی کی بات بھی طے کر دی ہے، اب اس کی منگنی بھی کرنی ہے۔“

”ہاں... اس کی منگنی بھی کرنے والے ہیں یہ، مگر پہلے ماہین کی ہو گی منگنی۔“

”کیا ضرورت ہے اتنا پیسہ خرچ کرنے کی؟ بس میں نے رسم تو کر دی ہے نا، اسے پیسے دے کر پکی بات کر دی ہے۔“ فاخرہ نے سادگی سے کہا تو کاشف زور سے ہنس دیا تھا۔

”اماں... یہ امیر لوگ ہیں اور ماہین کا رشتہ تو ویسے بھی بڑی مشکل سے ہو رہا ہے، خوب رونق لگائے گا نواز اکرم۔ بہت بڑا فنکشن ہو گا اور ہونا بھی چاہیے اماں، تو دیکھتی جا۔“

کاشف کے لبوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ تھی اسی منگنی کے بہانے تو وہ ماہین سے لاکھوں لے چکا تھا اور اب نواز اکرم سے لینے کی باری تھی۔

☆ ☆ ☆

”اس روز میرب کی ساس آئی تھیں تو کھانا پی سی سے آیا تھا اور کرسٹل ڈنر سیٹ لگایا گیا تھا۔ اور آج کاشف کی امی کے لیے وہ کھانا لگایا گیا ہے، جو ہم روزانہ عام حالات میں بھی نہیں کھاتے ہیں۔ صرف ایک سالن، سادہ چاول، روٹی اور بس، نہ کباب، نہ روسٹ اور نہ ہی سلاد۔ بابا یہ زیادتی ہو رہی ہے میرے ساتھ اس گھر میں۔ آپ کہتے ہیں میں ملما سے ناراض ہوتی ہوں، اسی لیے تو ناراض ہوتی ہوں کہ یہ مجھ میں اور میرب میں تفریق کرتی ہیں۔“

اس نے مہمانوں کے جانے کے فوراً بعد سارا غصہ نواز اکرم پر نکالا تھا اور پھر بس پھٹ پڑی، وہاں سے چلی گئی تھی۔ نواز اکرم کے ماتھے پر بل آ گئے تھے۔ اور پریشانی سے سارا کو دیکھا۔

”دیکھا تم نے کیسے زبان چلتی ہے اس کی“ سارا نے دانت پیس کر نواز اکرم کو جتایا تھا اور نواز اکرم کے لیے سارا سے بات کرنا ہمیشہ ہی بہت مشکل تھا۔ جانے کیوں اس کی ساری بہادری، مردانگی اور ہمت جواب دے جاتی تھی اور وہ محض ہکلا کر رہ جاتا تھا مگر ماہین کے سلسلے میں ہونے والی یہ زیادتی ایسی تھی کہ وہ خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

”سارا! تم نے بھی زیادتی کی ہے نا، تمہیں مینیو اچھا رکھنا چاہیے تھا۔ اگر گھر میں کھانا نہیں بن سکتا تھا تو ہوٹل سے منگوا لینا تھا۔“

”نواز... تم بھی اس کی ہر الٹی سیدھی اور غلط بات پر فوراً یقین کر کے مجھ سے جواب طلبی پر اتر آتے ہو۔ اگر عالیہ وسطی کے لیے کھانا پی سی سے آیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اسٹینڈرڈ پی سی کا تھا اور تمہارا کاشف تمہارے دفتر کا معمولی ملازم، تمہارے سامنے کھڑے ہو کر چائے پینے کی بھی جرأت نہیں ہے اس بے چارے... نواز! میری بات سنو اور کہہ کر میرا دل دکھانا میں چاہتی ہوں۔ نہیں کیا معلوم اس کو کہ ماہین کا رشتہ دوڑ کر کے اپنے سرکل میں کی شرمندگی ہوئی۔ بھی عالیہ وسطی اور انور واسطی کو منگنی سے باہر رکھنا ہے۔ تم فوراً ان کی منگنی میں منگنی کر دو۔ تاکہ انہیں کاشف کے ماں باپ کی حیثیت کا علم نہ ہو سکے۔“

”سارا! بس... یہ کیا کہہ رہی ہو، اس میں شرمندگی والی کیا بات ہے۔ ابھی وہ میرے آفس میں کلرک ہے، ہمیشہ تو کلرک نہیں رہے گا نا، میں اسے اپنے بزنس کے قریب لے آؤں گا، دیکھنا، پھر ہمیں کسی خوف اور ڈر نہیں رہے گا مگر ابھی۔“

اس نے بے بسی سے ماہین کے کمرے کی جانب دیکھا۔ وہ رو رہی ہو گی۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کس موڈ میں گئی ہے۔

”ابھی اس کے پاس جاؤ گے تو وہ اور بھی رونے لگی۔ بیٹے اکرم... اس کی ہر بات... سب کو ماہین اچھی لگتی ہے... تمہیں اسے سمجھانا چاہیے، تمہاری ماں اور بہن غلط نہیں ہیں۔ وہ تمہارے لیے کر رہی ہیں سمجھتی ہیں۔ نواز اس لڑکی کو سمجھاؤ، کوئی تو ایک بات نہیں سنتی یہ۔“

سارہ نے الٹا اسے ہی سنا دیا تھا۔ نواز اکرم کو اپنی ہی حیرانی مشکل ہوئی تھی اور بے چارے کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ جب بھی بیٹی کی شکایت کرتا تو سارا الٹا اسے ہی سنا دیتی تھی اور وہ اپنا سا منہ بنا کر رہ جاتا تھا۔

”پھوپھو... کاشف کی امی نے مجھے دو ہزار دیا ہے، بہت اچھی ہیں وہ، بہت سادہ اور نوٹنگ، مگر پاپا نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے پھوپھو۔“

”کیا کیا؟“ ثروت بے اختیار بولی۔

”انہیں شرمندہ کرنے اور کم حیثیت جتانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کھانا بہت سادہ رکھا اور آخر میں چائے بھی نہیں دی۔ پھوپھو آپ مجھے کہتی ہیں تم صبر کرو، برداشت کرو، ماں ہے، اس کا دل برا نہیں ہے

بس یوں ہی عادت سے مجبور ہے۔ میں کہتی ہوں وہ مجھے اپنی بیٹی ہی نہیں سمجھتی ہیں۔ ان کے لیے میرب ہی سب کچھ ہے۔“ اس نے روتے ہوئے سسکی لی۔

بہت دیر کا دبا غبار نکال کر اب کھل کر برسات ہو رہی تھی اور ثروت جانتی تھی کہ آج کی رات اس پر کتنی بھاری ہو گی، مگر وہ دور بیٹھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

”اوئے واہ بھئی واہ... استانی، تیرے بیٹے نے تو بہت اونچا ہاتھ مارا ہے، نواز اکرم... سیٹھ نواز اکرم کی بیٹی سے منگنی... واہ... یعنی وارے نیارے ہو گئے، تیرے تو... اور وہ بے چاری رانی... اس کا کیا بنے گا... تیری بہو گا۔“ اقبال نے چبا چبا کر لفظ بہو بولا تھا۔ فاخرہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”تمہیں... یہ... یہ سب کس نے بتایا۔“ اس نے پریشانی سے ہکلا کر پوچھا تو اقبال زور زور سے ہنسنے لگا۔

”کچھ سمجھتی ہے مجھے؟ میری بھی انٹیلی جنس ہے استانی! جسوس (جاسوس) چھوڑے ہوئے ہیں یہاں

وہاں۔ تو اُنے پتر کے ساتھ سیٹھ نواز کے گھر نہ تھی تو میں بھی وہاں گھر سے باہر گلی میں ہی کھڑا تھا۔"

"کیوں... اعتبار نہیں تھا میرا...؟"

"معاملہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اصل میں کیا ہے۔ اکیلے اکیلے رشتہ طے کرلیا تو نے مجھ سے پوچھا نہیں۔"

"کیوں بتاتی؟ کس رشتے سے؟" فاخرہ کو اس کا حق جتانا ذرا نہیں بھایا۔

"تیرا خصم ہونے کے رشتے سے۔ کاشی مانے نہ مانے باپ ہوں میں اس کا۔"

"ہوں باپ... اب مجھے یاد آیا کہ تو اس کا باپ ہو، جب باپ بننے کی ذمہ داری اٹھائی تھی تب تو وہ پرائی اولاد تھا۔ اب اس کے پاس پیسہ ہے تو ہر دوسرے دن وہ بیٹا بن کر تیرا منہ بند کرتا ہے، صرف میرے لیے میری وجہ سے... ورنہ اس دن جیسے تو نے مجھے مارا تھا تا میں اللہ کا واسطہ نہ دیتی تو کاشی تجھے مار دیتا۔" فاخرہ کے جتانے پر اقبال نے خباثت سے قہقہہ لگایا تھا۔

"اب آیا نا مزا اب تو اس سے پیسہ نکلوانا اور بھی آسان ہے۔ اس کے دفتر چلے جایا کروں گا اپنے سمدھی سے بھی مل لیا کروں گا بہت۔" اقبال نے زوردار قہقہہ لگا کر باہر کا رخ کیا تھا اور کچن میں کھڑی فاخرہ کی ٹانگیں یک دم کانپ گئی تھیں۔ کم بخت ایسا پینترا کھیلتا تھا کہ آگے وار بچ بھی نہ سکے۔

"اب یہ اور بھی کاشی کو تنگ کرے گا۔ بڑی ڈیمانڈ کرے گا۔ اف اللہ میں نے یہ کیا کر دیا۔ کاشی نے مجھے منع بھی کیا تھا کہ اسے نہ بتانا مگر اس نے پھر بھی مجھ سے اگلوا لیا سب کچھ۔" کچن میں کھڑی وہ آنے والے وقت سے ہراساں کانپ رہی تھی۔

"مجھے... مجھے کاشف کو سب کچھ بتا دینا چاہیے تاکہ اگر یہ اسے جا کر تنگ کرے تو وہ اسے جواب تو دے سکے۔ ہاں یہ... یہ ٹھیک ہے۔ اسے فون ملاتی ہوں۔" وہ جلدی سے کچن سے نکل کر باہر آئی۔

"ہیلو... امی... خیریت اس وقت فون کیوں کیا ہے؟" کاشی کی حیرت بجا تھی۔ دن کے وقت میں تو فاخرہ اسے کبھی بھی فون نہیں کرتی تھی۔ اسکول اور پھر کاشف اکثر اس سے رات کو ہی بات ہوتی تھی رات کو اقبال بھی گھر نہیں ہوتا تھا تو فاخرہ بھی بغیر کسی خوف کے کھل کر بیٹے سے بات کر لیتی تھی۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔ وہ میں نے اس لیے فون کیا تھا... وہ اقبال... تھوک نگل۔ اب یقیناً" کاشی بہت ناراض ہوگا۔

"کیا بات ہے امی... کھل کر بولو اقبال نے کچھ کہا ہے۔" اس کا دھیان فوراً اقبال کی طرف گیا تھا۔

"اسے پتا چل گیا ہے کاشی کہ تم... تمہارا نواز ... کی بیٹی کے ساتھ تعلق۔"

"کس نے بتایا اسے... آپ نے۔" کاشی نے بات کاٹ کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔ اس نے زبردستی ہی مجھ سے۔" فاخرہ کا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا، وہ ہکلائی۔

"امی... امی میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ تم... وہ بے غیرت، گھٹیا، بلیک میلر اب جو کرے گا نہیں معلوم... وہ تب تو... میں... تھا۔"

"وہ کہہ رہا تھا کہ میں اب کاشی سے اس کے ... میں ہی مل لیا کروں گا اور..."

"اور نواز اکرم سے بھی... بتا۔" کاشی نے دوبارہ اس کی بات کاٹی۔

"ہاں..." فاخرہ نے مضبوطی سے کرسی کا ... تھام لیا تھا۔ اب نہ جانے وہ کیا کہے گا مگر اس نے جواب نہیں دیا تھا اور کچھ ہی دیر بعد فون سے ٹوں ٹوں کی آواز آنے لگی تھی۔ فاخرہ کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔ اسے کاشی کی ناراضی کا اندازہ تھا۔ وہ اقبال کے معاملے میں اسے بھی معاف کرنے پر تیار نہ تھا اور اب تو اور بھی...

"ہائے یہ کیا ہو گیا۔" اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جیسے خود سے ہی پوچھا تھا۔

☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

"یہ ہیں ہماری نئی کمپنی کے پارٹنر اینڈ مینجنگ ڈائریکٹر ایزد آفندی!"

شاہ نواز حیدر نے سب سے تعارف کروانے کے بعد اسے جس شخصیت کی طرف متوجہ کیا تھا' اس کا تعارف کنسمالہ حیدر کے لیے کسی تباہ کن دھماکے سے کم نہیں تھا' اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا' ایزد آفندی اپنی شاندار پرسنالٹی کے ہمراہ اونچے پورے قد سے کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا' وہ اس وقت بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس پہلے سے بھی زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔

کنسمالہ حیدر لب بھینچ کر غم ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور اس کوشش میں اس کا ... ہو چکا تھا' اور شاہ نواز حیدر اس کی حالت سے بے خبر اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

"اور ایزد! یہ ہے میری بیٹی' میری جان' میری کاشلی!"

انہوں نے انتہائی محبت پاش لہجے میں کہتے ہوئے اپنی بیٹی کو بازو کے گھیرے میں لے کر تعارف کرایا۔ حالانکہ ان دونوں کو کسی بھی تعارف کی ضرورت نہیں' دونوں پہلے سے ہی ایک دوسرے کو بخوبی جانتے تھے۔

"یہ نئی کمپنی میری بیٹی کی خواہش پہ وجود میں آئی ہے۔ میری بیٹی کو مجھ سے الگ ہو کر اپنی صلاحیت منوانے کا اور کام کرنے کا شوق ہے۔ اب ہم دیکھیں گے کہ میری بیٹی کیا کارنامہ انجام دیتی ہے اور کہاں تک کامیابی حاصل کرتی ہے؟ کیوں میری جان' کیا خیال ہے؟"

انہوں نے کشمالہ کو اپنے قریب بلاتے ہوئے پوچھا تھا اور وہ یک دم اپنی ماؤف ہوتی کیفیت سے باہر نکل آئی۔ چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ نفرت اور حقارت کی جھلک وہ بھی بخوبی دیکھ چکا تھا۔

"پاپا! میرا خیال ہے کہ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔"

اس نے نازک کلائی پہ بندھی انتہائی قیمتی اور نفیس سی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور شاہ نواز حیدر اس کی اس قدر سنجیدگی پہ ٹھٹک گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ ان کی لاڈلی بیٹی کا موڈ کسی بات پہ آف ہو چکا ہے۔

وہ ایزد آفندی سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہہ رہے تھے، "اچھا ایزد! ہم چلتے ہیں، کل آفس میں ملاقات ہوگی۔ یہ آئی بھی دیر سے ہے اور اب جانے کی بھی جلدی کر رہی ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ ہی پارکنگ تک آگیا۔

"کل کام کا پہلا دن ہے، جس کے لیے کمپنی کے تمام ممبرز اور تمام اسٹاف کا موجود ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ میٹنگ کے وقت کسی بھی ممبر کی غیر موجودگی مناسب نہیں ہوگی۔" ایزد نے اپنی گاڑی کی سمت بڑھتی کشمالہ حیدر کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے شاہ نواز حیدر کو تاکید کی تھی۔

"تم بے فکر رہو، سب ٹھیک وقت پر اور تمام ممبرز کی موجودگی میں ہوگا۔"

وہ ایزد آفندی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے خدا حافظ کہہ کر کشمالہ کے برابر گاڑی میں آبیٹھے۔ ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔ ان کی گاڑی رخصت ہوتے ہی ایزد آفندی نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"آپ کی جان، آپ کی کاشلی، کسی اور کی بھی جان ہے شاہ نواز صاحب!"

وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ آنکھوں کے پردے پہ تھوڑی دیر پہلے کا منظر تازہ ہو گیا جب وہ اس کے ہدف پہ یوں چونکی تھی جیسے کرنٹ چھو گیا ہو اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں ایزد کے لیے زہر اتر آیا تھا۔ پھر کا اک اک [illegible] ہوتے رہ گیا تھا۔

کشمالہ حیدر کا رویہ دیکھ کر ایزد آفندی کا سارا اعتماد لڑکھڑا گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے اپنا اعتماد ہوا ہوا محسوس کرتا تھا کیونکہ پہلے وہ جس کاشلی کو جانتا تھا، وہ ایک موم کی گڑیا تھی، جس کو ایک سانچے میں ڈھال کر ایک شکل دینا بہت آسان تھا لیکن اب وہ ایک پتھر کی مثال تھی، جس کو تراشنا، جس کے نین نقوش ابھارنا بے حد مشکل امر تھا۔ اس کے اپنے ہاتھوں بھی ضرب آسکتی تھی، اپنی انگلیاں فگار ہو سکتی تھیں لیکن اگر کسی چوٹ، کسی درد کے بدلے بھی وہ پتھر کی مورت، موم کی گڑیا بن جاتی تو سودا مہنگا نہیں تھا۔ آخر کو جانے ان جانے میں وہ بھی تو اس موم کی گڑیا [illegible] [illegible] تھا۔

☆ ☆ ☆

پورچ میں گاڑی رکتے ہی وہ گاڑی سے اتر آئی اور شاہ نواز حیدر کے اترنے کا انتظار کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"کاشلی۔ کاشلی بیٹا رکو تو۔" وہ بھی گاڑی اتر کر تیزی سے اس کے پیچھے آئے تھے لیکن وہ ان سنی کر کے سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی۔

"کاشلی!" اب کی بار انہوں نے کافی اونچی آواز میں پکارا تھا۔ اس کے قدم پہلی دونوں سیڑھیوں پہ ہی تھم گئے۔

"ادھر دیکھو میری طرف۔" وہ سیڑھیوں کے قریب آرکے۔

"پاپا پلیز! میرے سر میں درد ہے، میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے ذرا جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ شاہ نواز حیدر اس کا چہرہ دیکھنے لگے لیکن وہ نظریں جھکائے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

"اوکے! تو پھر جاؤ جا کر آرام کرو، لیکن صبح تم نصیب ہو جانا چاہیے، اوکے۔" ان کے لہجے اور انداز میں اس کے لیے جتنی محبت اور چاہت تھی، وہ [illegible] جانتی تھی۔

روم میں داخل ہوتے ہی اس نے ہاتھ میں پکڑا [illegible] کلینسی پرس بیڈ پہ اچھال دیا۔

"نئی کمپنی کا پارٹنر اینڈ منیجنگ ڈائریکٹر ایزد آفندی۔" وہ زیر لب دہراتے ہوئے دبے لہجے میں [illegible] تھی۔ "میری کمپنی میں میرا پارٹنر بنے گا۔ یہ نہیں ہوگا۔"

وہ اپنی کلائی سے رسٹ واچ اور کانوں سے ٹاپس اتارتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"ایزد آفندی میرا پارٹنر نہیں ہو سکتا۔"

اس نے سینڈل اتار کر سائیڈ پہ ڈال دیے۔

"میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔" اس نے ٹشو باکس سے ٹشو کھینچ کے اپنے ہونٹوں پہ سجی نیچرل کلر کی لپ اسٹک پونچھ ڈالی۔

"مجھے [illegible] سے نفرت ہے، نفرت، میں اس کی شکل نہیں [illegible] چاہتی۔"

وہ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے حقارت [illegible] اور بالوں کا جوڑا کھول دیا۔ جو کافی دیر پہلے [illegible] نے خاصی محنت اور نفاست سے بنایا تھا۔

"تمہارے ساتھ کام کرنے سے بہتر ہے میں اپنی [illegible] آگ لگا دوں یا پھر تمہیں آگ لگا دوں۔" وہ [illegible] کر غصے سے چیخی تھی۔

دروازہ کھول کر آمنہ بیگم اندر آئیں۔ "کاشلی! کیا [illegible] تم ٹھیک تو ہو۔" انہوں نے پریشانی اور تشویش سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا ہے مجھے؟" وہ الٹا ان سے پوچھ رہی تھی۔

"تمہاری چیخ کی آواز سن کے آئی ہوں، میں تو ڈر رہی تھی۔" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا، جیسے اس [illegible] خیریت پہ شکر ادا کیا ہو۔

"میں چیخی ہوں کیا؟ مگر کیوں؟" وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی، آمنہ بیگم ہکا بکا رہ گئیں۔ "تم [illegible] ٹھیک نہیں ہو، میں ڈاکٹر کو۔"

"پلیز! اسے، چونچلے کی ضرورت نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں، مجھے بس تنہائی چاہیے۔" وہ عجیب چڑچڑے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

"اوکے! میں چلی جاتی ہوں، تم آرام کرو۔" وہ واپس پلٹ گئیں۔

"دوبارہ چیخوں تو پھر مت آیئے گا۔" اس نے پیچھے سے تلخی کا تیر پھینکا تھا۔ وہ اس کی سمت پلٹیں، اسے حیرت سے دیکھا، کچھ کہنا بھی چاہا، لیکن کہا نہیں۔ خاموشی سے چلی گئیں۔

رات بے حد گہری ہو چکی تھی، ہر سو سناٹا تھا، خاموشی تھی، سکون تھا، لیکن کشمالہ کے دل کے اندر یہ تینوں چیزیں نہیں تھیں۔ اس نے سوچتے سوچتے کھڑکی کے پٹ سے سر ٹکا دیا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، آج اس کی شکل دیکھی تھی، آج پلک سے پلک کا ملنا دشوار تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا کہ مجھے ایزد آفندی کے ساتھ کام کرنا ہے؟" صبح ناشتے کی میز پہ اس نے پہلا استفسار یہی کیا تھا۔ اخبار کے صفحات پہ نگاہ دوڑاتے شاہ نواز حیدر نے قدرے چونک کر اس کی صورت دیکھی، وہ بے حد سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

"کیوں تمہیں ایزد کے ساتھ کام کرنے پہ کوئی اعتراض ہے؟" انہوں نے رسانیت سے پوچھا۔

"دیکھیے پاپا! اچھا اور سکسیس فل کام کرنے کے لیے ہمارے پارٹنر کا اچھا اور ایمان دار ہونا ضروری ہوتا ہے، چاہے وہ بزنس پارٹنر ہو، لائف پارٹنر ہو یا گیم پارٹنر اور مجھے پورا یقین ہے کہ ایزد آفندی ان تینوں چیزوں میں صرف اور صرف دھوکا دے سکتا ہے، کامیابی یا نفع نہیں دے سکتا۔"

اس کا لہجہ اور انداز بے حد سخت تھے۔ شاہ نواز حیدر پہلے حیران ہوئے، پھر سر جھٹک کر مسکرا دیے۔

"بیٹا! قبل از وقت رائے دینا عقل مندی نہیں ہوتی۔ تم اس کے ساتھ کام کرو گی تو اپنے یہ الفاظ واپس

لینے پہ مجبور ہو جاؤ گی۔ بہت قابل اور ذہین بندہ ہے۔"
وہ کافی متاثر انداز میں کہہ رہے تھے۔
"پاپا! آپ نہیں جانتے اس شخص کے لیے ہر کام ہی بائیں ہاتھ کا کھیل ہے' چاہے وہ میرا دل ہو' آپ کا بزنس۔"
شاہ نواز حیدر کو اس کی تعریفوں کے پل باندھتے دیکھ کر وہ اندر ہی اندر جل اٹھی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ایزد آفندی کا سارا کچا چٹھا کھول کر سامنے رکھ دے' مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ یہ سب کرنے کے لیے اسے اپنی ذات پہ پڑا آنچل بھی ہٹانا پڑتا۔
اس نے ایزد آفندی کے ساتھ کام نہ کرنے کا پکا ارادہ باندھ رکھا تھا۔ لیکن آفس میں پہلی میٹنگ کے دوران جو کچھ ایزد آفندی نے کہا' وہ کنسمالہ حیدر کو میدان میں ڈٹ جانے پہ مجبور کر گیا تھا۔
اس کا کہنا تھا کہ "جس فیلڈ میں بھی وہ قدم رکھتا ہے وہاں کوئی اور اپنے قدم قائم نہیں رکھ سکتا یا تو مقابل والا میدان چھوڑ دیتا ہے یا پھر وہ اپنے مد مقابل کا رخ کر لیتا ہے۔"
اور اس کا اپنی ذات پہ ایسا اعتماد اور اعتراف کا ایسا سر عام اظہار دیکھ کر ہی کنسمالہ حیدر اپنا ارادہ اور فیصلہ بدلنے پہ مجبور ہو گئی۔ اس نے میدان چھوڑنے کے بجائے میدان میں ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا' جس کے لیے اس نے بڑے اعتماد اور برداشت کے ساتھ میٹنگ کے اختتام پہ ایزد آفندی سے ہاتھ ملایا تھا۔
پہلے تو دونوں کے درمیان ایک سرد خاموشی اور ایک سرد کیفیت حائل تھی' مگر اب سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آئم سوری۔" امینہ بیگم کنسمالہ کی مدھم سی آواز پہ چونک کے پلٹیں' وہ اپنے لیے کافی بنانے آئی تھیں' کیبنٹ سے کافی کا پیکٹ نکال کے دیکھ رہی تھیں۔
"سوری' کس لیے؟" انہوں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔
"میں نے اس روز آپ سے بدتمیزی کی تھی۔" وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی تھی۔
"ارے نہیں بیٹا! سوری کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ذہن ڈسٹرب ہو تو بندہ کچھ بھی کہہ جاتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلتا۔" انہوں نے سر جھٹک کر نرمی سے کہا۔
"لیکن مجھے ڈسٹربنس میں بھی ایسا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں آپ کے ساتھ بدتمیزی کروں۔" اس نے تلے لہجے میں کہا' امینہ بیگم پل بھر کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔
"اکثر آیان اور رہان بھی تو ایسا کر جاتے ہیں۔" انہوں نے مثال دی۔
"وہ آپ کے بیٹے ہیں۔" اس کا جواب دو ٹوک تھا۔
"تم بھی تو میری بیٹی ہو۔"
"[illegible] حد تک میں آپ کی بیٹی بن [illegible] تک رہنا چاہیے نا اگر حد پار کروں گی تو آپ ہی میری حد یاد دلائیں گی اسی لیے بہتر ہے میں خود ہی اپنی حد کا تعین کر لوں۔"
وہ کافی تیار کر چکی تھی' اسی لیے بھاپ اڑاتا مگ کر پلٹ گئی۔
"اور میری اس بات کو بدتمیزی مت سمجھیے گا' میں آپ سے بدتمیزی نہیں کرنا چاہتی' لیکن پتا نہیں کیوں ایسا ہو جاتا ہے' آپ بہت اچھی خاتون ہیں' واقعی آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔"
وہ ذرا دیر کے لیے ان کے سامنے رکی اور سپاٹ سے انداز میں کہہ کر باہر نکل گئی' امینہ بیگم اس کے پیچھے دیکھتی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے بیٹا! تم دو' تین روز سے اپ سیٹ دکھائی دے رہی ہو' کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔" [illegible] مسلسل دو' تین روز سے اسے خاموش خاموش اور گم صم سا دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وہ اس کے ہاتھ سے میگزین لے کر سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بولے اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
"ڈونٹ وری پاپا! میں بالکل ٹھیک ہوں' کوئی پرابلم نہیں ہے' بس یوں ہی کبھی کبھی دماغ کچھ بوجھل سا ہو جاتا ہے۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی تو شاہ نواز حیدر بغور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگے' وہ سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔
"اپنی ماں سے ملنا چاہتی ہو؟" وہ بے اختیار کہہ گئے تھے اور کانشلی بری طرح تڑپ اٹھی' یوں جیسے شاہ نواز حیدر نے اس کے کسی ننگے زخم پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔
"کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں؟" اس نے تڑپ کے پوچھا۔
"تم اداس ہو' اس لیے میں نے سوچا' شاید تم اپنی ماں کو مس کر رہی ہو' میں تمہارے جانے کا بندوبست [illegible]"
انہوں نے نارمل سے انداز میں کہتے ہوئے اسے [illegible]
"پاپا! کیا میں ان سے ملوں گی؟ جن کو ماں بن کر ماں بننے کا سلیقہ نہیں آیا؟ جن کو ماں کے لفظ کا مطلب اور قدر ہی معلوم نہیں ہے' کیا میں ان سے ملوں گی؟ [illegible] اپنی ماں کا کردار اتنی ہی اذیت [illegible]
"نہیں پاپا! میں ان سے زندگی بھر نہیں ملوں گی۔ میں جب یہاں آئی تھی تو ان کی طرف جانے والے تمام راستے بند کر کے آئی تھی۔ مجھے ان سے اب بھی نہیں ملنا' مجھے ان کے پاس کبھی واپس نہیں جانا' چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"
وہ بیٹھے بیٹھے ان کے ذکر پہ بپھر گئی تھی اور بے حد جذباتی ہو گئی تھی' پھر یک دم صوفے سے اٹھی اور ڈرائنگ روم کی دہلیز عبور کر گئی تھی۔
شاہ نواز حیدر خاموش بیٹھے رہ گئے۔ ان کی آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اپنی ماں سے اتنی بدگمان کیوں ہے' اس نفرت اور بے زاری کے پیچھے کون سا راز پوشیدہ ہے اور اچانک ماں کو چھوڑ کر اس نے باپ کے پاس آنے کا فیصلہ کیوں کیا تھا اور سب سے بڑی بات کہ اس کی ماں نے اسے باپ کے پاس آنے سے روکا کیوں نہیں تھا؟ اتنی آسانی سے اسے اجازت کیسے دے دی تھی؟
وہ جانتے تھے کہ اس مسئلے کے پیچھے کوئی خاص وجہ چھپی ہے' لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ خاص وجہ وہ پوشیدہ راز کہیں نہ کہیں کانشلی کے دل سے جڑا ہوا ہے جس کو کرید کر وہ اپنی بیٹی کو پریشان اور دکھی نہیں کر سکتے تھے۔ ابھی بھی وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پہ بیٹھے کانشلی کے عجیب و غریب ردعمل کو سوچ رہے

تھے ان کو اس الجھے ریشم کا کوئی سرا ہی نہ مل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

کاشلی بد مزاج بھی تھی اور تیز مزاج بھی، لیکن عرصہ ہوا تھا وہ اپنے تمام مزاج خاموشی کے حوالے کر بیٹھی تھی لیکن ایزد آفندی آج کل اسے بھڑکانے کی کوششوں میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کاشلی اس کی باتوں پہ غصہ کرے، بھڑکے، ایشو بنائے، مگر وہ ایسا نہیں کر رہی تھی، وہ اس کی باتوں کو نظر انداز کر کے گزر جاتی تھی اور ایزد کو ناکامی ہو رہی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جب تک کاشلی غصے میں آ کر شعلے نہیں اگلے گی، تب تک وہ اس کے سامنے اپنا کیس نہیں لڑ سکے گا، نہ ہی کوئی صفائی پیش کر سکے گا۔

آج آفس میں ایک اور میٹنگ تھی اور اتفاقاً دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل جگہ ملی تھی۔ ایزد کن اکھیوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے ٹیبل پہ رکھی فائلوں کو بے وجہ ہی گھورے جا رہی تھی۔ میٹنگ کے اختتام پہ اسٹاف ممبرز کے درمیان ہلکی پھلکی گپ شپ کا سلسلہ شروع ہو گیا، اچانک کسی نے گفتگو کا رخ عجب سمت میں موڑ دیا تھا۔

"ایزد! تم اور کاشلی دونوں ایک دوسرے کے بزنس پارٹنر ہو، لیکن میرا خیال ہے کہ تم دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے، اور دوسری بات کہ تم تجربے کار ہو، تمہارے پاس سکسیس فل ایکسپیرینس ہے، جبکہ کاشلی کے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے، وہ پہلی بار کسی کام میں ہاتھ ڈال رہی ہے، اس لیے مشکل بھی ہو سکتی ہے اور نقصان بھی۔"

مسز بٹ جوان کی کمپنی کو اسپانسر کر رہی تھیں کافی بے تکلفی سے ایزد کے ساتھ گفتگو کا آغاز کر چکی تھیں۔

"ایک بات آپ کو بتا تا چلوں کہ "میں اور کاشلی" سوری میرا مطلب ہے کہ مس کشمالہ حیدر مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہیں اور میں بھی مس کشمالہ حیدر کو بہت قریب سے جانتا ہوں، اس لیے مزاج کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا، اور دوسری بات کہ میرا تجربہ کار ہونا بھی مس کشمالہ حیدر کا مرہون منت ہے۔ میں نے سب کچھ ان سے حاصل کیا ہے، اگر کہیں کوئی مشکل پیش آئی مجھے ہینڈل کرنا آتا ہے، کیوں مس کشمالہ حیدر! ایم آئی رائٹ نا؟"

ایزد نے بات کرتے کرتے ہلکے تبسم اور مبہم نظروں سے اسے دیکھا کشمالہ اس کی بات اور انداز سے سر تا پا سلگ اٹھی تھی۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کے رہ گئی تھی۔

"یس یو آر رائٹ۔" وہ چبا کے کہتی ہوئی اٹھی اور اپنی فائلیں سمیٹ کر کرسی دھکیلتی ہوئی میٹنگ ہال کا دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔ اس کی کمر کی لچک اور گردن کی اکڑ ایزد آفندی کی آنکھوں کے رستے دل میں سما گئی تھی۔

"بیٹا جی! ابھی بڑے پاپڑ بیلنا پڑیں گے، سکون سے مت بیٹھو۔" مسز بٹ نے مسکراتے ہوئے ایزد کے کندھے پہ تھپکی دی تھی، جواباً وہ بھی مسکرا اٹھا تھا۔

"مجھے بھی اب یہ ہی لگ رہا ہے کہ یہ بزنس وغیرہ کا چکر چھوڑ کر اب پاپڑ بیلنے کا کاروبار شروع کر دینا چاہیے آخر عمر بھر پاپڑ ہی تو بیلنے ہیں، گزارا ہو ہی جائے گا۔" اس نے آہ بھر کے کہا تھا اور مسز بٹ کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام کے چھ بج رہے تھے رفتہ رفتہ پورا ہال خالی ہو گیا تھا آفس بھی بند ہو چکا تھا، بس ایزد میٹنگ ہال میں بیٹھا اپنا کچھ کام نپٹا رہا تھا گھڑی پہ نظر پڑی تو اسے بھی اٹھنے کا خیال آ گیا۔ وہ اپنا لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھا، فائلیں سمیٹ کر اپنے بریف کیس میں رکھیں اور کرسی کی بیک سے کوٹ اتار کے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا، قدم وہیں کے وہیں تھم گئے۔

میٹنگ ہال کا دروازہ کھلا اور کشمالہ حیدر انتہائی متوازن چال چلتی ہوئی اس کے سامنے آ رکی تھی ایزد آفندی اندر ہی اندر دعائے خیر کرنے لگا، کیونکہ وہ لب بھینچے براہ راست اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ اس کے بولنے کا انتظار کیا، پھر بریف کیس اور لیپ ٹاپ ٹیبل پہ رکھ کے اس کے سامنے آ گیا۔

"آئی مس یو کاشلی، آئی ریئلی مس یو۔" وہ انتہائی شدت اور جذب کے عالم میں کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ رہا تھا۔ کشمالہ کی آنکھوں میں نفرت کا سمندر امڈ آیا تھا۔ "تم ایک ماہر کھلاڑی ہو، لیکن ایزد آفندی! اتنا سوچ لینا اب کی بار اناڑی میں بھی نہیں ہوں۔ میں صرف اتنا کہنے آئی ہوں کہ آئندہ کسی بھی گفتگو میں میرا ذکر نہیں ہونا چاہیے، میں آئندہ برداشت نہیں کروں گی۔"

وہ انگلی اٹھا کر انتہائی نفرت و حقارت سے اسے وارننگ دیتی ہوئی اک قہر آلود نگاہ ڈال کر واپس پلٹی ہی تھی کہ اسے رک جانا پڑا۔ ایزد آفندی اس کا ہاتھ تھام چکا تھا اور کشمالہ بے یقینی سے اس کی دیدہ دلیری دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ ایزد کے مضبوط ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

"کاشلی! پلیز گزری باتوں کو اتنا بڑا ایشو بنانے سے بہتر ہے کہ تم کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھ کر میری بات سن لو۔"

"میرا ہاتھ چھوڑو۔" اس نے ایزد کی جرات پر دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کاشلی! میرا یقین کرو، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں تمہاری ذات سے بے خبر نہیں تھا، سب خبر رکھی میں نے، صرف اس لیے کہ میں تمہیں۔۔۔"

"میں کہہ رہی ہوں میرا ہاتھ چھوڑو۔" وہ دبے لہجے میں غرائی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ جانتا تھا کہ معاملہ گمبھیر ہو چکا ہے، پھر بھی وہ اس کا ہاتھ چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ بھی ہونا ہے، وہ آج اور ابھی ہو جائے۔

"کاشلی! میں سچ مچ تم سے محبت۔۔۔"

"شٹ اپ ایزد آفندی، جسٹ شٹ اپ۔"

وہ یک دم پوری قوت سے چیخ اٹھی اور پورا میٹنگ ہال اس کی چیخ سے گونج اٹھا تھا، وہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر اس کی سمت پلٹی تھی۔

"اپنی گھٹیا زبان سے میرا نام بھی مت لو۔" وہ بے حد ہتک آمیز انداز سے کہہ رہی تھی، پھر بھی ایزد اسے حق بجانب سمجھتا تھا۔

"میں جانتا ہوں تمہیں مجھ پہ بہت غصہ ہے، لیکن یہ غصہ۔۔۔"

"ہونہہ! غصہ نہیں، نفرت کہو، نفرت، اتنی نفرت کہ جی چاہتا ہے تم پہ کھڑے کھڑے پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دوں، تاکہ تمہیں احساس ہو کہ آگ میں جلنا کیسا ہوتا ہے؟"

وہ دانت پیستے ہوئے نفرت سے کہہ رہی تھی اور اس کی نفرت کی شدت اس کے چہرے اور لہجے سے صاف محسوس ہو رہی تھی۔ ایزد بے بس ہونے لگا تھا، وہ ہاتھ مسلتی ہوئی پلٹی، پھر یک دم رک گئی تھی۔

"ویسے ایک بات میری ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی کہ تم اس بار کون سا ناٹک کرنے آئے ہو؟ اب کس کو تسخیر کرنا ہے؟ میں تو پہلے ہی تمہاری تسخیر شدہ چیزوں میں شمار ہوتی ہوں، میری ذات پہ تو تم پہلے ہی فتح کے جھنڈے گاڑ چکے ہو، اب کیا باقی ہے؟ بتاؤ مجھے کیوں آئے ہو؟"

وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولی۔ اس کی حالت پہ ایزد کے حوصلے مزید پست ہونے لگے تھے، اس نے نظریں جھکا لیں۔

"کاشلی! اس دفعہ میں خود تسخیر ہونے کے لیے آیا ہوں۔ میری ذات تمہارے سامنے ہے، اسے قدموں کی دھول بناؤ یا پھر اپنے سر کا تاج، میں کچھ نہیں کہوں گا، اف بھی نہیں کروں گا، بس اگر مجھ سے نادانستگی میں تمہارے دل کو ٹھیس پہنچی ہے تو پلیز مجھے معاف کر دو۔"

ایزد کا لہجہ دھیما اور ہتھیار ڈالنے والا تھا، انداز تھکا ہوا اور نظر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا گریبان جھنجوڑتے ہوئے ایک دم سے اسے نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا گریبان چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہٹی، کچھ کہنے کے لیے

لب کھولے پھر دل کی بات دل میں باقی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی۔
ایزد جوں کا توں کھڑا رہ گیا۔ اسے خبر تھی کہ کاملی ہچکیوں سے روتی ہوئی جا رہی ہے۔ وہ اس کی اک اک حرکت، ایک ایک عادت سے واقف تھا۔ ایزد کے کانوں میں ابھی تک اس کی آواز اور نفرت گونج رہی تھی، نہ جانے اسے وہاں کھڑے کتنی دیر گزر گئی تھی کہ وہ موبائل کی بیپ پہ بھی بمشکل ہی متوجہ ہوا تھا۔
"ہیلو...!" اس نے اپنے اعصاب کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔
"سر! کنساء میم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" دوسری طرف سے ملنے والی اطلاع ایزد کے اوسان خطا کر گئی۔
"کاملی کا ایکسیڈنٹ...؟" اسے تھوڑی دیر پہلے یہاں سے جانے والی کاملی کی جنونی حالت یاد آئی تو دماغ چکرا گیا تھا۔ "اف خدایا۔"

☆ ☆ ☆

انتہائی خوب صورت اور سبزیاں سے ڈھکے بنگلے کا گیٹ کھول کر معمول کے مطابق اپنا فٹ بال قدموں سے دھکیلتی ہوئی وہ گیٹ سے نکل کر روڈ پہ آ گئی تھی۔ کل پورے اسلام آباد میں دن بھر شدید بارش ہوئی تھی، جس کی وجہ سے سردی اور دھند میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ روڈ پہ چلتے ہوئے چند قدم آگے کا راستہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پورا شہر سویا سویا سا اور دھند میں ڈوبا ہوا سا لگ رہا تھا اور وہ اپنی ازلی لاپروائی کا ثبوت دیتی ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتی نہ جانے کس سوچ، کس دھن میں مگن آگے بڑھتی جا رہی تھی اور ساتھ ساتھ فٹ بال سے کھیلنے کا مشغلہ بھی جاری تھا۔ اسے فٹ بال کھیلنا جنون کی حد تک پسند تھا۔ وہ اسکول جاتے ہوئے بھی کھیلتی تھی، اسکول جا کر بھی کھیلتی تھی اور اسکول سے آتے ہوئے بھی کھیلتی تھی اور اس کھیل میں اسے کسی کی مداخلت قطعی ناپسند تھی۔ اسے اکیلے کھیلنے کا شوق تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے کھیل میں اس حد تک [illegible] تھی کہ اسے شدید سردی اور دھند کا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا، حالانکہ یہ ٹھنڈ ہڈیوں میں گھس رہی تھی جبکہ وہ بے نیازی سے سڑک کے بیچوں بیچ چل رہی تھی۔ وہ یقیناً اسے روند کے گزر جاتا اگر گاڑی کی [illegible] لائٹس آن نہ ہوتیں، کیونکہ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے، لیکن شدید دھند کے باعث کچھ دکھائی ہی نہ دے رہا تھا۔ وہ بمشکل بریک لگا پایا تھا۔ گاڑی کے [illegible] زوردار آواز کے ساتھ چرچرائے تھے مگر وہ بھی اپنے نام، اپنی طرز کی ایک ہی لڑکی تھی، کسی چیز میں کھو جاتی تو پھر کھو ہی جاتی تھی، جب اس پہ ہارن کی آواز کا بھی اثر نہ ہوا تو وہ اپنی گاڑی سے اتر آیا۔ تھری ون، تھری ٹو، تھری تھری، تھری فور، تھری فائیو، تھری سکس۔
"ہیلو بے بی... ہیلو... اسٹاپ اٹ۔" اس نے سخت لہجے میں اسے روکتے ہوئے اس کی فٹ بال بھی اچک لی تھی، تب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ [illegible] آنکھیں غضب کی کاٹ رکھتی تھیں [illegible] نظر میں [illegible] رہ گیا تھا۔ وہ [illegible] خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"آپ ہوش میں تو ہیں، اس موسم میں روڈ پہ [illegible] حماقت ہے [illegible] روڈ پہ کھیلنا؟ ونہ! سراسر تماشا ہے [illegible]" وہ اسے سرزنش کر رہا تھا۔
"میں اپنا نقصان ہی تو کرنا چاہتی ہوں۔" وہ [illegible] انداز سے بولی تھی ایزد اور بھی ٹھٹکا تھا۔
"آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"
"نو..." اس نے سختی سے انکار کیا۔ اور اس کے ہاتھ سے فٹ بال جھپٹتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔
"اور ہاں! آئندہ میں کھیل رہی ہوں تو مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔" اس نے جاتے جاتے ایزد کو وارننگ دی اور وہ اسے روکتا رہ گیا تھا۔
"سنو! رکو، میری بات تو سن جاؤ۔" ایزد پلٹ کر ڈرائیونگ سیٹ پہ آ بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس عجیب و غریب لڑکی کو سوچ کر حیران ہو رہا

☆ ☆ ☆

"میڈم...! آج پھر کنساء نے ایک لڑکی کو زخمی کر دیا ہے، اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا ہے۔" چپڑاسی آفس روم کا دروازہ کھول کر بدحواسی میں اندر داخل ہوا تھا اور اس اطلاع پہ مسز آفندی نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا تھا۔ ایزد نے چونک کر اپنی ماں (مسز آفندی) کو دیکھا۔ ٹھیک دس سیکنڈ کے وقفے سے [illegible] کلاس کی ٹیچر میڈم رخشندہ اور ان کے پیچھے [illegible] بچیاں اندر داخل ہوئیں۔
"میڈم! کنساء کو کسی اسکول یا اکیڈمی میں نہیں پاگل خانے میں ہونا چاہیے، وہ ایک پاگل لڑکی [illegible] نفسیاتی مریضہ ہے وہ۔"
چند روز پہلے کاملی نے میڈم رخشندہ کے ساتھ [illegible] بدتمیزی [illegible] ہو گیا تھا، اسی لیے میڈم رخشندہ [illegible]
[illegible] کون مس رخشندہ! ہمیں پتا تو چلے کہ آخر ہوا کیا ہے؟ [illegible] کر کی ہے؟" مسز آفندی نے انہیں [illegible] کی کوشش کی۔ "میڈم! وہ کنساء فٹ [illegible] رہی تھی، رانیہ نے کہا میں بھی کھیلوں گی، کنساء نے منع کر دیا۔ رانیہ پھر بھی اس کی بال [illegible] لگی، تب کنساء نے تک لگا کے بال [illegible] دے ماری اور رانیہ کی ناک اور منہ سے [illegible] لیکن کنساء پھر بھی اس کو اپنی بال سے [illegible] جب ہم نے میڈم کو بلایا، تب رانیہ کا بہت [illegible] بہہ چکا تھا، وہ زمین پہ گری ہوئی تھی اور کنساء اسے مار رہی تھی۔"
رانیہ کی کزن اور کلاس فیلو اسماء نے ساری تفصیل [illegible] کیونکہ وہ چشم دید گواہ تھی، اس نے سارے [illegible] بغور دیکھا تھا۔
"پھر غلطی پہلے رانیہ کی ہے نا؟" مسز آفندی جان [illegible] کنساء کی غلطی سے نگاہ چرا رہی تھیں۔
"میڈم... ذرا سی غلطی کا یہ مطلب نہیں کہ اس کو لہولہان کر دیا جائے، کاملی نے اس کی جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" میڈم رخشندہ حقیقتاً کاملی سے خار کھائے بیٹھی تھیں۔
مسز آفندی نے پھر بھی تحمل سے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔
"میں آج ہی اس کی مدر سے بات کروں گی۔ آپ پلیز برداشت سے کام لیں...."
"میڈم! ہم اپنے پیرنٹس کو بتائیں گے کہ ہمارے ساتھ آپ کی اکیڈمی میں کیسا سلوک ہو رہا ہے؟ آپ نے ایب نارمل بچوں کو بھی ایڈمیشن دے رکھا ہے۔"
رانیہ کی کزن اسماء کافی تیز لڑکی تھی، اس نے سنجیدگی سے کہا اور آفس روم سے چلی گئی تھی۔ کنساء اس اکیڈمی میں پچھلے ایک سال سے ایسے ہزاروں کارنامے سرانجام دے چکی تھی اور سب ہی اس سے زچ ہو چکے تھے، رانیہ کا ٹریٹمنٹ کروا کے اسے گھر بھیج دیا گیا اور ساتھ ہی مسز آفندی نے رانیہ کے والدین کو فون کر کے باقاعدہ معذرت کی تھی اور فون بند کرتے ہوئے گہری سانس کھینچی۔
"اف...! اس لڑکی نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ ہماری اکیڈمی کی ریپوٹیشن خراب کرنے پہ تلی ہوئی ہے۔" انہوں نے [illegible] کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا پین ٹیبل پہ پٹخ دیا۔
"کون ہے یہ لڑکی؟ اور آپ اسے اکیڈمی سے باہر کیوں نہیں کرتیں؟"
ایزد جو کسی کام کے سلسلے میں اپنی ماں سے ملنے اکیڈمی چلا آیا تھا اور کب سے خاموش تماشائی بنا بیٹھا تھا۔ ماں کی بے زاری اور کوفت دیکھ کر استفسار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔
"کیسے نکال دوں؟ وہ سائرہ حیدر کی بیٹی ہے، کنساء حیدر، شاہ نواز حیدر کی صاحبزادی۔"
مسز آفندی کے لہجے میں بے چارگی اتر آئی تھی کیونکہ انہوں نے کنساء کو خود اپنے گلے ڈالا تھا۔
"اوہ...!" ایزد نے بے ساختہ ہونٹ سکیڑے تھے کیونکہ وہ سائرہ حیدر کو اچھی طرح جانتا تھا۔ مسز آفندی

اور سائرہ حیدر میں دوستی کافی گہرا اور پرانا رشتہ تھا۔ آخر دوستی کا کچھ لحاظ بھی تو رکھنا تھا۔!

"تو آپ سائرہ آنٹی سے اس کے بارے میں بات کیوں نہیں کرتیں؟ وہ خود اسے سمجھائیں وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟" ایزد نے اپنی طرف سے انہیں مشورہ دیا۔

"وہ اسے زچ کرنے کے لیے ہی تو ایسا کرتی ہے' پہلے بھی کئی اسکولز اور اکیڈمیز سے ڈسچارج ہو کر آچکی ہے' اسی لیے سائرہ پریشان تھی۔ اس نے مجھ سے مسئلہ شیئر کیا تو میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں کاشلی کو سدھار دوں گی' وہ پڑھے گی' اپنی عادات و اطوار بھی بدلے گی' یوں سمجھ لو کہ وہ میرے لیے ایک چیلنج تھی۔ اس نے مجھے ناکوں چنے چبوا دیے ہیں' اب تم خود سوچو ایک سال پہلے جس لڑکی کو میں نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا تھا' کیا اب اس کی ماں سے یہ کہوں کہ میں ہار گئی اور وہ بالشت بھر کی لڑکی جیت گئی ہے۔۔۔؟"

مسز آفندی نے اپنی الجھن اپنے بیٹے کے سامنے کہی' وہ بھی ماں کا مسئلہ سمجھ گیا تھا۔

"وہ کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار تو نہیں ہے؟"

"ارے احساس کمتری کہاں سے ہوگا۔۔۔؟ امیر ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے' اچھا پہنتی ہے' اچھا کھاتی ہے' اچھا خرچ کرتی ہے' شکل و صورت میں بھی کم نہیں ہے' رنگت سے لے کر نین نقوش تک خوبصورت اور پرکشش ہیں' شہر کے اچھے اور مہنگے ترین تعلیمی اداروں میں پڑھتی ہے' اس عمر میں لے اور کیا چاہیے؟ ابھی بچی ہے دسویں کلاس میں پڑھ رہی ہے' اس لیے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی محبت کا مسئلہ ہے' اس لیے ایسا کرتی ہے۔ اس کی تو روٹین بھی بالکل تیر کی طرح سیدھی ہے' گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر' فٹ بال کھیلنا یا پھر سائیکلنگ کرنا' بس اس کے علاوہ تو اس کا کوئی اور شوق اور مصروفیت بھی نہیں ہے۔"

ایزد کے سوال پہ انہوں نے تفصیلی جواب دیا۔ وہ چپ ہو گیا۔

"لیکن ماما! کہیں کوئی کی ضرورت۔۔۔ دے اس ٹاپک پہ پھر کبھی بات کریں گے۔ ابھی میرے ساتھ گھر چلیں ڈیڈ انتظار کر رہے ہوں۔۔"

وہ سر جھٹک کر کہتے ہوئے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں مسز آفندی کے موبائل پہ بیپ ہو گئی۔ انہوں نے موبائل اٹھا کر اسکرین پہ نمبر دیکھا' بے ساختہ مسکرا دیں۔

"چلو چلتے ہیں' تمہارے ڈیڈ کچھ زیادہ ہی بے تاب ہو گئے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے خود بھی کرسی سے اٹھ گئیں اور اپنا موبائل اور بیگ وغیرہ لے کر ایزد کے ساتھ ہی باہر نکل آئیں۔

یہ اکیڈمی اسلام آباد کے مہنگے ترین اور معیاری تعلیمی اداروں میں شمار کی جاتی تھی۔ اس اکیڈمی کی ترقی اور کامیابی کے پیچھے مسز آفندی کی دن رات کی محنت اور لگن کا ہاتھ تھا۔

سب کچھ اپنے بل بوتے پہ قائم کیا تھا اور آج بہت مطمئن اور کامیاب تھیں کیونکہ ان کی اکیڈمی کے بہترین تعلیمی اداروں میں شمار ہوتی تھی۔

کلاس رومز کے سامنے بنے کوریڈور سے گزر کر دونوں ماں بیٹا لان میں بنی سرخ بجری کی روش پہ آئے اور یونہی اپنے دھیان میں آگے قدم بڑھاتے ایزد کی نگاہ بائیں طرف بنے پلے گراؤنڈ کی سمت اٹھی تو وہ تھم گئے۔

"ماما! وہ لڑکی کون ہے۔۔۔؟" اس نے پلے گراؤنڈ میں فٹ بال کھیلتی لڑکی کی سمت اشارہ کیا جو اپنے کھیل میں ایسی جنونی ہو رہی تھی کہ آس پاس کا بھی ہوش نہیں تھا۔

"یہی تو ہے کاشلی۔۔!" جتنا نام عجیب تھا اتنی ہی وہ خود بھی عجیب تھی۔ ایزد کی آنکھوں میں دو روز پہلے کا منظر گھوم گیا' جب وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھیل رہی تھی اور وہ ہارن پہ ہارن دے رہا تھا۔

"اور ہاں! آئندہ میں کھیل رہی ہوں تو مجھے ڈسٹرب مت کرنا' ایزد کو اس کی وارننگ بھی اچھی طرح یاد تھی۔ وہ اسے پہلے دن ہی کافی عجیب لگی

۔۔۔ تھی لیکن اب تو دلچسپ بھی لگ رہی ۔۔۔

"میں اپنا نقصان ہی تو کرنا چاہتی ہوں۔۔۔" اسے اس کی ایک اور بات یاد آئی اور وہ زیر لب بڑبڑا کے رہ گیا۔

"اچھا! تو اس چیز کا نام ہے کاشلی۔۔۔" اس کی سوچ کی اڑان بہت دور تک اڑان بھر چکی تھی' وہ سچ مچ ایک چیلنج ہی تھی' مسز آفندی کے لیے بھی اور ایزد آفندی کے لیے بھی۔۔۔ محض ایک چیلنج!

☼ ☼ ☼

"میں نے تمہیں ملک شیک لانے کو کہا تھا۔" وہ ملازمہ کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس دیکھ کر غصے میں آ گئی۔

"وہ میڈم نے کہا ہے کہ آپ کی طبیعت خراب ہے' آپ کو ملک شیک کے بجائے دودھ پینا چاہیے۔ ۔۔۔ ٹھنڈا دودھ اچھا نہیں ہوگا۔" ملازمہ نے منہ بنا کر کہا۔

"چلی جاؤ یہاں سے' مجھے کچھ بھی نہیں لینا' آئی جسٹ گیٹ لاسٹ فرام ہیر۔" وہ دھاڑنے لگی تھی ۔۔۔ کو جوں کا توں کھڑے دیکھ کر اس نے دودھ کا گلاس اٹھا کر دیوار پہ دے مارا اور ملازمہ اس کا یہ جنونی روپ دیکھ کر خوف زدہ ہوتے ہوئے باہر کو بھاگی تھی ۔۔۔ ہی سائرہ حیدر اس کے بیڈ روم میں داخل ہوئیں۔

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے؟" انہوں نے فرش پر بکھرے کانچ کے ٹکڑے اور دودھ دیکھ کر سختی سے پوچھا۔

"یہ تماشا نہیں اس ایڈیٹ کو وارننگ ہے کہ وہ میرے لیے وہی چیز لے کر آئے جو میں کہوں۔" وہ ۔۔۔ کچھ کم نہیں تھی۔

"اسے دودھ لانے کو میں نے کہا تھا۔ بخار میں ملک شیک پیو گی تو اور بیمار ہو جاؤ گی' ٹھنڈا ملک شیک ہڈیوں میں اتر جائے گا تمہارے۔"

"تو اتر جائے' کیا ہوگا مر جاؤں گی یا بیمار ہو جاؤں گی' ویسے بھی بیمار تو میں اب بھی ہوں۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا' لہجہ وہی ازلی ہٹ دھرمی سے بھرا ہوا تھا۔

"بیمار بھی تم اپنی حرکتوں کی وجہ سے ہوئی ہو۔ کس نے کہا تھا کہ یوں شدید سردی اور دھند میں بغیر کسی گرم کپڑے کے سڑکوں پہ گھومتی پھرو؟" وہ اسے سرزنش کر رہی تھیں۔

"ہاں! آج تک جو کچھ بھی ہوا ہے' میری حرکتوں کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔" وہ کاٹ دار لہجے میں بولی۔

"کاشلی۔۔۔! اپنی حد میں رہا کرو۔"

"میں اپنی حد میں ہی رہتی ہوں۔ آپ اپنی حد سے نکل کر میری حد میں آجاتی ہیں' میں اگر آپ کی حد میں مداخلت نہیں کرتی تو آپ بھی میری حد میں مداخلت مت کیا کریں۔" اس نے ماں کو بدتمیزی سے جواب دیا۔ سائرہ حیدر زچ ہو گئیں۔

"پلیز! اور کچھ مت کہیے گا' میں اگر پیوں گی تو ملک شیک ہی پیوں گی' ورنہ کچھ نہیں پیوں گی۔" وہ کہہ کر کمبل سے اٹھی جوگرز پہنے' پونی ٹیل باندھی اور دندناتی ہوئی باہر نکل گئی۔

"کاشلی رکو! بات سنو۔" انہوں نے پیچھے سے آواز دی لیکن وہ دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ اس کا رخ گیراج کی سمت تھا۔ اس نے اپنی سائیکل نکالی اور گیٹ عبور کر گئی۔

☼ ☼ ☼

آج بھی شہر میں معمول کے مطابق سردی عروج پر تھی اور دھند نے الگ آفت مچا رکھی تھی۔ اسلام آباد میں تو سردی اور دھند کی کچھ زیادہ ہی گمبھیر تہہ چھائی ہوئی تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی کپکپی سی چھا جاتی تھی لیکن کشمالہ موسم کی سنگینی سے لاپروا بے حسی کا مظاہرہ کرتی سائیکل لے کر روڈ پہ آ گئی۔ صبح کے سات بجے کا وقت تھا اور موسم کی وجہ سے دور دور تک زندگی میں کوئی ہلچل نہیں تھی' پھر بھی وہ سائیکلنگ

کرتی رہائشی علاقے سے کافی دور آگئی تھی۔ سرخ دھند کے تھپیڑے اس کے گلابی چہرے کو سفید برف کی سی رنگت عطا کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیاں سن ہو چکی تھیں مگر وہ بے حس بنی آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا رخ پارک کی سمت تھا۔ وہ اپنی سائیکل جاگنگ ٹریک پہ بھگانا چاہتی تھی۔ وہ سائیکل کو ٹریک پہ لے آئی۔ ٹریک پہ اس جیسے کئی اور سر پھرے بھی دھند اور سردی سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن فرق یہ تھا کہ انہوں نے باقاعدہ ٹریک سوٹ پہن رکھے تھے۔ کسی نے سر پہ اونی ٹوپی اور کسی نے مفلر لپیٹ رکھا تھا جبکہ اس نے کوئی گرم کپڑا نہیں لیا ہوا تھا، صرف سائرہ حیدر کی ضد میں۔

اپنی ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں وہ جاگنگ ٹریک پہ سائیکل بھگا رہی تھی جب اچانک ایک ٹریک سے دوسرے ٹریک پہ آتے ہوئے وہ کسی "جان دار چیز" کو ایک دھماکے دار ٹکر مار بیٹھی تھی اور دوسرے ہی پل اس زوردار تصادم پہ وہ دھڑام سے زمین پہ آ رہی تھی۔ اس کی چیخ بے ساختہ اور بہت بلند تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس جان دار چیز کو بھی زمین بوس ہونا پڑا تھا۔ کنسمالہ خود اپنی ہی سائیکل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس کا سر زمین سے اتنی زور سے ٹکرایا تھا کہ یک دم تیزی سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ آپ دیکھ کر نہیں چل [illegible]" ایزد نے زمین سے اٹھ کر جھنجھلاتے ہوئے نیچے سے سائیکل سوار کو دیکھا۔ لیکن اس کی صورت دیکھنے سے قبل ہی روش پہ بہتے خون کی روانی دیکھ کر اس کے سخت الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ اپنا غصہ بھول کر تیزی سے جھکا اور اس کے اوپر گری سائیکل کو اٹھا کر پرے پھینکا اور جلدی سے اسے کندھوں سے تھام کے سیدھا کیا اور پھر بری طرح چونک گیا تھا۔

"آپ؟" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کراہتی کنسمالہ کو حیرت سے دیکھا۔ وہ اپنی پیشانی پہ ہاتھ رکھے ہوئے تھی مگر خون کی دھار ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان سے راستہ بنا کر بہتی جا رہی تھی۔ اس کے رخسار، گردن اور قمیص خون سے بھیگ رہے تھے۔

"پاپا۔" دم توڑتے حواسوں میں اس نے لپے [illegible] پکارا تھا۔ ایزد نے اس کے لبوں سے نکلنے والے لفظ کو سرسری طور پر سنا مگر اپنی یادداشت میں سنجیدگی سے محفوظ کیا۔

"کنسمالہ! آنکھیں کھولو۔" اس نے اس کا رخسار تھپک کر متوجہ کرنا چاہا مگر اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ شدید بخار سے ہونے والی نقاہت اور شدید چوٹ سے ہونے والے درد نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ آس پاس کچھ لڑکیاں اور مرد بھی جمع ہو چکے تھے۔ ایزد اسے اٹھا کے پارک سے باہر اپنی گاڑی میں لے آیا۔ ایک آدمی نے اس کی سائیکل لا کر ایزد کے حوالے کی۔ وہ اسے لے کر سیدھا ہسپتال چلا آیا۔

☆ ☆ ☆

کنسمالہ کے گھر سے نکلنے کے بعد سائرہ حیدر بھی گھر سے چلی گئی تھیں۔ ان کی فلائٹ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ [illegible] ایزد نے مسز نندنی [illegible] کا فون نمبر لے رکھا تھا۔ [illegible] ملازمہ [illegible] بتا دیا [illegible] کنسمالہ کی ذمہ داری خود ایزد ہی اٹھا [illegible]۔ مسز نندنی اکیڈمی جانے کے لیے تیار تھیں۔ اس [illegible] فون پہ ہی ایزد کو اس کا خونی رشتہ کی تائید [illegible] اکیڈمی جا چکی تھیں اور وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس [illegible] کی راہداری میں ٹہلتا اس کے ہوش میں آنے کا [illegible] رہا تھا۔ تقریباً" دو گھنٹے بعد ڈاکٹر نے اسے اس [illegible] پہنچائی۔

"آپ کی پیشنٹ ہوش میں آ چکی ہیں۔" اطلاع ملتے ہی کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کے [illegible] میں لگی ڈرپ بھی ختم ہو چکی تھی۔

"آپ اپنی پیشنٹ کو گھر لے جا سکتے ہیں، اب بہتر ہیں۔" ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق نرس نے [illegible] بتایا تو وہ سر ہلا کر اس کی طرف آ گیا۔

"ہیلو! کیسی طبیعت ہے اب؟" وہ کافی [illegible] اور رسان سے پوچھ رہا تھا۔ کنسمالہ نے چونک [illegible] دیکھا۔

"آپ کون ہیں؟" چہرہ تو دیکھا دیکھا سا لگ رہا تھا لیکن فوری طور پہ کچھ یاد نہیں آیا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔

"میں وہی ہوں جسے آپ نے پہاڑ سمجھ کر ٹکر ماری تھی۔" ایزد کے انداز میں ہلکی سی شرارت تھی۔

"اوہ میری سائیکل آپ سے ٹکرائی تھی؟" وہ پریشان ہو گئی۔ "لیکن میں یہاں کیسے؟" اس نے ہسپتال کے در و دیوار دیکھے۔

"آپ کو وہی پہاڑ اٹھا کر لایا ہے۔" اس نے شانے اچکا کے کہا۔

"لیکن میں تو۔" اس نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر ایزد نے روک دیا۔

"اب سارے سوال یہاں ہی بیٹھے بیٹھے کر لیں گی یا گھر بھی چلیں گی؟"

اس نے اسے اٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ کوشش کے باوجود [illegible] نہ ہو سکی۔ ایک پاؤں میں یقیناً موچ آئی تھی۔

"آئیے میں آپ کو گاڑی تک ساتھ لے چلتا ہوں۔" اس نے کنسمالہ کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن وہ ٹھٹک گئی۔

"نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔" اس نے انکار کیا۔

"اوکے! ایز یو وش۔ جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے لاپروائی سے کہہ کر اسے راستہ دیا۔ کنسمالہ نے دو تین قدم اٹھائے لیکن لنگڑاتے ہوئے، جس کی وجہ سے درد کی اذیت سے اس کے ماتھے پہ سردی میں بھی پسینہ آ گیا تھا۔ وہ بمشکل کمرے کے دروازے تک پہنچی تھی۔

"رہنے دیجیے میم! آپ کو اٹھا کر یہاں تک لا سکتا ہوں تو آپ کو لے کر آپ کے گھر تک بھی جا سکتا ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کے کنسمالہ کا بازو پکڑ لیا۔ اس کا جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ ایزد بمشکل اسے سہارا دے کر اپنے ساتھ گاڑی تک لایا۔ وہ گاڑی کے قریب آ کر ٹھہر گئی جیسے گاڑی میں بیٹھنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

"یہ میری ہی گاڑی ہے، کرائے کی یا پھر چوری کی نہیں ہے۔ تھوڑی دیر پہلے آپ اسی گاڑی میں سفر بھی کر چکی ہیں۔ یقین نہیں آتا تو پچھلی سیٹ دیکھ لیں، آپ کا خون ابھی بھی تازہ ہے۔ مجھے اب گاڑی بھی واش کروانی پڑے گی۔" ایزد نے منہ بنا کر کہا۔

"ارے میم! خدا کے لیے اب بیٹھ جائیے۔ آپ کو میرے ساتھ ہی جانا ہے، آپ کو لینے کے لیے کوئی بھی نہیں آئے گا کیونکہ آپ کی مام دبئی کے لیے نکل چکی ہیں۔" ایزد کے جھنجھلائے ہوئے انداز پہ کنسمالہ نے چونک کر دیکھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ میری مام دبئی کے لیے جا چکی ہیں؟"

"بتاتا ہوں، آپ کو سب بتاتا ہوں، پہلے گاڑی میں تو بیٹھیے۔" اس نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا اور کنسمالہ چند سیکنڈ سوچنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ گھوم کر دوسری طرف سے آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے روڈ پہ ڈالتے ہوئے اطمینان سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں تو مس کنسمالہ حیدر! کیا کہہ رہی تھیں آپ؟" اس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ابھی بھی الجھی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو میرے نام کا کیسے پتا چلا؟" اس کا سوال بدل چکا تھا۔

"کیا بتاؤں؟ آپ کے نام کا کیسے پتا چلا؟ یا آپ کی مام کا کیسے پتا چلا؟" وہ دلچسپی سے پوچھ رہا تھا۔

"دونوں بتائیں۔"

"ہوں، اوکے! دونوں ہی بتا دیتا ہوں، دراصل اتفاق سے ہم دونوں ایک ہی ٹاؤن کے رہنے والے ہیں۔ پہلے کبھی اس لیے سامنا نہیں ہوا کہ میں کراچی اپنی ننھیال میں ہوتا تھا۔ حال ہی میں واپس اسلام آباد آیا ہوں۔ یہاں اسلام آباد میں میرے ڈیڈ اپنا بزنس چلا رہے ہیں اور مام اکیڈمی، وہی اکیڈمی جہاں آپ آج

کل زیر تعلیم ہیں' آئندہ آپ کے کیا ارادے ہیں؟ یہ میں نہیں بتا سکتا' بہرحال میں اتنا جانتا ہوں کہ آپ کچھ عرصہ میں اس اکیڈمی سے نکلنے والی ہیں' کیونکہ میری مام یہ ہی کہہ رہی تھیں' اب اور نہیں۔"

اس نے رسانیت سے اسے سب بتایا۔ وہ آنکھیں پھیلائے حیران پریشان سی ایزد کو دیکھ رہی تھی' تو گویا وہ مسز آفندی کا بیٹا تھا؟

"آپ کافی ذہین ہیں' یقیناً" آپ میرے اس لمبے چوڑے تعارف سے جان چکی ہوں گی کہ میں کون ہوں؟ اور یہ کہ مجھے آپ کے نام کا اور آپ کی مام کا کیسے پتا چلا؟ میں تو آپ کو اتنے دنوں سے جانتا ہوں بس' آپ ہی مجھے نہیں جانتیں۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور کشمالہ ہکابکا سی اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

"میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ فٹ بال بہت شوق سے کھیلتی ہیں' لیکن افسوس کہ اکیلی کھیلتی ہیں۔" وہ بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔ کاشلی کو مزید حیرانی ہوئی تھی۔

"ویسے آپ فٹ بال شوق سے کھیلیں' لیکن پلیز روڈ پہ مت کھیلا کریں۔" اس کی بات پہ کشمالہ کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔ اسے چند روز پہلے والا واقعہ یاد آگیا اور اس یاد میں ایزد کی صورت واضح ہوگئی تھی' جس کی وجہ سے یہ الجھن بھی مٹ گئی کہ اسے دیکھا ہے تو کہاں دیکھا ہے؟

ایزد نے ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر دیکھا تو وہ آنکھیں پھیلائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی اس قدر حیرانی پہ بے ساختہ مسکرادیا۔

"حیران کرنے والا شخص جب خود حیران ہوتا ہے تو بہت دلچسپ لگتا ہے' جیسے آپ۔" اس نے شرارت سے متبسم لہجے میں کہا تو کشمالہ چونک کر نظریں پھیرنے پہ مجبور ہوگئی تھی۔

"کیوں مس کشمالہ! میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟" وہ اس کی چپ محسوس کرکے دوبارہ اس سے استفسار کررہا تھا۔

"ارے ہیں! کچھ تو کہیں' میں اکیلا ہی بولے جارہا ہوں؟" ایزد نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔ اس نے کھڑکی سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر ایزد کی سمت دیکھا۔

"آپ کو میرے بارے میں میری مام سے پتا چلا ہے یا اپنی مام سے؟" اسے رہ رہ کر نہ جانے کیا کیا خیال آرہے تھے' ایزد اس کی سوچ پڑھ چکا تھا۔

"مجھے آپ کے بارے میں نہ اپنی مام سے پتا چلا ہے نہ آپ کی مام سے' بلکہ مجھے تو آپ کے بارے میں آپ کی ٹیچرز اور کلاس فیلوز سے پتا چلا ہے۔ اس روز جب آپ نے رانیہ نام کی لڑکی کو اپنی فٹ بال سے مار' مار کر زخمی کردیا تھا' اتفاقاً" اس روز میں بھی وہیں تھا۔"

ایزد نے جان بوجھ کر رانیہ کا حوالہ دیا' تاکہ اسے اپنے کیے کا احساس تو دلا سکے اور سچ مچ کشمالہ کی نظریں اس کی بات پہ جھک گئی تھیں' یعنی اسے واقعی شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

"ویسے مجھے آپ کی بہادری پہ بڑی حیرانی ہوئی تھی' اتنے سارے لوگوں میں آپ نے اس لڑکی کو پیٹ کے رکھ دیا' ویل ڈن۔"

پتا نہیں وہ طنز کررہا تھا یا مذاق اڑا رہا تھا۔ کشمالہ کچھ بھی سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نے کشمالہ کے گھر کے گیٹ کے سامنے ہارن دیا تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا' وہ گاڑی اندر لے گیا۔ روش پہ گاڑی رکی تو اس نے فوراً" اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول لیا۔

"آرام سے' آرام سے' میں آپ کو کھا تو نہیں جاؤں گا' بھاگنے کی اتنی جلدی کیوں ہے؟"

وہ گاڑی سے اتر کر تیزی سے اس کی سائیڈ پہ آیا اور اسے سہارا دے کر گاڑی سے اترنے میں مدد دی۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی' لیکن اسے یہ بھی پتا تھا کہ اتنے شدید درد کی وجہ سے وہ خود چل نہیں پائے گی' اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی چپ ہوگئی تھی۔ داخلی دروازے کے سامنے والا حصہ اور کوریڈور عبور کرکے وہ ڈرائنگ روم تک پہنچے۔ ایزد اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے کی وجہ سے خود بھی تھک گیا تھا اسی لیے اسے ڈرائنگ روم کے صوفے پہ بٹھا کر مکمل سیدھا ہوا۔

"اف لگتا ہے گردن اکڑ گئی ہے۔" اس نے اپنی گردن سہلائی۔

"ارے چھوٹی بی بی کو کیا ہوا؟" ان کی ملازمہ اندر آئی تو کشمالہ کے ماتھے پہ سفید پٹی بندھی دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

"بس! آپ کی چھوٹی بی بی کو شوق ہوا تھا اور دیوار سے ٹکر دے ماری اور دیوار سے ٹکر مارنے پہ یہ تحفہ تو ملے گا نا!" ایزد مسلسل غیر سنجیدگی سے بات کررہا تھا اور کشمالہ مسلسل چپ تھی' وہ اس بندے کو کہتی بھی تو کیا؟

"مس کشمالہ حیدر! میں جانتا ہوں آپ اس وقت دل ہی دل میں مجھے گالیاں دے رہی ہیں اور یہ ہی سوچ رہی ہیں کہ یہ عذاب کب ٹلے؟ لہٰذا آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں جارہا ہوں' مسلسل دو گھنٹوں سے آپ کی تیمارداری کررہا ہوں' مگر پھر بھی آپ کی بے رونق اور سڑیل شکل پہ شکریہ اور مہربانی کا کوئی سایہ تک بھی نہیں ہے' کوئی اور لڑکی ہوتی تو بچھ بچھ جاتی' خیر کوئی بات نہیں' میں نے سوچا تھا آپ کو گھر ڈراپ کرکے فلمی ہیروز کی طرح فرینڈشپ آفر کروں گا' لیکن آپ کی شکل دیکھ کر ہی پتا چل رہا ہے کہ فرینڈشپ کے لیے نو ویکنسی کا بورڈ آویزاں کررکھا ہے آپ نے۔ اس لیے میں اپنی فرینڈشپ کی آفر اپنے ساتھ ہی واپس لے کر جارہا ہوں' جس روز یہ نو ویکنسی کا بورڈ ہٹے گا' اس روز آفر کروں گا' اس لیے فی الحال گڈبائے۔"

وہ روانی سے کہہ کر ماتھے تک ہاتھ لے جاکر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا اور کشمالہ اس کے نان اسٹاپ بولنے اور باتوں پہ بے ساختہ امڈنے والی مسکراہٹ نہیں روک سکی' وہ واقعی زندہ دل انسان تھا' وہ اپنی تکلیف اور درد بھول کر اس کی باتوں پہ مسکرا رہی تھی اور یہ مسکراہٹ شاید اس سال کی پہلی مسکراہٹ تھی۔ وہ سال میں دو' تین بار ہی مسکراتی تھی' کیونکہ اسے مسکرانے کے لیے کوئی بات کوئی وجہ کوئی سبب جو نہیں ملتا تھا۔ کوئی ہوتا تو اسے مسکرانے پہ اکساتا بھی۔ بس ایک سائرہ حیدر ہی تھیں اور وہ بھی اکثر اسے اس کے حال پہ چھوڑ کر چلی جاتی تھیں۔

"ماشاء اللہ آپ مسکراتی بھی ہیں؟" ایزد ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے اطمینان سے کھڑا اسے ہی دیکھ رہا تھا' کشمالہ سٹپٹا گئی۔

"ڈونٹ وری! مسکراتی رہیے' میں تو بس یہ کہنے آیا تھا کہ آپ کا نام بہت خوب صورت' بہت پیارا ہے' کشمالہ۔ یہ غالباً" فارسی کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے پھولوں کی لڑی یعنی پھولوں کا ہار' اور آپ کا نک نیم بھی بہت اچھا ہے کاشلی مطلب نفع بخش۔"

وہ کتنے سکون سے کھڑا اس کے نام کی تعریف کیے جارہا تھا اور کشمالہ عرف کاشلی حیرانی سے دیکھ رہی تھی' اپنے نام کا مطلب وہ خود بھی نہیں جانتی تھی' اس نے تو اس کی عرفیت تک کے معنی بتادیے۔

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے نام کی طرح آپ خود بھی بہت پیاری ہیں' بس اپنے ماتھے پہ بڑی غصے اور ناگواری کی شکنیں ہٹادیں تو اور بھی اچھی لگیں گی۔ اینی وے! اب پکا' پکا جارہا ہوں' ہوسکا تو کل پھر آؤں گا' آپ کی عیادت کے لیے' لیکن وعدہ نہیں کرتا۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ کر اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے پلٹ کر چلا گیا تھا اور کشمالہ اسے ہی سوچتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن صبح ہی صبح نہ چاہتے ہوئے بھی لاشعوری طور پہ اسے ایزد کا انتظار تھا' مین ڈور کی بیل بجی تو وہ اپنے بیڈ روم میں تھی' پاؤں کی موچ کی وجہ سے خود بیڈ روم سے نکل کر باہر بھی نہیں آسکتی تھی۔

"فریدہ۔ فریدہ!" اس نے اونچی آواز میں ملازمہ کو پکارا' لیکن وہ اوپر اپنے کمرے میں تھی اور فریدہ نیچے کام کررہی تھی' بند کمرے سے اس کی آواز نیچے کیسے

پہنچتی۔ وہ کمبل ہٹا کر خود ہی اٹھی اور ایک پاؤں کا سہارا لے کر بمشکل درد ضبط کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"فریدہ!" اس نے ریلنگ کے قریب آکر دوبارہ آواز دی۔

"جی چھوٹی بی بی! آپ نے بلایا ہے؟" وہ بھاگی آئی تھی۔ "باہر مین ڈور کی بیل بج رہی تھی، کون تھا؟" اس نے اشارہ کرکے پوچھا۔

"چھوٹی بی بی صاحبہ، وہ چوکیدار اخبار اور میگزین دے کر گیا ہے، اسی نے بیل بجائی تھی۔" فریدہ کے جواب پہ اس کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

"ہوں! ٹھیک ہے، جاؤ تم اپنا کام کرو۔" اس نے آہستگی سے سر ہلا کر کہا اور پلٹ کر اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ باتھ روم میں جا کر برش کیا اور پیشانی سے نیچے کا چہرہ دھو کر باہر نکل آئی، کیونکہ پیشانی پہ پٹی بندھی ہوئی تھی، اس لیے پیشانی نہیں بھگو سکتی تھی۔ پھر کپڑے تبدیل کیے اور بڑی مشکل سے فریدہ کے ساتھ نیچے اتر آئی۔ فریدہ اس کا ناشتہ لے چکی تھی۔

"رات کو میڈم کا فون آیا تھا۔"

"تو...؟"

"آپ کا پوچھ رہی تھیں۔"

"پھر...؟"

"میں نے کہا کہ آپ کو بہت گہری چوٹ لگی ہے، بہت خون بہا ہے، ڈاکٹر نے ٹانکے بھی لگائے ہیں۔" ملازمہ نے تفصیل بتائی۔

"پھر...؟ وہ بہت پریشان ہوئی تھیں۔"

"پھر...؟" اس کے پھر نے فریدہ کو خاموش کروا دیا۔

"بتاؤ نا پھر کیا کہا انہوں نے؟" کاشلی جان بوجھ کر پوچھ رہی تھی۔

"پھر کیا کہنا تھا انہوں نے؟ فون بند کر دیا، کہہ رہی تھیں چھوٹی بی بی کا خیال رکھنا صبح فون کریں گی۔"

"ہونہہ! میں بھی یہ ہی سننا چاہتی تھی، وہ اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں، تم اگر ان سے یہ کہتیں کہ کنساملہ کا سر کٹ گیا ہے، تب بھی وہ کہتیں اس کے سر کا خیال رکھنا میں دوبارہ فون کروں گی۔"

اس نے تلخی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا اور ناشتہ کرنے لگی۔ اتنے میں فون بجنے لگا، فریدہ تیزی سے لاؤنج میں رکھے سیٹ کے پاس گئی۔

"ہیلو...!"

"جی وہ گھر پہ نہیں ہیں۔" کنساملہ، فریدہ کی آواز با آسانی سن رہی تھی۔

"وہ میڈم کے ساتھ دبئی گئی ہیں۔" اب کی بار کنساملہ کے کان کھڑے ہوگئے، وہ تیزی سے کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی اور تکلیف کے باوجود لاؤنج میں پہنچ گئی، ناشتہ یوں ہی ادھورا پڑا تھا۔

"فون بند مت کرنا۔" کاشلی نے تیزی سے آواز دی، لیکن فریدہ نے فون رکھ دیا تھا۔

"وہ جی! رانگ کال تھی۔" اس نے بہانا گھڑا۔

چٹاخ... کاشلی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔

"بکواس! یہ رانگ کال نہیں، ہے... کا فون تھا اور تم ان سے جھوٹ بول رہی تھیں... میں اندھی نہیں ہوں۔" وہ سانپ کی طرح پھنکار رہی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا وہ فریدہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

"چھوٹی بی بی! وہ میڈم نے منع..."

"دفع ہوجاؤ یہاں سے، ورنہ میں تمہارا گلا دبا دوں گی۔"

وہ فریدہ کو تھپڑ مار دینے کے بعد رو رہی تھی اور فریدہ کو پتا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے، کوئی چھڑانے والا بھی نہیں، اسی لیے فوراً وہاں سے ہٹ گئی، لیکن کنساملہ کا افسوس پھر بھی کم نہیں ہوا، وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ کر رونے لگی۔

کتنے دن ہوگئے تھے اس نے شاہ نواز حیدر کی آواز نہیں سنی تھی، نہ ہی وہ اسلام آباد آئے تھے، وہ اندر ہی اندر انہیں کتنا یاد کرتی تھی، یہ اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا، آج ان کے فون کا پتا چلا تو وہ ایک دم خوش ہو اٹھی تھی، لیکن اس ایک پل کی خوشی کو فریدہ نے ریسیور کریڈل پہ رکھ کے ختم کر دیا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے کیا کر ڈالے۔

"گڈ مارننگ...!" اچانک لاؤنج کے دروازے سے ایزد آفندی کی آواز ابھری تھی۔ کنساملہ نے چونک کر دیکھا تھا، البتہ یہ اور بات تھی کہ ایزد بھی اسے دیکھ کر چونک گیا تھا، کیونکہ وہ رو رہی تھی۔ اس کے گلابی رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے اور آنکھوں کی تیکھی کاٹ بے بسی میں ڈھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایزد کو یہ کنساملہ پہلے چند دنوں والی کنساملہ سے بہت مختلف لگی۔

"کنساملہ حیدر کی آنکھوں میں آنسو؟" وہ قریب آتے ہوئے حیرت سے پوچھ رہا تھا۔ "آنسوؤں کے نصیب اتنے اچھے کب سے ہوگئے؟"

"اوئے ہوئے! سیلاب لانے کا ارادہ ہے کیا؟ ملک کے حالات تو پہلے ہی اتنے خراب ہیں کہ سیلاب برداشت نہیں ہوگا غریبوں سے۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

"ارے... اتنی ندامت... ہر... سوتا... امید تو نہیں تھی کہ تم... کرتی..." وہ اسے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس کے آنسوؤں کی روانی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"دیکھیے محترمہ! میں آفس جا رہا تھا، لیکن پھر بھی اپنی مصروفیت سے آپ کے لیے ٹائم نکال کر فلاور شاپ پہ گیا، آپ کے لیے تازہ پھولوں کا بکے بنوا کے لایا ہوں، صرف اس لیے کہ آپ بھی ان پھولوں کی طرح فریش اور ہشاش بشاش ہو جائیں، لیکن آپ ہیں کہ مجھے لفٹ ہی نہیں کروا رہیں، لہٰذا بہتر یہ ہی ہے کہ آپ آرام سے بیٹھ کر اپنا شوق پورا کریں اور میں چلا جاؤں۔" وہ بکے اس کی گود میں ڈال کے کھڑا ہوگیا۔

"رکیں پلیز!" کنساملہ بے ساختہ بولی۔

"کس لیے رکوں؟ آپ کو روتا دیکھنے کے لیے؟" وہ استہزائیہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ایم سوری۔" اس نے آہستگی سے سوری کہا تو ایزد نے سر جھٹک دیا۔

"دیٹس گڈ! یہ لیں۔" اس نے ٹشو باکس سے دو تین ٹشو کھینچ کے اس کی سمت بڑھا دیے، تاکہ وہ اپنا چہرہ پونچھ سکے۔

"ویسے میں نے ایک بات نوٹ کی ہے ماڈرن لڑکیوں کے پاس دوپٹہ نہیں ہوتا، اس لیے انہیں ٹشو ضائع کرنا پڑتے ہیں، جبکہ دوسری لڑکیوں کو بڑی سہولت رہتی ہے وہ دوپٹے کی صورت میں اتنا بڑا ٹشو ساتھ لیے پھرتی ہیں، وقت پڑنے پہ آنسو بھی پونچھ لیتی ہیں اور منہ بھی صاف کر لیتی ہیں، ان کا کام بھی ہو جاتا ہے اور ٹشو بھی ضائع نہیں ہوتا۔"

اس کی بات پہ کنساملہ روتے روتے ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اتنی بے ساختہ تھی کہ ایزد ٹھہر کے دیکھنے پہ مجبور ہوگیا تھا اور کنساملہ اسے اپنی سمت دیکھتے پا کر قدرے چپ ہوگئی تھی۔

"ویسے میں نے ایک اور بات نوٹ کی ہے۔" ایزد نے تمہید باندھی جس پہ کنساملہ نے بے ساختہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہ ہی کہ آپ روتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہیں، لیکن ہنستے ہوئے تو اور بھی اچھی لگتی ہیں، یعنی آپ کا ہنسنا بھی کمال ہے اور رونا بھی۔" وہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھ کر کہہ رہا تھا، اس نے سر جھکا لیا۔

"اچھا وے! آپ یہ بتائیں پاؤں کی موچ ٹھیک ہوئی یا نہیں؟" وہ سر جھٹک کر اس کے قریب آگیا تھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"میں ٹھیک کر دوں؟" وہ اجازت لے رہا تھا۔

"کیسے...؟"

"وہ میرا کام ہے، آپ یہ بتائیں کہ موچ ٹھیک کروانی ہے یا نہیں؟" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اوکے! اب نہیں ہوگا۔" وہ اس کے سامنے نیچے قالین پہ پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" وہ جھجک گئی۔

"آپ کے پاؤں کی موچ ٹھیک کرنے لگا ہوں۔" اس نے کاشلی کے سوجے ہوئے پاؤں کو ہاتھ سے دباتے ہوئے چیک کیا اور کاشلی درد سے کراہ اٹھی۔

"ڈونٹ وری! تھوڑا سا درد تو سہنا ہی پڑے گا۔" وہ

اس کے پاؤں کو ٹخنے سے سہلا رہا تھا۔ کشمالہ بمشکل ضبط کیے درد برداشت کرتی رہی اور یوں ہی سہلاتے سہلاتے ایزد نے اس کا پاؤں اک جھٹکے سے ہلا کر کھینچا تھا اور کشملہ پوری قوت سے چیخ اٹھی، فریدہ بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آئی۔

"ٹھیک ہو گیا ہے آپ کا پاؤں، لیکن ابھی تھوڑی دیر اور چلنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ کسی گرم چیز سے ٹکور کریں، سوجن اتر جائے گی۔" وہ اٹھ کر صوفے پہ جا بیٹھا اور کشمالہ نے پاؤں میں درد کی کمی محسوس کی تھی۔

"اپنی چھوٹی بی بی کو گرم دودھ کا گلاس لا کر دو۔" اس نے ملازمہ کو اشارہ کیا۔

"گرم دودھ...؟" فریدہ نے دہرا کے پوچھا۔

"جی گرم دودھ، مطلب نیم گرم، ہلکا گرم، آئی سمجھ؟" اس نے اچھی طرح سمجھایا۔

"جی اچھا۔" وہ کہہ کر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد دودھ کا گلاس لے کر آ گئی۔

"لیجیے مس کشمالہ حیدر! دودھ پی لیجیے۔" اس نے اشارہ کیا اور تعجب کی بات تھی اس نے دودھ پی لیا۔ فریدہ حیران پریشان سی ایزد کی شکل دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی۔ کشمالہ نے بچپن سے لے کر آج تک دودھ نہیں پیا تھا، چاہے وہ لوگ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لیتے، اور آج؟ آج تو معجزہ ہو گیا تھا اور اس معجزے کا سبب وہ شخص تھا۔

فریدہ نے ایزد کو کئی بار پلٹ کر دیکھا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ دیر اور اس کے پاس بیٹھتا اس کے موبائل پہ رنگ ہونے لگی، وہ موبائل اسکرین پہ نمبر دیکھتے ہوئے فوراً کھڑا ہو گیا۔

"اوکے! فی الحال چلتا ہوں، میرے ڈیڈ آفس میں میرا انتظار کر رہے ہیں، آپ سے پھر ملاقات ہو گی، جلدی سے ٹھیک ہو جائیں... اوکے گڈ بائے۔"

وہ الوداعی کلمات ادا کرتا کال اٹینڈ کرتے باہر نکل گیا اور کشمالہ اپنے پاؤں کو ہلا جلا کر دیکھتی حیران ہو رہی تھی کیونکہ درد بہت حد تک کم ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اف خدایا! اس لڑکی نے ناک میں دم کر رکھا ہے، میں کیا کروں اب...؟" مسز آفندی کی شکایت پہ سائرہ حیدر نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ کل ہی دبئی سے واپس آئی تھیں اور آج مسز آفندی نے انہیں اپنے گھر بلا لیا تھا۔

"مجھے رانیہ کے پیرنٹس نے تنگ کر رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کشمالہ کو اسکول سے نکالیں ورنہ رانیہ اسکول چھوڑ دے گی۔ وہ اپنی بچی کو ایسی جگہ نہیں چھوڑ سکتے جہاں کشمالہ جیسی لڑکی ہو، جنونی اور ایب نارمل۔"

مسز آفندی نے سائرہ حیدر کو صاف صاف بتایا اور وہ جنونی اور ایب نارمل کے الفاظ سن کے بدک گئی تھیں۔

"فاخرہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" انہوں نے مسز آفندی کو بے یقینی سے دیکھا، انہیں شاک لگا تھا اس بات پہ...

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں تاکہ تمہیں پتا ہو کہ گھر سے باہر لوگ اس کے لیے کیا رائے رکھتے ہیں اور تمہیں کیا کرنا چاہیے؟" مسز آفندی نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھنے کے بجائے انہیں دوسروں کے خیالات سے آگاہ کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔

"مام! لوگ اکثر دوسروں کے لیے غلط رائے رکھتے ہیں۔" سیڑھیاں اترتا ایزد سنجیدگی سے بولا اور پھر ان ہی کے پاس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"السلام علیکم آنٹی!" اس نے سائرہ حیدر کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو بیٹا؟" سائرہ حیدر نے ایزد کو سرتاپا دیکھا، کافی خوب صورت ہینڈسم نوجوان تھا، پہلے کہیں بچپن میں دیکھا تھا شاید اور اب تو پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"الحمدللہ! بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، آپ سنائیں کیسی ہیں؟"

"ہونہہ! انہوں نے کیا ہونا ہے؟ بس ایک ہی طوق بنے گلے میں اس نے زندگی عذاب بنا رکھی ہے۔" وہ بلبلا کر بولیں۔

"وہ طوق نہیں ہے آنٹی! وہ آپ کی بیٹی ہے۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"بیٹی ایسی حرکتیں کرے گی تو طوق ہی کہوں گی نا؟"

"آپ اسے طوق کہیں گی تو وہ ایسی ہی حرکتیں کرے گی نا؟" اس نے برجستہ جواب دیا۔ سائرہ حیدر ٹھٹک گئی تھیں۔

"وہ جنونی یا ایب نارمل نہیں ہے، اسے آپ نے خود ایسا بنا دیا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔"

"تم اسے جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح سے۔" اس نے کندھے اچکائے اور ایزد نے سب کچھ بتا دیا کہ اس کا کشمالہ سے کیسے ٹکراؤ ہوا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے تم میری ہیلپ کر سکتے ہو۔" سائرہ حیدر نے نہ جانے کیا سوچ کر کہا تھا۔

"کیسی ہیلپ؟" ایزد نے چونک کے دیکھا۔

وہ کچھ اور قصہ بتا رہی تھیں۔ مسز آفندی مطمئن نہیں تھیں، لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکیں، سائرہ حیدر بس اس کے کان میں کچھ بتا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے لان میں فٹ بال کھیل رہی تھی، جب ملازمہ اس کے پاس آئی۔

"ایزد صاحب کا فون ہے، آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ملازمہ کہہ کے پلٹ گئی اور کشمالہ بال اچھالتی ہوئی اندر آ گئی۔

"ہیلو!" وہ ہانپ رہی تھی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

"کیا کر رہی ہو؟"

"کھیل رہی ہوں۔"

"کس کے ساتھ؟"

"اکیلی۔"

"اکیلی کیوں؟"

"کوئی اور ہے ہی نہیں جس کے ساتھ کھیلوں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"میں ہوں نا، میرے ساتھ کھیلو۔"

"میں ہارنا نہیں چاہتی۔"

"تو ہرا دو، میں ہارنے کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ مجھ سے کیوں ہارنا چاہتے ہیں؟"

"تمہیں جیت کی خوشی بخشنا چاہتا ہوں۔" اس کی بھاری گمبھیر آواز نے نرم و نازک دل پہ بڑا اثر کیا تھا۔

"میری جیت کی خوشی کے لیے آپ ہار جائیں گے؟" وہ دہرا کے پوچھ رہی تھی۔

"آف کورس۔"

"تو پھر میں ایسا کھیل ہی نہیں کھیلوں گی جس میں آپ کو ہارنا پڑے۔" وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"میرے ہارنے سے مت ڈرو، مجھے ہار کر بھی خوشی ہو گی۔"

"لیکن مجھے آپ کو ہرا کر خوشی نہیں ہو گی نا۔" اس نے منہ بنایا۔

"تو پھر؟"

"تو پھر ایسا کریں گے ہم کھیل ادھورا چھوڑ دیں گے، نہ آپ ہاریں، نہ میں ہاروں۔" اس نے آئیڈیا دیا۔

"اوکے! یہ بھی ٹھیک ہے۔" ایزد مان گیا تھا۔

"ایی دے! آپ یہ بتائیں آپ نے فون کیوں کیا تھا؟" اس نے کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔

"میرے ساتھ چلو گی؟"

"کہاں؟"

"مارکیٹ۔"

"مارکیٹ کیوں؟"

"بس ایسے کچھ شاپنگ کرنے کا موڈ ہو رہا ہے۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لیتا ہوں، آئس کریم کھلا

دوں گا۔"

"اگر میں نہ جاؤں تو؟" کشمالہ نے بات ادھوری چھوڑی۔

"تو میں سمجھوں گا تم مجھے ابھی بھی اپنا دوست نہیں سمجھتیں۔"

"تو اس میں غلط کیا ہے بھلا؟" وہ سکون سے بولی۔

"کیا...؟" ایزد کا "کیا" اتنا چھت پھاڑ قسم کا تھا کہ کشمالہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اوکے! اوکے میں چلتی ہوں۔" وہ مان گئی اور ریسیور کریڈل پہ ڈال رکھ دیا۔

ایزد کے آنے تک وہ چینج کر چکی تھی، اس نے گیٹ پہ ہارن دیا تو اڑی چلی آئی، وہ پہلے سے فرنٹ ڈور کھولے ہوئے تھا، اس کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔

ان کی دوستی کو تین ماہ ہو گئے تھے اور ان تین ماہ میں ایزد بمشکل اس کو بے تکلفی کی اس راہ پہ لا پایا تھا کہ وہ اب اس کے ساتھ کہیں آنے جانے بھی لگی تھی۔ کبھی کبھار کوئی بات بھی ڈسکس کر لیتی تھی۔ [illegible] گپ شپ بھی ہو جاتی تھی اور ان باتوں کو لے کر اس میں بہت زیادہ [illegible] تھوڑی بہت تبدیلی ضرور آئی تھی [illegible]

وہ موم [illegible] اور ایزد [illegible] اور وہ زیبا سب [illegible] جا رہی تھی، آخر تھی جو موم کی گڑیا، بس پگھلانے کی دیر تھی اور وہ آہستہ آہستہ دن بہ دن پگھل رہا تھا اور دن بہ دن اس کی شکل واضح کر رہا تھا۔

ٹھیک چھ ماہ بعد ایزد کو مثبت نتائج ملے تھے، اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا تھا اور اس نے میٹرک کے بورڈ کے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ مسز آفندی اور سائرہ حیدر خوش بھی تھیں اور بے یقین بھی، لیکن ایزد مطمئن تھا، اس نے جو سوچا تھا وہ پا لیا تھا، یہ اس کی محنت تھی۔

☆ ☆ ☆

"ایزد... ایزد... کہاں ہو؟" وہ سے آوازیں دیتی ہوئی اندر آئی تھی۔

"خیریت بیٹا! اتنی جلدی میں کیوں ہو؟" مسز آفندی ڈائننگ روم سے نکل کر سامنے آگئیں۔

"وہ میں ایزد کی طرف آئی تھی، کہاں ہے وہ؟" اس نے ذرا جھجک کے کہا۔ ان کے گھر دندناتے ہوئے داخل ہونا خود ہی اچھا نہیں لگا تھا اسے۔

"اوپر ہے، جاؤ دیکھ لو جا کر۔" انہوں نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ پہلے بھی ان کے گھر آتی رہتی تھی، اسی لیے زیادہ اجنبیت کا احساس نہیں تھا۔ گھر پہ کوئی بھی ہوتا وہ نوٹس نہیں لیتی تھی، لیکن مسز آفندی کو دیکھ کر ہر بار ہی جھجک جاتی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ ان سے ہمیشہ جھجک محسوس ہوتی تھی۔

"جی...!" وہ آہستگی سے جی کہہ کے اوپر آگئی۔ ایزد کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا، دروازہ دھکیل کر اندر جھانکی، اس کے بیڈ روم کا پنکھا فل اسپیڈ سے چل رہا تھا اور کمرے میں [illegible] شرٹ کے اوندھا لیٹا ہوا تھا، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے بہت زیادہ گرمی لگ رہی تھی، اس لیے وہ سب [illegible] اتار کے لیٹ گیا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی تو [illegible] کاغذ اس کے پاؤں کے نیچے آگئے۔ اس نے [illegible] اٹھا لیے اور [illegible] کمرے میں بکھرے سارے [illegible] سمیٹنے لگی۔ ایک ایک کاغذ کو ترتیب سے اٹھایا اور فائل میں جمع کرنے لگی، پورے کمرے میں بکھرے کاغذ سمیٹتے ہوئے جب وہ ایزد کے قریب آئی تو نہ جانے کیا ہوا کہ اسے لگا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ہے۔

وہ ٹھٹک گئی تھی، اس نے ڈرتے ڈرتے ایزد کو دیکھا، وہ اوندھے منہ کروٹ پھیل کے لیٹا ہوا تھا۔ بالوں کا اسٹائل پنکھے کی تیز ہوا سے بے ترتیب ہو رہا تھا اور گھنی پلکیں گہری نیند کا پہرہ دے رہی تھیں، اس نے آج تک ایزد کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا، ہمیشہ دوست سمجھ کر اسے دوست کے دائرے میں ہی رکھا۔

آج انہوں کا زاویہ بدلا تو دوستی کا مخصوص حصار ٹوٹ گیا اور اس کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہونے لگیں اور ان کی دھک دھک اتنی تیز اور زوردار تھی کہ اسے لگا ایزد اس آواز پہ نیند سے جاگ جائے گا۔

وہ ہاتھوں میں پھڑپھڑاتے ہوئے کاغذ تھامے یک ٹک اسے ہی دیکھے جا رہی تھی کہ ایک کاغذ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایزد کے چہرے پہ جا گرا۔ کشمالہ نے سٹپٹا کر وہ کاغذ اس کے چہرے سے اچک لیا، ایزد کاغذ کے لمس سے تھوڑا سا کسمسا کر سیدھا ہوا اور دوبارہ سو گیا، اب کشمالہ اسے با آسانی دیکھ سکتی تھی، لیکن اس کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اسے یوں دیدہ دلیری سے بیٹھ کر دیکھتی رہتی، اسے نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اس کے تمام پیپر ٹیبل پہ پیپر ویٹ کے نیچے رکھ کے اٹھی اور دوسرے ہی پل اس کے بیڈ روم سے نکل گئی، وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتی باہر کی طرف لپکی۔

"کاشلی، کشمالہ...!" مسز آفندی نے اسے پکارا مگر [illegible] ایک [illegible] اور اپنی سائیکل لے کر گیٹ کراس کر گئی۔

☆ ☆ ☆

"اتنی گہری نیند سو رہے تھے تم؟" عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا جب وہ نیند سے بیدار ہوا اور شاور لے کر نیچے آیا تھا۔

"کیوں؟ خیریت؟" وہ فریج سے جوس نکالتے ہوئے بولا۔

"کاشلی آئی تھی، اوپر گئی تھی۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا، تھوڑی دیر بعد وہ تمہارے کمرے سے نکلی تو بڑی عجلت میں تھی، تیز تیز سیڑھیاں اتر کر چلی گئی۔" وہ حیرانی سے بتا رہی تھیں۔

"اچھا...!" ایزد کو بھی سن کر حیرانی ہوئی تھی۔

"کہیں ثانیہ کا فون وغیرہ تو نہیں سن لیا اس نے۔" ایزد نے اپنا موبائل جیب سے نکال کر دیکھا جو سوتے ہوئے وہ قالین پہ ہی رکھ کے سو گیا تھا۔ اس نے اپنا موبائل چیک کیا، لیکن ثانیہ کا نمبر کہیں بھی نظر نہیں آیا، چلو اس طرف سے تو اطمینان ہو ہی گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" مسز آفندی اس سے استفسار کر رہی تھیں۔

"ہوا تو کچھ بھی نہیں، پھر بھی میں دیکھتا ہوں کہ اسے کیا ہوا ہے؟"

وہ جوس کا گلاس خالی کر کے کچن سے باہر نکل آیا۔ مسز آفندی چپ ہو گئیں۔ وہ مسلسل کشمالہ کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ ایزد نے اپنی گاڑی نکالی اور اس کے گھر کا رخ کیا۔ اس ٹاؤن کے ایک بلاک میں ایزد کا گھر تھا اور دوسرے بلاک میں کاشلی کا گھر تھا۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ اس کے گھر میں تھا۔

"کاشلی! کاشلی! زندہ ہو۔" وہ اسے آوازیں دیتے ہوئے اوپر اس کے بیڈ روم میں چلا آیا تھا۔ وہ بیڈ پہ لیٹی دونوں بازو اپنے چہرے پہ رکھے ہوئے تھی، یوں جیسے چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کس سے چھپ رہی ہو؟" ایزد نے آگے بڑھ کے اس کے چہرے سے بازو ہٹائے، وہ اس کے لمس سے بدک کے پیچھے ہٹی تھی۔

"ارے! کیا ہوا؟" میں نے اتنا سخت تو نہیں پکڑا۔" ایزد اس کے یوں بدکنے پہ ٹھٹکا تھا۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" وہ اٹھ بیٹھی تھی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"آپ مجھے نیچے بلا لیتے۔"

"اوہ! تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ مجھے تمہارے بیڈ روم میں نہیں آنا چاہیے؟" ایزد ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔

"آف کورس۔" اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں، لیکن بات وہ صاف صاف کر رہی تھی۔

"وجہ...؟"

"بس ایسے ہی۔" اس نے نظر چراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم میرے کمرے میں کیوں گئی تھیں؟"

"آئندہ نہیں جاؤں گی۔"

"اوکے! میں بھی نہیں آؤں گا۔"

وہ کہہ کے واپس مڑا اور دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ کشمالہ ٹھٹک گئی، وہ خفا ہو کے جا رہا تھا۔

"ایزد...!" وہ بے ساختہ ننگے پاؤں اس کے پیچھے باہر بھاگی۔

"ایزد! پلیز رکیے۔" اس نے سیڑھیاں اترتے ایزد کو دوبارہ آواز دے کر روکا لیکن وہ سنی ان سنی کرتا سیڑھیاں اترتا جا رہا تھا۔

"ایزد!" وہ یک دم بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے سامنے کھڑی ہو گئی جیسے راستہ روک لیا ہو۔

"اب کیا ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"ڈرائنگ روم میں۔"

"کیا، ڈرائنگ روم میں؟"

"ہاں تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ میں تمہیں نیچے بلا لیتا؟ یعنی مجھے ڈرائنگ روم تک ہی رہنا چاہیے اس لیے میں ڈرائنگ روم میں ہی جا رہا ہوں، تم بھی وہیں آجاؤ۔"

وہ کہہ کے سیڑھیاں اتر گیا۔ کشمالہ اتنے کہے پہ شرمندہ نہیں تھی اسی لیے چپ چاپ اس کے پیچھے آگئی۔

"بیٹھیے۔" اس نے صوفے کی سمت اشارہ کیا۔

"تھینک یو۔" وہ بیٹھ گیا۔

"کولڈ ڈرنک منگواؤں؟" اس نے دھیمے سے پوچھا، نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"میں پی کر آیا ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"آئے کیوں ہیں؟"

"یہ پوچھنے کہ تم کیوں آئی تھیں؟" وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"میں...؟" وہ اپنے جانے کا سوچ کر نروس ہو گئی تھی، دل کی دھڑکنیں پھر سے منتشر ہونے لگی تھیں۔

"مام بتا رہی تھیں کہ تم مجھ سے ملنے آئی تھیں اور میں سو رہا تھا۔" اس نے حوالہ دیا۔

"وہ میں دراصل کالج کے پراسپیکٹس لے کر آئی تھی، وہ دکھانے تھے آپ کو۔" اس نے بہانا ڈھونڈ ہی لیا۔

"تو کہاں ہیں پراسپیکٹس؟"

"ابھی لے کر آتی ہوں۔" وہ کہہ کے وہاں سے اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد پراسپیکٹس لے بھی آئی تھی۔

"بیٹھو۔" ایزد نے اسے صوفے پہ بیٹھنے کو کہا، لیکن وہ اس کے برابر بیٹھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟ بیٹھو نا۔" وہ جھنجلا گیا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں، آپ بتائیں کیا بتانا ہے؟" وہ، ہنوز کھڑی رہی۔

"کاشملی! تمہارا دماغ کہاں پہنچا ہوا ہے؟" اب کی بار وہ ذرا سختی سے بولا تو وہ سٹپٹا گئی۔

"بیٹھ جاؤ یہاں۔" اس کے سخت تیوروں سے بوکھلا کے وہ فوراً بیٹھ گئی اور وہ پراسپیکٹس کھول کر اسے سمجھانے لگا۔

وہ کان میں داخلہ لے رہی تھی اور بہت خوش تھی، وہ ایک ایک بات ایزد... ڈسکس کر... تھی، ... اس وقت ہوا یہ... جو کچھ بھی سمجھ رہا تھا، کاشملی کے سر کے اوپر سے گزر تا رہا۔

"پھر یہ ارادہ ہے تمہارا؟" وہ کہتے کہتے اچانک اس کی طرف متوجہ ہوا، وہ اسے ہی... بندھے دیکھ رہی تھی۔ ایزد کے اچانک دیکھنے پہ گڑبڑا گئی۔

"م... میرا ارادہ؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"اسی کالج میں ایڈمیشن لوگی یا کہیں اور؟"

"اسی کالج میں ایڈمیشن لوں گی، مجھے پسند ہے۔" اس نے ہامی بھری۔

"اوکے تو پھر تمام ڈاکومنٹس تیار کرلو، میں تمہارے ساتھ جا کر ایڈمیشن کروا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے کل چلیں گے۔" اس نے فوراً سر ہلایا۔

"اوکے، پھر کل ملیں گے۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"آپ جا رہے ہیں؟"

"میرا خیال ہے اس وقت میرا چلے جانا ہی بہتر ہے۔"

"ایزد کچھ سمجھ گیا...!" وہ کاشملی کے احساسات اس کے چہرے پہ لکھے دیکھ چکا تھا۔

"کیوں؟"

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے۔" وہ کہہ کے باہر نکل گیا اور کشمالہ گہرا سانس کھینچ کے رہ گئی۔

"یہ کیا ہوا تھا؟ دل کس ڈگر پہ چل نکلا تھا؟"

☼ ☼ ☼

"کشمالہ بیٹا۔" وہ کالج کے گیٹ سے باہر نکلی تو یک دم چونک گئی۔ یہ آواز اس کے پاپا کی تھی۔ وہ ان کی آواز لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

"پاپا...؟" وہ بے یقینی سے شاہ نواز حیدر کی سمت پلٹی۔ "میری جان، میری کشمالہ۔" انہوں نے بازو پھیلا دیے تھے اور کشمالہ بھاگتی ہوئی آکر ان کے سینے سے لگ گئی۔

"پاپا! آپ یہاں...؟" وہ اس کی پیشانی چوم رہے تھے اور کشمالہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔

"تم سے ملنے آیا ہوں بیٹا... گھر کے نمبر پہ فون کرتا تھا تو ... فون بند کر دیتی تھیں..."

"میں جانتی ہوں پاپا، وہ ایڈیٹ ایسا ہی کرتی ہے۔"

"ادھر آؤ میرے ساتھ۔" انہوں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں پاپا! وہ مام کو پتا چل گیا تو جھگڑا کریں گی۔" کشمالہ شاہ نواز حیدر کی گاڑی میں بیٹھنے کو تیار نہیں تھی۔

"ارے نہیں پتا چلے گا، اتنی فرصت کہاں ہے اسے؟ وہ تو پیسہ بنانے کی دھن میں مگن ہے۔"

انہوں نے تلخی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کو کہا۔ وہ تذبذب کا شکار تھی۔ اسے پتا تھا اگر سائرہ حیدر کو علم ہو گیا کہ وہ شاہ نواز حیدر سے ملی ہے تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔

"بیٹا! بیٹھ جاؤ، کچھ نہیں ہوتا۔" انہوں نے اصرار کیا تو کشمالہ کو بیٹھنا پڑا اور اس کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"ریسٹورنٹ لے چلو۔" انہوں نے ڈرائیور سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی، وہ اسے ساتھ لیے اندر آگئے۔

"مبارک ہو بیٹا! میں نے سنا تھا تم نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔" وہ اسے اپنے سامنے کرسی پہ بٹھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"تھینک یو پاپا... اب تو میرا فرسٹ ایئر بھی کلیئر ہونے والا ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"ماشاء اللہ! لگتا ہے کہ میری بیٹی واقعی بڑی اور ذہین ہو گئی ہے۔" انہوں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"سترہ سال کی ہو گئی ہوں۔" اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔

"سترہ سال..." شاہ نواز حیدر دہرا کے رہ گئے۔

"جی! سترہ سال، اور مام کو آپ سے الگ ہوئے دس سال ہو گئے ہیں۔" یہ سارا حساب کشمالہ کے دل پہ لکھا تھا۔

"اور ان دس سالوں میں، میں آپ سے دس مرتبہ ہی ملی ہوں گی...؟" وہ افسردگی سے کہہ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! ملاقات کا کیا ہے؟ بس دلوں میں محبت زندہ ہونا چاہیے۔" وہ اس کی دل گرفتگی کے خیال سے اسے تسلی دے رہے تھے۔

"محبت کو سسکنے کے لیے چھوڑ دیں تو وہ مر جاتی ہے پاپا!"

"میں کیا کروں بیٹا...؟ وہ تمہیں مجھ سے دور رکھ کے مجھے اذیت دینے کی کوشش میں رہتی ہے اور میں مجبور ہوں، اٹھارہ سال تک میرا تم پہ کوئی اختیار نہیں چل سکتا۔" انہوں نے معذوری ظاہر کی۔

ہونہہ! اٹھارہ سال کے بعد کیا ہو گا...؟"

"پھر میں تمہیں اپنے پاس کراچی لے جاؤں گا۔" وہ بے ساختہ مسکرا کے بولے۔

"یہ صرف تسلی ہے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"کیوں، تسلی کیوں ہے...؟" وہ حیرت سے بولے۔

"کیونکہ آپ مجھے کراچی لے کر نہیں جا سکتے۔"

"ارے! کیوں نہیں لے جا سکتا؟"

"وہاں آپ کی بیوی بھی تو ہے۔" اس کے جواب پہ وہ یک دم فلک شگاف قہقہہ لگا بیٹھے۔

"ارے میری جان! میری بیوی بہت خوش ہوگی، بلکہ تم سے مل کر، تمہیں دیکھ کر خوش ہوگی۔" وہ اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولے۔

"وہ کیوں خوش ہوں گی؟"

"اس لیے کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور وہ جانتی ہے کہ تم میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہو۔"

شاہنواز حیدر اسے سمجھا رہے تھے اور کشمالہ سن کر چپ ہو گئی تھی۔ پھر ان دونوں باپ بیٹی نے لنچ کیا۔ شاہ نواز حیدر اسے ڈھیر سارا پیار اور ڈھیر سارے تحائف دینے کے بعد گھر ڈراپ کر گئے تھے۔ کشمالہ پورچ میں سائرہ حیدر کی گاڑی دیکھ کر سہم گئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے؟ وہ سست روی سے چلتی اندر آ گئی۔

"کشمالہ!" سائرہ حیدر کی پہلی پکار پہ ہی [illegible] اٹھی تھی۔

"کہاں سے آ رہی ہو تم؟" وہ کسی جیلر کی طرح اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔

"کالج سے۔"

"شٹ اپ جھوٹ مت بولو۔" وہ دھاڑ اٹھیں۔ "ڈرائیور تمہیں پک کرنے گیا تھا لیکن تم وہاں نہیں تھیں۔"

"مام! میں وہ ایزد کے ساتھ۔"

"ایزد اپنے گھر پہ ہے۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ کے کہا۔ کشمالہ بری طرح پھنس گئی تھی۔ صرف شاہ نواز سے ملنے کا معاملہ ایسا تھا جہاں کشمالہ ذرا دب جاتی تھی ورنہ اس نے ڈرنا کب سیکھا تھا بھلا۔۔۔؟

"تم اس ذلیل کے ساتھ تھیں ناں؟ مجھے پتا ہے وہ اسلام آباد آیا ہوا ہے اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ وہ تم سے ملنے کی کوشش ضرور کرے گا، اسی لیے میں نے ڈرائیور کو بھیج دیا لیکن وہ۔" سائرہ حیدر کسی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ ان سے نہیں چپ رہا گیا۔

وہ کشمالہ کو اٹھی کر دیا [illegible]۔

"[illegible] پورے ایک سال بعد ملی ہوں ان سے [illegible] کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ وہ میرے فادر ہیں [illegible] ان سے ملنے کا حق ہونا چاہیے۔"

"وہ صرف تمہارا فادر نہیں ہے وہ دو اور بچوں کا بھی فادر ہے۔" انہوں نے طنزیہ کہا۔

"تو کیا ہوا؟ آپ نے ان سے ڈائیورس لے لی تو کیا وہ دوسری شادی بھی نہ کرتے؟ اکیلے زندگی گزارتے؟ آپ خود ہی تو انہیں گھر سے [illegible] تھیں اور وہ آخر نکل ہی گئے اس میں ان کا کیا قصور ہے؟" آج پہلی بار اس نے اس معاملے میں ماں کے سامنے بولنے کی جرأت کی تھی۔

"میرے سامنے زبان چلاتی ہو۔" انہوں نے اسے تھپڑ دے مارا اور کشمالہ کے ہاتھوں میں پکڑے تمام گفٹس چھوٹ کر زمین پہ جا گرے۔ بہت سی چیزیں بکھر گئیں۔

"آپ ہمیشہ [illegible] بولتی ہیں [illegible] کو بولنے کا موقع دیے بغیر اس لیے لگتا ہے کہ آپ رائٹ ہیں حالانکہ آپ ہمیشہ سے ہی رائٹ پہ نہیں ہیں۔ آپ نے ہمیشہ پاپا کے ساتھ زیادتی کی، انہیں تنگ کیا، ان پر غصہ کیا، گالیاں دیں اور پھر انہیں گھر سے نکلنے پہ مجبور کر دیا۔ آپ نے مجھ سے باپ کی محبت چھینی اور ماں کی محبت بھی دی ہی نہیں، پھر بھی۔۔۔ پھر بھی آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے لیے اچھی بن کر رہوں۔ آپ کے ہر حکم پہ سر جھکا دوں، کیوں مام؟ کس لیے آپ کا حکم مانوں؟ آپ نے آج تک مجھے دیا ہی کیا ہے؟ اچھے اسکول، کالج اور اچھے کپڑے جوتوں کے سوا؟"

وہ آج دوبدو جواب دیتی اپنے اندر کا غبار نکالنے کے درپے ہو گئی تھی اور سائرہ حیدر حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے آج تک جو نہیں کہا تھا، وہ سب کہہ رہی تھی۔

"یہ خناس کس نے بھرا ہے تمہارے دماغ میں۔۔۔؟" وہ غصے سے بولیں۔

"آپ نے بھرا ہے یہ خناس۔۔۔ دس سال ہو گئے ہیں اس خناس کو بھرتے ہوئے، آپ نے کبھی سوچا کہ آپ کی بیٹی کو آپ کی ضرورت ہے، آپ نے کبھی اندازہ لگایا کہ آپ کی بیٹی اپنے باپ سے کتنی اٹیچ تھی جسے آپ نے دور کر دیا۔ کبھی سوچا آپ نے کہ آپ جیسی ضدی مائیں کیسا ظلم کرتی ہیں بچوں پہ۔۔۔؟ کبھی غور کیا آپ نے کہ میں اس خالی گھر میں اکیلی چکراتی رہی ہوں؟ پاگل کر دیا ہے آپ نے مجھے۔ میری تنہائی اور میری سوچوں نے مجھے جنونی بنا دیا ہے، باپ مجبور تھا اور ماں بااختیار، آپ دونوں کی ان ہی مجبوریوں اور اختیار نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا، میں آپ کے لیے عذاب ہوں تو یہ عذاب گلے سے اتار دیں۔ مجھے میرے پاپا کے پاس رہنے دیں اور خود جی بھر کے بزنس میں ترقی کرتی رہیں۔ آپ کو آپ کی دولت اور شہرت مبارک ہو، مجھے تو سولی پہ مت لٹکائیں۔"

[illegible]

"آپ سے زیادہ مجھے اپنے پاپا عزیز ہیں بے شک مجھ سے دور رہتے ہیں، بے شک ان کے اور بھی بچے ہیں، بے شک ان کی بیوی بھی ہے، بے شک وہ جیسے بھی ہیں لیکن مجھ سے محبت کرتے ہیں۔" اس نے آخری جملہ خوب جتا کر کہا۔

پھر اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو رگڑ کر پونچھتی ہوئی نیچے بیٹھ کر اپنے بکھرے ہوئے گفٹس سمیٹنے لگی، ساتھ ساتھ آنسو بھی بہتے جا رہے تھے۔

"وہ مجھے برتھ ڈے وش نہیں کر سکتے لیکن پھر بھی ان کا گفٹ ہر سال مجھے موصول ہوتا ہے، دس سالوں میں دس گفٹ بھیجے ہیں انہوں نے اور وہ دس گفٹ میری الماری میں انمول خزانے کی طرح محفوظ ہیں، صرف اس لیے کہ وہ انہوں نے مجھے بڑی محبت سے بڑی یاد سے بھیجے تھے۔

آپ نے مجھے ان دس سالوں میں کیا دیا؟ سیزن کے سیزن شاپنگ کروا دی اور بس۔۔۔؟" وہ اکیلی بولتی جا رہی تھی اور پھر ساری چیزیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ نہیں ہے کہ میرے پاس چیزوں کی کمی ہے اور میں ان چیزوں پہ خوش ہوتی ہوں، بات یہ ہے کہ میرے پاس محبت کی کمی ہے، اس لیے ان چیزوں کے ساتھ ملنے والی محبت پہ خوش ہوتی ہوں، آج یہ محبت مجھے پورے ایک سال بعد ملی ہے، اس لیے پلیز مجھے تھوڑی دیر خوش ہو لینے دیں، کچھ نہیں بگڑے گا آپ کا، بلکہ مجھ پہ توجہ دینے کے بجائے بہتر ہے کہ آپ اپنی کسی فائل یا کسی میٹنگ پہ توجہ دیں، کچھ فائدہ تو ہوگا ناں آپ کو۔ مجھ پہ ٹائم ویسٹ کرنے سے کچھ نہیں ملے گا۔" وہ آج بولی تھی اور دل کھول کے بولی تھی۔

سائرہ حیدر ششدر سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ساری چیزیں لے کر اوپر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی لیکن اس کے لفظوں کی کاٹ پیچھے ہی رہ گئی۔ اس کی آواز کی بازگشت ابھی تک ان کے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ انہیں کیا پتا تھا کہ وہ کشمالہ جو باہر سے اتنی بے حس، ضدی اور لاتعلق بنی رہتی ہے وہ اندر سے گہری اور [illegible] حساس ہے۔ وہ ایک ایک بات کو دل پہ لیے پھر رہی تھی اور دل پہ [illegible] زبانی [illegible] کر چکی تھی۔ پہلے وہ کم عمر تھی، چپ رہتی تھی، سنتی تھی، خاموش ہو جاتی تھی لیکن اسے اب بولنا بھی آ گیا تھا اور آج اس کے اس بولنے نے سائرہ حیدر کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

"آنٹی ایزد گھر پہ ہے؟" وہ اپنی دھن میں سیدھی ان کے ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھی لیکن وہاں آنٹی کے بجائے اور لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹک کے رک گئی۔ ایزد بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا، کشمالہ کو دیکھ کر چونک گیا۔

"ارے کشمالہ بیٹا! آؤ اندر آ جاؤ۔" مسز آفندی نے نرمی سے مسکرا کر اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تھا۔

"سوری آنٹی! مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں، میں پھر آ جاؤں گی۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں کہتی واپسی کے لیے پلٹی۔

"ارے رکو یار! یہ مہمان کوئی غیر نہیں اپنے ہی ہیں۔" ایزد گود سے کشن ہٹا کر صوفے سے اٹھ کے اس کے پاس آ گیا۔

"ان سے ملو' یہ ہیں میرے بڑے بھائی فہد آفندی' اور یہ ہیں میری سسٹر عریشہ آفندی' دونوں شادی کے بعد اپنی اپنی فیملی کے ساتھ امریکا میں مقیم ہیں' دو روز پہلے کراچی تشریف لائے تھے اور آج کراچی سے اسلام آباد پہنچے ہیں۔ یہ میرے کزنز ہیں حامد' ثانیہ' اجالا' اور سمیر' یہ بھی کراچی سے ہی تشریف لائے ہیں ان کے ساتھ' اب چند دن یہیں رہیں گے۔" ایزد نے بڑی تفصیل اور وضاحت سے تعارف کروایا۔

"ہیلو۔" مجبوراً کشمالہ کو ہیلو کہنا پڑا' وہ ان سب کی نظریں خود پہ مرکوز دیکھ کے اندر سے کنفیوز ہونے لگی تھی۔

"اور یہ ہیں آنٹی سائرہ حیدر کی اکلوتی صاحبزادی کشمالہ حیدر۔" اس نے باآواز بلند اس کا تعارف کروایا۔ "اور پورے اسلام آباد میں یہ میری اکلوتی فرینڈ ہیں' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں بھی ان کا اکلوتا فرینڈ ہوں۔"

وہ شرارت سے ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ سب بھی اس کے انداز پہ ہنسے تھے لیکن ان سب میں ثانیہ ایسی تھی جو نہیں ہنسی تھی بلکہ اس کی تیوری پہ بل پڑ گئے تھے۔

"اس لیے میری ریکویسٹ ہے کہ آپ لوگ بھی میری فرینڈ کو کھلے دل سے ویلکم کریں اور اس دوستی کو آگے بڑھائیں۔" ایزد نے کشمالہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے صوفے پہ بٹھانے کے لیے آگے کیا لیکن اتنے میں ثانیہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

ایکسکیوز می۔" وہ کہہ کے وہاں سے نکل گئی جس پہ باقی سب کے ساتھ ساتھ کشمالہ اور ایزد نے بھی چونک کے دیکھا تھا۔

"کشمالہ! تم بیٹھو' میں ابھی آتا ہوں۔ مام! کشمالہ کو بھی کولڈ ڈرنک سرو کریں۔" وہ جاتے جاتے بھی کہنا نہیں بھولا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل آیا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنی تھی۔ وہ بھی اوپر کی طرف لپکا۔

"ثانیہ!" اس نے کمرے کا دروازہ کھول کے دیکھا۔

"ثانیہ!" دوسرے کمرے میں بھی جھانکا۔

"ثانیہ پلیز یار! کہاں ہو؟" وہ اسے ڈھونڈتا ہوا آگے بڑھا تو اسے ٹیرس پہ دوپٹہ لہراتا ہوا نظر آیا۔ وہ اس کے پیچھے ہی ٹیرس پہ آ گیا۔

وہ دونوں ہاتھ ریلنگ پہ جمائے نیچے جھک کر دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ اس طرح اچانک اٹھ کر کیوں چلی آئیں؟" ایزد بھی ریلنگ پہ ہاتھ رکھ کے کھڑا ہو گیا۔

"تمہاری فرینڈ کو دیکھ کر۔" اس نے دانت پیس کے کہا۔

"کیوں میری فرینڈ اچھی نہیں ہے کیا؟"

"بہت اچھی ہے' اسی لیے تو آئی ہوں۔" ثانیہ غصے کی تیز تھی اور ایزد کو پتا تھا کہ اب وہ اس بات کو ربڑ کی طرح کھینچے گی۔

"ارے یار! وہ واقعی بہت اچھی ہے۔ تمہیں تو اس کے ساتھ فرینڈشپ کر لینا چاہیے۔"

"کیوں؟ مجھے کیوں اس کے ساتھ فرینڈشپ کر لینا چاہیے۔" ثانیہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"کیونکہ وہ میری فرینڈ ہے۔" ایزد نے لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"وہ تمہاری فرینڈ ہے' یہ بات تم نے پہلے کبھی کیوں نہیں بتائی؟"

وہ چبا کر بولی۔

"تمہارا روبرو اس کے ساتھ تعارف کروایا ہے تو تم اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہو' فون پہ بتاتا تو تم نجانے کیا سے کیا کر ڈالتیں۔"

"یعنی تم نے مجھ سے جان بوجھ کے چھپایا ہے؟"

"ارے! چھپانے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ میں تو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم الٹا سیدھا سوچنے لگتی ہو۔ اس لیے فون پہ نہیں بتایا' اور ویسے بھی ہماری دوستی اس نوعیت کی نہیں ہے کہ اسے شک کی نظر سے دیکھا جائے۔"

ایزد کی نیت صاف تھی اس لیے وہ اطمینان سے بول رہا تھا۔

"تو پھر کس نوعیت کی دوستی ہے آپ کی۔۔۔؟" اس کے لہجے میں طنز اتر آیا۔

"بتاتا ہوں۔۔۔ تم آرام سے بیٹھو یہاں۔" ایزد نے کونے میں رکھی کرسیاں قریب گھسیٹ لیں۔

"کوئی بہانا کرنا چاہتے ہو؟"

"دیکھو ثانیہ! ہر انسان کو ایک ہی چھڑی سے نہیں ہانکنا چاہیے۔ بے یقینی اور شک کی پٹی اتار کے دیکھو پھر سب بتاتا ہوں۔" اس نے ثانیہ کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

وہ چند سیکنڈ اسے دیکھتی رہی پھر اپنے تنتے ہوئے اعصاب ڈھیلے چھوڑتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوکے۔ بتاؤ کیا بتانا چاہتے ہو؟"

اس کی طرف سے نرمی اور اجازت پا کر ایزد اسے سب بتاتا چلا گیا۔ پہلے تو وہ بے یقینی اور یقین کے درمیان ڈانواں ڈول سی رہی لیکن جب اس نے مسز آفندی سے تصدیق کے لیے کہا تو وہ مان گئی۔ اسے آخر یقین کرنا ہی پڑا تھا اور تقریباً بیس منٹ بعد جب وہ اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ نیچے ڈرائنگ روم میں لایا تو کشمالہ وہاں نہیں تھی۔

"مام! کشمالہ کہاں گئی؟"

"تم نہیں تھے تو وہ کس کے پاس بیٹھتی؟ ہمارے ساتھ تو اس کی انڈر اسٹینڈنگ بھی نہیں ہے' جو کچھ دیر باتیں ہی کر لیتی۔"

مسز آفندی کے جواب پہ وہ سر ہلا کر رہ گیا لیکن دھیان سارا کشمالہ کی طرف ہی تھا۔ کہ وہ نجانے کیا سوچ رہی ہو گی۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

"آنٹی! کشمالہ کہاں ہے؟" ایزد ان کے گھر میں داخل ہوا تو سائرہ حیدر کو لان میں بیٹھے دیکھ کر ان کے پاس چلا آیا۔

"تھوڑی دیر پہلے ہی باہر نکلی ہے۔"

"سائیکل لے کر نکلی ہے؟"

"نہیں' کالج سے آنے کے بعد اپنے بیڈ روم میں ہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر گئی ہے' میں نے سوچا تمہاری طرف جا رہی ہے۔"

سائرہ حیدر خود کسی سوچ میں تھیں ایزد کو دیکھ کر ہی حال میں واپس آئی تھیں۔

"اوکے! میں دیکھتا ہوں اسے۔" وہ کہہ کے واپس پلٹ گیا۔

"سنو بیٹا!" انہوں نے پیچھے سے آواز دی۔

"جی آنٹی! کہیے؟"

"دیکھو بیٹا! اسے سمجھایا بھی کرو' آج کل کچھ اپ سیٹ ہے شاید تم سمجھاؤ گے تو سمجھ جائے گی۔"

اوکے! میں کوشش کروں گا لیکن وہ اپ سیٹ کیوں ہے؟" اس نے ذرا ٹھہرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو وہی بتا سکتی ہے کہ وہ اپ سیٹ کیوں ہے؟"

کیوں کیا آپ کو نہیں پتا۔۔۔؟"

"شاید نہیں۔" انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اوکے۔۔۔" ایزد نے کندھے اچکا دیے اور گیٹ سے باہر نکل آیا۔

وہ کل سے اسے فون کر رہا تھا لیکن اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔ رات کو پتا چلا کہ سو رہی ہے' صبح بتا چلا کہ کالج چلی گئی ہے اور اس وقت وہ فون کرنے کے بجائے خود چلا آیا تھا لیکن پھر بھی اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔۔۔ اور ایزد کو پتا تھا جتنی دیر ملاقات نہیں ہو گی وہ اپنا خون جلاتی رہے گی' اسی لیے وہ اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا کوئی اور دوست تو تھا ہی نہیں کہ جس کی امید ہوتی کہ وہ اس کے گھر پہ ہو گی اس لیے وہ اسے ادھر ادھر ہی تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

وہ پارک میں آ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پہ ہی وہ ایک خالی بینچ پہ تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اوائل جنوری کے دن تھے۔ سرد شاموں میں اداسی کا رنگ شامل تھا۔ مغرب کی سمت ڈوبتا سورج اپنے پیچھے خنکی چھوڑے جا رہا تھا وہ ہی خنکی اور اداسی کشمالہ کے چہرے پر بھی ثبت

تھی۔ وہ بھی اس سرد شام کا حصہ لگ رہی تھی۔ داس اور زرد۔ اور ایزد نجانے کب اور کیسے اس زرد اداس شام کی پلیٹ میں آگیا تھا۔ اسے کتنی دیر گزر گئی اور وہ دم سادھے ٹکٹکی باندھے اس کو دیکھتا رہا۔

وہ سامنے سورج کو دیکھ رہی تھی اور سورج کا عکس اس کے چہرے پہ بکھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے رخساروں پہ بہتے بے آواز آنسو سنہری موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ایزد کو لگا اس کے اردگرد اک طلسمی حصار بندھ گیا ہو' اک سنہرا طلسم' جس کے زیر اثر وہ دھیمے قدموں سے چلتا اس کے برابر آبیٹھا۔ یہاں تک کہ آہٹ بھی نہ ہوئی۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ کنسمالہ تھی' حد سے زیادہ حساس۔ اس نے بنا دیکھے ہی محسوس کرلیا تھا کہ وہ اس کے پاس آکر بیٹھا ہے۔ اور ——— وہ نہیں چاہتی تھی کہ ایزد اس کے پاس بیٹھے یا پھر وہ ایزد کے پاس بیٹھے' اسی لیے فوراً اٹھنے لگی کہ اچانک ایزد نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میرا ہاتھ چھوڑیں' میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" اس نے ایزد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"لیکن میں ابھی یہاں بیٹھنا چاہتا ہوں۔" ایزد کا لہجہ بدلا ہوا تھا' آواز کسی جذبے کے احساس سے بوجھل ہو رہی تھی۔ کنسمالہ کو لگا ایزد نے اس کا دل اپنی مٹھی میں دبا لیا ہو۔

"آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟" وہی تیکھا سا سوال جو وہ اکثر کرتی تھی۔

"تمہارے لیے۔"

"میرے لیے کیوں؟ کل کہاں چلے گئے تھے۔۔۔؟"

"کام تھا ثانیہ سے' اس لیے چلا گیا۔"

"اور میں سمجھی محبت تھی ثانیہ سے' اس لیے چلے گئے۔" وہ برجستہ بول کے ہنسی۔

"محبت۔۔۔؟" ایزد نے دہرایا۔ "کنسمالہ! تمہاری نظر میں محبت کیا ہے؟"

وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا اور کنسمالہ کی نظریں اس کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ پہ جا ٹھہریں۔

"میری نظر میں تو اس وقت کسی کا ہاتھ تھام لینا ہی محبت ہے۔" اس کا جواب بہت گہرا تھا' ایزد نے تھامنا ہاتھ نہ چھوڑا' اگر چھوڑ دیتا تو محبت بھی وہیں چھوٹ جاتی' کسی بے حد ضروری ٹرین کی طرح اور پھر وہ ساری عمر اس ٹرین کے پیچھے بھاگتا رہتا لیکن وہ ہاتھ نہ آتی۔

"اور کسی کے آنسو پونچھ دینا کیا ہے؟" ایزد نے دوسرے ہاتھ سے کنسمالہ کے رخساروں پہ بہنے والے آنسوؤں کی نمی پونچھی۔

"محبت میں عبادت۔" کنسمالہ کے جواب بھی کمال تھے۔

"عبادت۔۔۔؟" ایزد کو حیرت ہوئی۔

"ہوں! عبادت' کیونکہ عبادت کرنا اگر بہت آسان ہے ناں تو بے حد مشکل بھی ہے' اسی طرح محبت میں کسی کے آنسو پونچھ دینا بھی بڑا مشکل کام ہے' ہو ہی نہیں پاتا۔" اس نے دلیل دی۔

"تم محبت کرتی ہو؟"

"بس کوشش کر رہی ہوں چند دنوں سے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "اور آپ۔۔۔؟"

"میں بھی بس کوشش کر رہا ہوں چند لمحوں سے۔" اس کے جواب پہ کنسمالہ نے گھور کے دیکھا اور پھر دونوں ہی کھلکھلا کے ہنس دیے۔

☼ ☼ ☼

یہ بات کنسمالہ سے تو اس نے مذاق کے رنگ میں کہی تھی لیکن وہ خود جانتا تھا کہ یہ بات حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔ اس نے کئی بار کنسمالہ کو اپنی سوچ سے اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اور بھی اس کے اعصاب پہ طاری ہونے لگی تھی۔ اس کے سارے کزنز اور دونوں بہن بھائی مری اور سوات وغیرہ گھومنے جا رہے تھے اور ظاہر سی بات تھی کہ وہ سب ہی اسے بھی ساتھ گھسیٹ رہے تھے حالانکہ وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن پھر بھی مجبوراً اسے جانا ہی پڑا۔ جانے سے پہلے وہ کنسمالہ سے مل کر آیا تھا وہ اس کے جانے کا سن کر اداس تو ہوئی لیکن اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی' البتہ فون کرنے کی تاکید ضرور کی اور وہ وعدہ کرکے آیا تھا کہ فون بند نہیں کرے گا۔ جتنی دیر مری اور سوات میں رہے گا' مسلسل کال کرے گا اور اس نے اپنا وعدہ پورا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی' وہ اسلام آباد سے نکلا تو اس نے کنسمالہ کو کال کی تھی اور مری پہنچنے تک وہ لائن آن رہی' پھر مری ہوٹل میں سامان وغیرہ پہنچانے کے بعد اس نے کال کی جو پورا مری گھومنے تک یوں ہی آن رہی اور کنسمالہ بالواسطہ طور پر ایزد کے ساتھ پکنک میں شریک رہی۔

"بالآخر رات کے جب وہ سب آگ جلائے بیٹھے تھے تو ثانیہ نے اس کے ہاتھ سے موبائل چھین کر آف کر دیا۔

"کسی کی برداشت کو اتنا نہیں آزمانا چاہیے کہ وہ جواب دے جائے۔"

اس نے موبائل آف کرکے اس کی گود میں پھینک دیا۔

"میں اس سے وعدہ کرکے آیا تھا کہ اسے فون کروں گا۔"

"فون کرو گے یا اسے ٹیمن کرو گے؟" ثانیہ کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

"جو بھی سمجھ لو۔" اس نے شانے اچکائے۔

"ایزد تم جان بوجھ کر مجھے۔۔۔"

"ارے ثانیہ! چھوڑو میری جان کیوں الجھتی رہتی ہو؟ یہ تو تمہیں تنگ کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتا ہے۔"

مسز آفندی ثانیہ کی جھنجلاہٹ پر پیار سے بولیں۔

"جی! اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ مجھے تنگ کرنے کے لیے ایسی حرکتیں کرتا ہے۔" وہ چبا کر بولی ایزد کچھ کہے بغیر اٹھ گیا اور ایک پہاڑی کے عین کونے پہ کھڑے ہو کر موبائل آن کرکے دوبارہ کال ملانے لگا۔ عریشہ آپی اسے چپت لگا کر سرزنش کرتی ہوئیں پکڑ کے اپنے ساتھ لے آئیں۔

☼ ☼ ☼

"آپ لوگ گھر چلیں' میں آتا ہوں۔" ان لوگوں کو واپسی پہ گھر ڈراپ کرنے کے بعد اس نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرلی۔

"کیوں؟ تم کہاں جا رہے ہو۔۔۔؟" عریشہ آپی نے پلٹ کراسے حیرت سے دیکھا۔

"کنسمالہ کی طرف' اس کے لیے جو گفٹس لایا ہوں' وہ دینے جا رہا ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا اور ثانیہ گیٹ کے اندر جانے کے بجائے وہیں ٹھہر گئی۔

"ایزد!" اس نے آواز دی لیکن وہ گاڑی آگے بڑھا چکا تھا' ثانیہ اور عریشہ آپی وہیں کھڑی دیکھتی رہ گئیں۔ ایزد کے تیور کچھ اور ہی کہہ رہے تھے اور ثانیہ کے اندر ابال اٹھنے لگے' وہ پیر پٹختی ہوئی اندر آگئی۔

"ہونہہ! کنسمالہ' کنسمالہ' کنسمالہ' بھاڑ میں گئی کنسمالہ" وہ اندر آتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟ اتنے غصے میں کیوں ہو۔۔۔؟" مسز آفندی ثانیہ کے چہرے پہ غصے کی لالی بھانپ چکی تھیں۔

"آپ کا لاڈلا بھتیجا سپوت اپنی کنسمالہ سے ملنے گیا ہے' یہ نو دن بھی نجانے اس نے ہمارے ساتھ کیسے گزارے ہیں؟ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اپنی چہیتی کو ساتھ لے جاتا اور ہمیں یہیں چھوڑ جاتا' شادی سے پہلے ہی ہنی مون منا لیتا۔" ثانیہ کا غصہ اب بے لگام ہو چکا تھا۔

"ثانیہ۔۔۔!" مسز آفندی نے بلند آواز میں اسے ٹوکا تھا۔

"دیکھیے نا پھوپھو! ہر وقت اس کے پہلے سے لگا رہتا ہے اور آپ جان بوجھ کر انجان بنی رہتی ہیں' وہ بچی نہیں ہے' اٹھارہ انیس سال کی جوان جہان لڑکی ہے' جس پہ کسی بھی مرد کا دل آسکتا ہے' اور اتفاق سے ایزد بھی مرد ہی ہے' اس کے پاس بھی ایک عدد دل ہے اور وہ دل اس لڑکی پہ آ بھی سکتا ہے' آپ کے پاس کیا گارنٹی ہے کہ وہ اسے اس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے سب مرد حضرات دیکھتے ہیں؟" ثانیہ بے لگام بولتی تھی' اس کا ادراک مسز آفندی کو چند سیکنڈز میں ہی

ہو گیا تھا۔

"دیکھو بیٹا! وہ یہ سب ہماری وجہ سے کر رہا ہے۔"

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ یہ سب آپ کی وجہ سے کر رہا ہے یا اپنے دل کی وجہ سے؟" اس کے سوال پہ مسز آفندی لمحہ بھر کے لیے چپ سی ہو گئیں۔

"کوئی ثبوت نہیں ہے ناں آپ کے پاس...؟" انہیں چپ دیکھ کر وہ فوراً بولی۔

"پلیز ثانیہ! بس کرو' وہ آتا ہے تو میں اسے سمجھاتی ہوں' آئندہ ایسا نہیں ہوگا پلیز ریلیکس۔" عریشہ آپی نے اسے کندھوں سے تھام کے سمجھانے کی کوشش کی اور تسلی دی۔

"آپ نہیں' میں خود اسے سمجھالوں گی' اور یقیناً وہ سمجھ بھی جائے گا۔"

ثانیہ غصے سے دانت پیس کر کہتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی اور وہ دونوں ماں بیٹی پیچھے دیکھتی رہ گئیں۔

"مام! آپ کو کیا ضرورت تھی کشمالہ کو ایزد سے اتنا کلوز کرنے کی؟

عریشہ آپی ماں کو خفگی سے دیکھ رہی تھیں اور مسز آفندی ثانیہ کو سوچ رہی تھیں جو لڑکی شادی سے پہلے ذرا سی بات پہ ان کے سامنے اس لہجے میں بات کر رہی تھی' وہ شادی کے بعد کیا کر سکتی تھی' اس کا اندازہ ہو چکا تھا انہیں۔ اور انہیں یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ ثانیہ اور ایزد کا گزارا مشکل سے ہوگا' دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک فرق جو انہیں آج سے پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا' ایزد بہت ٹھنڈے مزاج کا تحمل پسند آدمی تھا جبکہ ثانیہ تو آگ کی طرح بھڑکتی تھی اور اس آگ کی لپک اب وہ بھی دیکھ چکی تھیں...!

☆ ☆ ☆

آج کشمالہ کے کالج میں فنکشن تھا۔ وہ دو بار ایزد کو کہہ چکی کہ میرے ساتھ چلو' اس لیے مجبوراً" ایزد نے اپنا آفس جانا ملتوی کر کے اس کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی۔ ادھر گھر میں ثانیہ وغیرہ کراچی واپس جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں' البتہ فہد آفندی اور عریشہ آپی کا ابھی چند دن اور رکنے کا ارادہ تھا کیونکہ ابھی فہد کی بیوی اور بچوں کو بھی پاکستان آنا تھا' بس وہ اسکول چھٹیوں کے انتظار میں تھے... اور مسز آفندی آنے والے اپنے بچوں کی موجودگی کی وجہ سے بڑی خوش خوش نظر آ رہی تھیں۔ آج بھی گھر میں ایسی ہی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ ایزد تیار ہو کر باہر نکلا تو وہ اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

کشمالہ کی طرف جا رہے ہو؟"

"جی مام! آج اس کے کالج میں فنکشن ہے' میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کے ساتھ جاؤں گا' اس لیے جانا ضروری ہے۔"

"اوکے ذرا جلدی آ جانا' پھر ثانیہ وغیرہ کو گھر بھی جانا ہے' انہیں ایئرپورٹ چھوڑنے تم ہی جاؤ گے۔"

انہوں نے اسے تاکید کی۔

"اوکے جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کشمالہ کے گیٹ پہ ہارن دیا تو وہ جلدی سے باہر آ گئی۔

"اتنا لیٹ ہو گئے آپ" وہ گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھی تو خفگی سے بولی جبکہ ایزد نے اس کے وجود سے پھوٹتی پرفیوم کی دلفریب مہک پہ بے ساختہ نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور پہلی بار ایسا ہوا کہ وہ نظر کو بے اختیار ہونے سے نہ روک سکا۔

وہ سیاہ کامدار لانگ شرٹ کے ساتھ سیاہ ٹراؤزر اور گلے میں باریک سا دوپٹہ ڈالے ایک مکمل لڑکی لگ رہی تھی جس کے پاس اس وقت کسی کا دل دھڑکانے کا تمام سامان موجود تھا۔

تھوڑی دیر اور دیکھتا تو یقیناً" اظہار محبت کر ڈالتا' جو فی الحال مناسب نہیں تھا اور مناسب یہی تھا کہ وہ نظر چرا لیتا' سو اس نے نظریں چرا لی تھیں لیکن احساسات کو کیسے دباتا؟

ان دو سالوں میں کتنی بڑی بڑی سی لگنے لگی تھی شاید اس لیے کہ اس نے بھی عام لڑکیوں کی طرح پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا۔ وہ بھی صرف ایزد کی چاہ میں...!

"آپ کے مہمان چلے گئے؟" اس نے ایزد کو خاموش دیکھ کر دوبارہ سوال کیا۔ وہ اسی سحر میں کھویا اس کا سوال نہ سن سکا۔

"ایزد...! میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" اس نے ایزد کے کندھے کو آہستگی سے ہلایا۔

"ہوں! بولو کیا پوچھ رہی ہو؟" وہ چونک کے متوجہ ہوا لیکن نظر ایک بار پھر کشمالہ کے چہرے پہ جا ٹھہری۔ اس کے ہونٹوں پہ نیچرل کلر کی لپ اسٹک سجی ہوئی تھی۔ رخسار ویسے ہی گلابی تھے اس لیے اسے کسی بلش آن کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔

"آپ کے مہمان چلے گئے؟" اس نے دوبارہ استفسار کیا۔

"کون سے مہمان...؟ وہ غائب دماغی سے بولا۔ اس وقت اس کے دل و دماغ پہ نیچرل کلر چھایا ہوا تھا۔

"ثانیہ' اجالا اور سیمہ وغیرہ۔" اس نے خفگی سے ان کے نام لیے اور ایزد کو گھورا...

"میری کچھ سمجھ نہیں آ رہا' جو کچھ پوچھنا ہے واپسی پہ پوچھ لینا۔" اس نے کہتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے کالج کے سامنے پہنچ چکے تھے اور پھر سب سے ملنے ملانے کے بعد ہی اس کا دماغ ٹھکانے پہ آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"چلو نا یار! مزا آئے گا۔" ایزد نے واپسی پہ اسے اپنے گھر چلنے کی آفر کی۔

"نہیں' میں گھر چلوں گی' پھر کبھی سہی۔" اس نے انکار کر دیا' وہ اس کے ساتھ سب کے سامنے جاتے ہوئے کترا رہی تھی۔

"ارے پھر کبھی کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟"

"نہیں بس ایسے ہی۔"

"چھوڑو یار! آؤ مام کو اپنے فنکشن کے متعلق بتاؤ۔ وہ بہت خوش ہوں گی بلکہ انہیں انتظار بھی ہوگا۔"

ایزد کے اصرار اور ضد پہ اسے اندر آنا ہی پڑا تھا۔

"تم بیٹھو' میں مام کو بلا کے لاتا ہوں۔" وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کے اوپر چلا گیا۔ لیکن گھر میں اتنا سناٹا تھا کہ جیسے گھر میں کوئی بھی نہ ہو۔

"السلام علیکم۔" کشمالہ میگزین دیکھ رہی تھی جب ثانیہ اندر داخل ہوئی۔

"وعلیکم السلام۔" کشمالہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیسی ہو؟" ثانیہ اسے سرتاپا چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"جی ٹھیک ہوں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ تم ٹھیک ہو' بلکہ اچھی خاصی ٹھیک ٹھاک ہو۔" ثانیہ کا لہجہ کافی کاٹ دار تھا کشمالہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"بیٹھو' بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔" اس نے کشمالہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن وہ تذبذب کا شکار تھی۔

"بیٹھ جاؤ' کچھ نہیں ہوتا۔ بس چند باتیں کرنا ہیں تم سے' اسی لیے آج میں واپس نہیں گئی' سب چلے گئے' میں نے سوچا میں تم سے ایک بار مل کر ہی جاؤں گی' آخر ایسا کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے کہ میرا منگیتر تمہارا دم چھلا بن کے گھوم رہا ہے۔"

ثانیہ نے پہلا تیر زبان کی کمان سے نکالا تھا اور کشمالہ کے دل میں شگاف ڈال دیا۔

"منگیتر...؟"

"ہاں میرا منگیتر' اور تمہارا دُم چھلا' ایزد آفندی۔" ثانیہ نے چبا چبا کر کہا۔ نظریں تمسخرانہ ہو رہی تھیں۔

"وہ تو کہتا ہے تم جنونی اور جذباتی ہو' ضدی اور ہٹ دھرم ہو' کسی کی بات نہیں مانتیں' اس لیے وہ تمہارے قریب رہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن تمہیں دیکھ کر تو ایسا کچھ نہیں لگ رہا۔ اچھی خاصی نارمل لڑکی ہو' باشعور اور ماڈرن۔"

ثانیہ کا اک اک لفظ آگ کی مانند تھا۔ اک ایسی

آگ جو کنسمالہ کے وجود کو بھسم کرتی جا رہی تھی۔

"سچ مچ تمہارا کوئی اسکرو ڈھیلا تھا یا پھر بنا کر رکھا تھا۔" وہ استہزائیہ انداز میں بدتمیزی سے بات کر رہی تھی۔ کنسمالہ کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

"ثانیہ!" ایزد واپس ڈرائنگ روم میں آیا تو ثانیہ کو کنسمالہ کے پاس بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"کنسمالہ کو یہاں بٹھا کر کہاں چلے گئے تھے تم اگر یہ ڈر جاتی تو۔۔۔؟ اتنی چھوٹی سی معصوم سی بچی تو ہے یہ۔"

ثانیہ کنسمالہ کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"ثانیہ! پلیز۔" ایزد ثانیہ کے تیور دیکھ چکا تھا اور کنسمالہ کے چہرے کے تاثرات بھی چھپے ہوئے نہیں رہ سکے۔

"اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟ کیا جھوٹ بولتے تھے مجھ سے؟" ثانیہ باز آنے والی نہیں تھی۔

"دیکھو ثانیہ، یہ سب کسی اور وقت پہ اٹھا رکھو۔ کنسمالہ اس وقت مارے ملنے آئی ہے اور یہ اس وقت۔۔۔"

"ہاہاہا۔ اتنا ڈر کیوں رہے ہو؟ سالاں جنونی حسینہ کے پھر سے پاگل ہونے کا ڈر ہے؟ لیکن اب تو ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو چکی ہے اور یقیناً تمہاری ماں بھی خوش ہوں گی اور اس کی ماں بھی۔۔۔؟ آخر تم اسے ٹھیک کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ سائرہ آنٹی نے تمہیں جو کام سونپا تھا تم نے کر دکھایا لیکن مجھے اتنا بتاؤ کہ تم اسے اب اور کتنا چپکا کر رکھو گے اپنے ساتھ؟ میری برداشت جواب دے چکی ہے، تم کوئی سائیکاٹرسٹ نہیں ہو کہ نفسیاتی مریضوں کا علاج کرتے پھرو، سائرہ آنٹی سے کہو یہ کام کسی اور کو سونپ دیں، بلکہ ان سے کہو کہ آپ کی بیٹی اب ٹھیک ہو چکی ہے سنبھالیں اسے یا پھر اس کی شادی کر دیں۔"

ثانیہ پھٹ پڑی تھی اور کنسمالہ ششدر سی دیکھ رہی تھی۔

"اپنی زبان بند رکھو ثانیہ! ورنہ۔۔۔ ورنہ میرا ہاتھ اٹھ جائے گا۔" ایزد غصے میں دھاڑا۔

"اچھا! اتنی تکلیف ہو رہی ہے تمہیں؟ تو [illegible] تھے تم نے یہ سب سائرہ آنٹی کے کہنے پہ کیا یا [illegible] کے کہنے پہ کنسمالہ سے دوستی کی اور اس کے اتنے قریب ہو گئے؟ یاں تمہیں دیکھ کر تو سب رہتے۔ تم خود ہی بے ایمان تھے۔۔۔" ثانیہ اس سے [illegible] اونچی آواز میں دھاڑی۔ ایزد غضب ناک ہو گیا تھا۔

ایزد نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا، کنسمالہ کو تو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی سماعتوں میں تو بس ثانیہ کے الفاظ کی بازگشت ہو رہی تھی۔ وہ وہاں سے مرے مرے قدم اٹھاتی باہر نکل آئی لیکن جب وہ گیٹ سے باہر نکلی تو اس کا تمام ضبط جواب دے گیا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ تمام راستے روتی اور اپنی چیخوں کو دباتی بھاگتی ہوئی گھر پہنچی اندھا دھند بھاگتے ہوئے اسے راستے میں بار بار ٹھوکر بھی لگی اور کئی بار وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔ کئی لوگوں نے اسے حیران کن نظروں سے دیکھا تھا۔ سائرہ حیدر کی بیٹی کو کیا ہوا، یوں لٹ رہا تھا جیسے سب کچھ [illegible] اپنی نسوانیت کا [illegible] آئی تھی۔

ایزد [illegible] نے اس کے ساتھ کھیل کھیلا تھا [illegible] کتنی آسانی سے اس کے ہاتھ کھلونا بن گئی اور [illegible] ذات کو ایک کھلونے کی شکل میں [illegible] کی اذیت ایسی تھی کہ وہ چیخوں سے روتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ چوکیدار اور باقی ملازم بھی گھبرا گئے تھے لیکن وہ چپ چاپ بھی دیکھے بغیر سیدھی اپنے بیڈ روم میں گئی۔ بیڈ روم کا دروازہ دھڑام سے بند ہوا اور پھر رات بھر دروازہ نہ کھلا۔

سائرہ حیدر نے بھی کئی بار دروازہ بجایا۔

ایزد بھی آیا تھا، وہ بھی اسے دروازہ کھولنے پہ اصرار کرتا رہا، کمرے سے چیزوں کی اٹھا پٹخ کی آوازیں آتی رہیں لیکن کنسمالہ کی آواز سنائی نہیں دی۔

اس نے اپنے کنٹیکٹس پہ لکھے شاہ نواز حیدر کے موبائل نمبر کو نوٹ کیا اور انہیں کال ملائی۔

فجر کا وقت تھا جب اس نے فون کیا تھا اور صبح [illegible] بجے کا وقت تھا، جب وہ اسلام آباد اس کے گھر [illegible]

[illegible] پہنچ گئے تھے اور ان کی آمد پہ وہ اپنے کمرے سے نکلی اور ہمیشہ کے لیے ان کے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی۔

سائرہ حیدر نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا لیکن کنسمالہ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔

وہ بھی اس کے تیور دیکھ چکی تھیں، انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ یہ بازی بھی ہار گئی ہیں۔

☆ ☆ ☆

رحمان حیدر اور سلطان حیدر صرف دو ہی بھائی تھے۔ ماں باپ نے دونوں کی شادیاں کیں تو دونوں اپنی اپنی زندگی میں مگن ہو گئے۔ رحمان حیدر کا بیٹا شاہ نواز حیدر پیدا ہوا تو ان ہی دنوں ان کا سارا کاروبار دیوالیہ ہو گیا تھا۔ اپنے کاروبار کا صدمہ کچھ ایسا ہوا کہ رحمان حیدر بستر سے لگ گئے۔ سلطان حیدر کو بھائی کے حالات کا پتا چلا تو وہ انہیں اپنے ساتھ ہی اسلام آباد لے آئے لیکن پھر بھی وہ سنبھل نہ سکے۔ نئے حالات اور پھر بیوی کی اچانک موت ان سے برداشت نہ ہو سکی اور یوں وہ بھی شاہ نواز حیدر کو چھوڑ کر چلے گئے۔

یوں شاہ نواز حیدر کی ساری ذمہ داری اپنے چچا سلطان حیدر پہ آ گئی۔ انہوں نے اپنی بیٹی سے بڑھ کے بھتیجے کو پیار دیا اور پالا پوسا اور اسی چیز کو سائرہ حیدر ناپسند کرتی تھیں۔ انہیں شاہ نواز حیدر خار کی طرح کھٹکتا تھا کیونکہ وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ کے منہ سے یہ ذکر سن چکی تھیں کہ وہ سائرہ کی شادی شاہ نواز سے کریں گے اور جب ایک روز انہوں نے باقاعدہ بات کی تو سائرہ نے صاف انکار کر دیا لیکن وہ بھی کافی ذہین اور سمجھ بوجھ رکھنے والے آدمی تھے۔ انہوں نے محض یہ کہہ کر کہ اگر وہ شاہ نواز سے شادی نہیں کرے گی تو وہ اسے اپنی تمام جائیداد سے عاق کر دیں گے اور ساری جائیداد کا حق دار شاہ نواز ہو گا، بات ختم کر دی اور اس مقام پہ آکر سائرہ حیدر بے بس ہو گئیں۔ وہ اتنی زیادہ دولت و جائیداد سے دستبردار نہیں ہونا چاہتی تھیں لیکن وہ شاہ نواز حیدر کو بھی اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بنانا چاہتی تھیں۔

وہ آزاد رہنا چاہتی تھیں۔ گھر، شوہر اور بچوں کے جھنجٹ سے بالکل آزاد، لیکن باپ نے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی، انہیں مجبوراً یہ زنجیر پہننا ہی پڑی۔

کنسمالہ پانچ سال کی تھی جب سلطان حیدر بھی خالق حقیقی سے جا ملے اور تب سائرہ حیدر کے اندر کا زہر اُمڈ کے باہر آنے لگا۔ انہوں نے مستقل طنز و تحقیر کا نشانہ بنا لیا شاہ نواز حیدر کو۔ اور اس سب کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ سائرہ حیدر کے مقابلے میں ذرا کم شکل تھے اسی لیے وہ انہیں اپنے قابل نہیں سمجھتی تھیں، سلطان حیدر کی وفات کے بعد سائرہ نے خود آفس جوائن کر لیا۔

شاہ نواز نے انہیں اس کام سے روکنا چاہا تو انہوں نے انہیں دھتکار کے رکھ دیا۔

غربت، کنگالی اور نحوست کے ایسے طعنے دیے کہ وہ شرمندہ ہو کے رہ گئے۔ کنسمالہ باپ سے بہت مانوس تھی۔ ماں کو ان کے ساتھ لڑتے جھگڑتے دیکھتی تو ماں سے متنفر ہو جاتی تھی کیونکہ سائرہ جب شاہ نواز پہ غصہ نکالتی تھیں تو کوئی احتیاط نہیں کرتی تھیں کہ ان کی معصوم بچی سب دیکھ، سمجھ رہی ہے اور سب سن بھی رہی ہے اور ان کی یہی بے احتیاطی کنسمالہ کو بے حس کر گئی۔ وہ گم صم رہنے لگی تھی۔ اور اس وقت تو حد ہی ہو گئی جب شاہ نواز حیدر نے سائرہ حیدر کو طلاق دی تھی وہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے مجھے طلاق دے دی شاہ نواز۔۔۔؟"

انہیں جیسے یقین تھا کہ شاہ نواز کبھی انہیں طلاق نہیں دیں گے، چاہے وہ انہیں کتنا ہی روندتی رہیں۔ وہ کبھی سر نہیں اٹھائیں گے، لیکن یہ بھی ان کی خوش فہمی ثابت ہوئی تھی۔

"ہاں! میں نے تمہیں آزاد کر دیا ہے، تم نے مجھ سے شادی کی تھی اپنی دولت اور جائیداد حاصل کرنے کے لیے، لیکن میں نے تم سے شادی کی تھی اپنے چچا جان کی زبان کی لاج رکھنے کے لیے۔۔۔ شادی کے بعد تمہیں دولت اور جائیداد مل گئی اور میں نے چچا جان کی زبان کا پاس رکھ لیا اس لیے اب ہمارا گزارا مشکل ہے۔

تم اپنی زندگی جیو اور میں اپنی' لیکن پلیز میری ایک ریکویسٹ ہے تم سے کہ میری کشمالہ کو میرے ساتھ جانے دو' میں خود اس کی پرورش کروں گی' تم پہ کوئی ذمہ داری نہیں رہے گی' تم آزاد ہو گی' ہمیشہ کے لیے بس میری بیٹی کو میرے ساتھ رہنے دو' وہ مجھ سے بہت اٹیچڈ ہے' وہ نہیں رہ پائے گی میرے بغیر۔"

سائرہ حیدر ابھی طلاق کا صدمہ ہی نہیں بھول پائی تھیں کہ شاہ نواز حیدر کی دوسری فرمائش پہ بم کی طرح پھٹ پڑیں۔

"کیا کہا؟ میں۔ میں کشمالہ کو تمہارے حوالے کردوں؟ تمہیں دے دوں اتنی آسانی سے۔۔۔؟" وہ پاگل ہی تو ہوا ٹھی تھیں اور پھر شاہ نواز کی لاکھ کوشش کے باوجود بھی انہوں نے کشمالہ کو ان کے ساتھ نہیں جانے دیا۔ یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی نے بچی پہ کیا اثر ڈالا ہے۔ انہیں کشمالہ کو اپنے پاس رکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا بس ضد تھی اور یہ ہی ضد آج بھی قائم تھی' نتیجتاً کشمالہ بھی ضدی اور ہٹ دھرم ہوتی چلی گئی۔

اس کی شخصیت میں ایک خلا رہ گیا تھا جسے ایزد کی محبت' توجہ اور دوستی نے پُر کر دیا تھا۔ اسے ماں باپ کی محبت نہ ملی تو وہ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگی تھی سائرہ حیدر کو زچ کرنے کے لیے اور توجہ حاصل کرنے کے لیے۔۔۔ اور جب یہ ہی توجہ اور محبت ایزد نے اسے دی تو وہ اس کی ہو گئی تھی لیکن آج جب اسے پتا چلا کہ وہ جس محبت کے پیچھے بھاگی ہے' وہ بھی بناوٹی ہے اور سائرہ حیدر کا ایک ڈرامہ تھا تو وہ حقیقتاً "بکھر" گئی تھی۔۔۔!

"اب وہ اس ماں کے پاس ہرگز نہیں رہنا چاہتی تھی جس نے اسے راہ راست پہ لانے کے لیے ایزد کی مدد لی تھی۔

☼ ☼ ☼

آفس کی بلڈنگ سے کچھ دور ہی اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے مینجر صاحب کی گاڑی نکلی تھی۔ انہوں نے ایکسیڈنٹ ہوتے دیکھا تو فوراً" سے پیشتر ایزد کو فون کیا۔ خود وہاں سب سے پہلے پہنچنے والا بھی ایزد ہی تھا' ایمبولینس کے پہنچنے تک ایزد ہوش و خرد سے بیگانہ اور خون میں لت پت کشمالہ کو گاڑی سے نکال چکا تھا۔

گاڑی سے نکلنے کے بعد اس کی حالت دیکھی تو ایزد آفندی کا دل مٹھی میں آ گیا تھا۔

"کشمالہ۔۔۔ کشمالہ! آنکھیں کھولو۔" اس نے دیوانہ وار اس کے رخسار تھپکے۔ اس کو اٹھانے اور باہر نکالنے کی کوشش میں وہ خود بھی اس کے خون میں بھر گیا تھا۔

"پیچھے ہٹیں صاحب! میڈم کو ایمبولینس میں ڈالنے دیں۔" مینجر صاحب نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا۔

"م۔۔۔ میں خود اسے گاڑی میں ڈالتا ہوں۔" اس نے عجیب گھبرائے ہوئے انداز میں کہا اور کشمالہ کو اٹھا کے ایمبولینس میں ڈالا۔ باقی پیچھے سب کچھ مینجر صاحب نے ہی سنبھالا۔ وہ خود ایمبولینس میں اس کے ساتھ ہی ہسپتال چلا گیا تھا۔ شاہ نواز حیدر کو بھی اطلاع مل چکی تھی۔ ان کی فیملی بھی بدحواسی میں ہسپتال پہنچی۔

"ایزد۔! کشمالہ کہاں ہے؟" شاہ نواز حیدر کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"آئی سی یو میں ہے۔" ایزد کے لہجے میں شکستگی اتر آئی تھی۔

"کیسے ایکسیڈنٹ ہو گیا اس کا۔۔۔؟ وہ۔۔۔ وہ اتنی رش ڈرائیونگ کیوں کر رہی تھی۔؟ تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میٹنگ کے بعد گھر آ رہی ہے۔ پھر۔۔۔ پھر یہ اچانک۔؟"

شاہ نواز حیدر کے حواس ان کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ وہ ایزد کے کپڑے خون میں بھرے دیکھ کر ہی کشمالہ کی حالت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ اس کا اتنا خون بہا تھا تو یقیناً" ایکسیڈنٹ بھی تو اتنا ہی شدید ہوا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے شاہ نواز صاحب!"

ایزد کہتے ہوئے کرسی پہ ڈھے گیا۔ امینہ بیگم اور شاہ نواز حیدر چونک گئے۔

"میں واقعی اس کا مجرم ہوں۔۔۔ لیکن شاہ نواز صاحب! مجرم کو معافی بھی تو دی جا سکتی ہے؟" وہ عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا اور شاہ نواز حیدر پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

تو اس کا مطلب تھا کشمالہ کے اتنے دنوں کی ڈسٹربنس کا اصل ذمہ دار ایزد آفندی تھا بلکہ ایزد آفندی تو اور بھی کئی باتوں کا ذمہ دار تھا۔۔۔

"تم۔۔۔؟" وہ بہت کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن باوجود کوشش کے کہہ نہ سکے۔۔۔

"ہاں میں! پچھلے پانچ سال سے انتظار کر رہا ہوں کہ وہ مجھے معاف کرنے کے قابل ہو جائے تو پھر معافی مانگوں گا' آج سوچا کہ وہ اس قابل ہو چکی ہے' وہ سمجھ دار ہو گئی ہے' میری بات کو سمجھ جائے گی لیکن نہیں' وہ آج بھی وہی کشمالہ ہے' نادان اور نا سمجھ۔ آج بھی اس نے اپنا وہی بچپنا اور وہی ضدی پن دکھایا ہے' وہ آج بھی مجھ سے دور جانے کے لیے بھاگ گئی۔"

ایزد تھکے تھکے شکست خوردہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ شاہ نواز حیدر اس کی بات کو کسی نہ کسی حد تک سمجھ چکے تھے اور ان کے اندر کا تجسس بھی ختم ہو گیا تھا اور ان کی سوچوں کی الجھی ہوئی گتھی بھی سلجھ گئی تھی۔ وہ بھی ایزد کے برابر ہی بنچ پہ بیٹھ گئے۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ امینہ بیگم نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

"کشمالہ' میری جان' میری گڑیا۔!" وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی' جب اس شناسا سی آواز پہ اس نے بمشکل پلکیں کھول کے دیکھنے کی کوشش کی۔

"مام۔؟" اس کے لبوں نے غیر محسوس سی حرکت کی تھی اور اس حرکت سے ہی پہچانا جا رہا تھا کہ اس نے "مام" کہا ہے۔۔۔

"جی میری جان! آنکھیں کھول کے دیکھو میں ہوں تمہاری مام' تمہاری مجرم' تمہاری گناہ گار' تمہیں محرومیوں میں دھکیلنے والی۔۔۔ بے حس اور بدنصیب ماں۔۔۔"

سائرہ حیدر اس کا ہاتھ تھام کے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے رو رہی تھیں' شاہ نواز حیدر سر جھکا کر باہر نکل گئے لیکن مسز آفندی نے آگے بڑھ کے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔۔۔

"گزری باتوں کو بھول کر تم اس وقت اپنی بیٹی کی زندگی اور صحت کی دعا کرو۔"

"کیسے بھلا دوں ان باتوں کو؟ اپنی ان ہی باتوں کی وجہ سے تو اکیلی رہ گئی ہوں' پانچ سالوں سے تنہا زندگی گزار رہی ہوں۔"

سائرہ حیدر بلند آواز سے روتے ہوئے اپنی غلطیاں اپنے گناہ' اپنی کوتاہیاں یاد کر رہی تھیں۔

"مام۔۔۔" اب کی بار کشمالہ نے پکارا تو آواز بلند تھی لیکن پلکیں موندی ہوئی تھیں اور بند پلکوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"آئی مس یو مام!" اس کی آواز بھیگ رہی تھی اور سائرہ حیدر نے بے ساختہ اٹھ کے اسے سینے سے بھینچ لیا۔

"آئی مس یو ٹو میری جان' آئی مس یو ٹو۔" وہ اس کا چہرہ والہانہ انداز میں چوم رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پورے ایک ہفتے کے بعد کشمالہ ڈسچارج ہو کے گھر آئی تو مسز آفندی' احمد آفندی اور ایزد آفندی اس کی عیادت کے لیے باقاعدہ گھر آئے تھے جس پہ شاہ نواز حیدر اور امینہ بیگم بہت خوش تھے۔ انہوں نے ان لوگوں کی خوب آؤ بھگت کی تھی یہ دیکھے اور سوچے بغیر کہ ان کی بیٹی کتنی خفا اور بدظن ہے۔

"کشمالہ کہاں ہے بھائی صاحب؟" مسز آفندی نے کافی دیر بعد پوچھ ہی لیا۔

"اپنے کمرے میں ہے۔"

"ابھی ٹھیک سے چل پھر نہیں سکتی' کمزوری اور

سب تو ایک بہانا ہے۔ وہ آفس میں داخل ہوا تو کسی ورکر کی آواز پہ قدم رک گئے۔
"انگیجمنٹ کی پارٹی تو یقیناً" بہت بڑی ہوگی۔ پورے شہر کی کریم جمع ہوگی پارٹی میں۔" دوسرے ورکر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ایزد کو تو جیسے کرنٹ چھو گیا تھا۔
"**کشمالہ کی انگیجمنٹ**۔۔" اس کا دماغ گھوم گیا۔ وہ دندناتا ہوا سیدھا کشمالہ کے روم میں جا پہنچا۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے فیملی کے ساتھ اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ کشمالہ ٹھیک ہو چکی تھی اس لیے آفس اس نے سنبھال رکھا تھا لیکن آج آفس میں داخل ہوتے ہی جو خبر اسے ملی تھی وہ اس کے لیے کسی بم سے کم نہیں تھی۔
"یہ سب کیا سن رہا ہوں میں۔۔؟" ایزد کے انداز میں عجیب طرح کا غصہ تھا جس میں بے بسی کی آمیزش تھی۔ کشمالہ کسی فائل پہ جھکی سائن کر رہی تھی۔ اسے اپنے سامنے اتنے استحقاق اور غصہ بھرے انداز میں دیکھ کر غصہ آیا۔
"تمیز سے بات کریں مسٹر ایزد آفندی! یہ میرا آفس ہے۔" وہ ناگواری سے بولی۔
"جانتا ہوں کہ یہ آفس ہے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آفس میں باتیں کیسی ہو رہی ہیں؟" وہ ٹیبل پہ دونوں ہاتھ جما کے اس کی سمت جھکا۔
"کیسی باتیں ہو رہی ہیں؟" وہ الٹا اس سے پوچھ رہی تھی۔
"تمہاری انگیجمنٹ کی باتیں ہو رہی ہیں۔" وہ جوابا" غضب ناک لہجے میں بولا۔ اس کی ساری تحمل مزاجی ہوا ہو چکی تھی۔ وہ غیض و غضب سے بھرا ہوا تھا۔
"او ہاں! میری انگیجمنٹ کی باتیں' ظاہر ہے سب کو انوائیٹ کیا ہے تو سب باتیں تو کریں گے ناں۔۔ اینی وے میں نے آپ کو بھی انوائیٹ کرنا تھا لیکن آپ یہاں نہیں تھے اس لیے نہیں کیا تھا' یہ لیجیے میری طرف سے میری انگیجمنٹ کا انویٹیشن کارڈ۔"
اس نے ٹیبل کی دراز سے ایک ریڈ اور سلور کی ٹیشن کا خوب صورت سا نفیس کارڈ نکال کر اس کی سمت بڑھایا۔
"بھاڑ میں گئیں تم' اور بھاڑ میں گیا تمہارا کارڈ۔" اس نے کارڈ دو بیچ کر پھاڑا اور کشمالہ کے چہرے پہ اچھال دیا۔ وہ اس کی حرکت پہ سٹپٹا گئی۔
"تم کیا سمجھتی ہو کہ تمہارے ہجر میں مرا جا رہا ہوں میں۔۔؟ تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی تو میں کبھی شادی نہیں کروں گا؟ پاگل ہوں؟ دیوانہ ہوں تمہارے لیے؟" ہونہہ! غلط فہمی ہے تمہاری اور بہت جلد تمہاری غلط فہمی دور بھی کر دوں گا۔"
وہ دانت پیستے ہوئے یوں غضب ناکی سے بول رہا تھا جیسے وہ واقعی مرعوب ہو جائے گی۔
"میری غلط فہمی دور ہو چکی ہے مسٹر ایزد آفندی! اس لیے برائے مہربانی آپ یہاں سے جا سکتے ہیں۔" وہ بھی اپنی کرسی سے کھڑی ہو چکی تھی۔
"اور ہاں! [illegible] آپ کے گھر والوں کو بھی انوائیٹ کیا ہے [illegible] آپ بھی ضرور آیئے گا [illegible] آپ کو اپنے منگیتر سے ملواؤں گی' آپ سے کم نہیں ہے وہ۔" [illegible] میز کے قریب رکھی کرسی کو زوردار ٹھوکر مارتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

آج فرائیڈے تھا' دس جنوری کی شام تھی۔ کشمالہ کی انگیجمنٹ بھی آج ہی۔۔ وہ بے نیاز تھا۔ اسی لیے اس نے کوئی تاریخ وغیرہ بھی نہیں پوچھی تھی لیکن مسز آفندی سے دو روز پہلے فون پہ بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ جمعہ کو کشمالہ کی منگنی کی رسم ہے' شاہ نواز حیدر اور امینہ بیگم نے آنے کے لیے اصرار کیا ہے اس لیے ان کا بھی منگنی میں شریک ہونے کا ارادہ ہے۔
البتہ ایزد کا اس انگیجمنٹ میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اسی لیے وہ اپنے کمرے میں منہ سر لپیٹے پڑا رہا۔

لیکن مسز آفندی بھی بڑی بامروت خاتون تھیں۔ انہوں نے فون کرکے ایزد کو سرزنش کی کہ لوگ کیا سوچیں گے اس لیے تمہیں جانا چاہیے اور اتنا اصرار کیا کہ اسے اٹھنا ہی پڑا۔

"ہونہہ! میری ماں بھی عجیب ہے' جانتی بھی ہیں کہ اس کی منگنی سے میرے دل پہ کیا گزر رہی ہے پھر بھی مجھے جانے کا اصرار کر رہی ہیں۔" وہ بے دلی سے تیار ہو کر باہر نکل آیا۔

"ہونہہ! ویسے وہ سوریا دکھنا تو چاہیے' جو مجھ سے کم نہیں ہے اس کے لیے۔"

ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس کے ذہن میں اک تمسخرانہ سا خیال آیا تھا اور گاڑی کی اسپیڈ قدرے بڑھا دی تھی لیکن راستے میں آکر اسے یاد آیا کہ اسے تو میرج ہال کا معلوم ہی نہیں۔ مجبوراً اس نے شاہ نواز حیدر کو فون کیا۔

"انکل! انگیجمنٹ کون سے ہال میں ہے؟"
اس کے سوال پہ شاہ نواز حیدر کو حیرانی ہوئی تھی۔

"تم نے کارڈ پہ نہیں دیکھا؟"

"سوری انکل! میں نے غور نہیں کیا۔" اس نے معذرت کی۔

"غور کر لیتے تو اچھا تھا' خیر ابھی بھی پوچھ لیا ہے تو بہتر کیا ہے۔" انہوں نے نرمی سے کہا اور اسے ہال کا بتا کر فون بند کر دیا۔ اگلے دس منٹ میں وہ مطلوبہ ہال میں پہنچ چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں یہ چکا چوند روشنیوں کی نہیں رشتوں کی تھی۔ مسز آفندی کشمالہ کے پاس اسٹیج پہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ عریشہ آپی' اپنے ہزبینڈ اور بچوں کے ساتھ براجمان تھیں۔ فہد آفندی بھی اپنی بیوی اور بچوں کے جھرمٹ میں نظر آ رہے تھے۔ احمد آفندی کے قہقہے ابل رہے تھے اور ان کے قہقہوں کی وجہ اپنا بیٹا "ایزد آفندی" تھا جو ہال کے داخلی دروازے میں ہونق بنا کر کھڑا تھا۔

"ارے آؤ' آؤ بیٹا' تم آ گئے' بس اک تمہاری ہی کمی تھی۔"

ان ایزد کو اندر لے آئے اور وہ اپنے گرد سب کو دیکھ کے سوچ رہا تھا کہ وہ کیوں "بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانے" کی طرح ہو گئے ہیں؟ کشمالہ کی فیملی سے زیادہ وہ لوگ خوش نظر آ رہے تھے۔

"آؤ بیٹا ادھر اسٹیج پہ بیٹھو کشمالہ کے ساتھ۔" سائرہ حیدر نے ایزد کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"اسٹیج پہ؟ کشمالہ کے ساتھ۔؟" وہ ٹھٹک گیا۔

"ارے ہاں بیٹا کافی دیر ہو چکی ہے۔ مہمان کب سے انتظار کر رہے ہیں' چلو شاباش جلدی سے انگوٹھی پہناؤ اسے۔" ان کے کہنے۔ وہ بدک گیا اس کی حرکت پہ سب کے منہ سے قہقہے ابل پڑے ایزد کا اسٹاف دنگ تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناں بیٹا! بہت پاپڑ بیلنا پڑیں گے۔"

مسز وٹ نے قریب آ کے کہا تو ایزد ہکا بکا رہ گیا۔ وہ حیران پریشان ہو رہا تھا کہ آخر اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔؟

"آپ اپنی اور تمام لوگ میرے ساتھ مل کر مجھے بے وقوف بنا سکتے تھے تو کیا میں اپنی اور آپ کی فیملی کے ساتھ مل کر آپ کو بے وقوف نہیں بنا سکتی تھی۔؟" لٹ کشمالہ کے ساتھ اسٹیج پہ لا کر بٹھایا گیا تو کشمالہ بولی۔

"مگر یہ سب کایا پلٹ ہوئی کیسے؟" اس کے اندر سوال اٹھ رہے تھے۔

"یہ کایا پلٹ تو اسی وقت ہوئی تھی جب کشمالہ ہسپتال میں تھی۔" مسز آفندی مسکرا کے بولیں۔

"وہ کیسے؟"

وہ ایسے کہ میں نے کشمالہ کو سب باتیں بتائیں' تمہاری محبت اور دیوانگی کے قصے سنائے اور اسے ریکویسٹ کی کہ وہ میرے بیٹے کو معاف کر کے اپنا لے۔ پھر۔؟"

"پھر کیا؟ پھر وہ مان گئی' بہت اچھی بچی ہے میری' اللہ نصیب اچھے کرے۔"

"لیکن وہ اس روز جو کچھ اس نے اپنے گھر میں مجھ سے کہا؟"

"بس تھوڑا سا ڈرامہ تھا اور تھوڑا سا غصہ۔" مسز آفندی سہولت سے سب بتاتی جا رہی تھیں۔

"مگر جب اس نے سب کو انویٹیشن کارڈ دیے تو سب نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا۔؟"

"سوری سر! میڈم نے بتانے سے منع کیا تھا۔"
اس کا سوال کسی نے سن لیا تھا' اسی لیے تمام اسٹاف والوں نے ہنستے ہوئے کورس میں جواب دیا تھا۔

"اور جو کارڈ میں نے آپ کو دیا' وہ تو آپ نے دیکھا ہی نہیں' اور مجھے ہنڈریڈ پرسینٹ امید تھی کہ آپ وہ کارڈ نہیں دیکھیں گے اور ایسا ہی ہوا تھا۔" کشمالہ نے آہستگی سے لقمہ دیا۔ "اسی لیے تو کہتے ہیں کہ غصے میں عقل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولتی اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"لیکن یار! آج تو بتا دیا تھا' میری حالت دیکھی ہے تم نے؟ میں کم از کم تیار ہو کے تو آتا۔"

"وہ تھا جو رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی' کپڑے بھی ایسے ہی سادہ سے تھے' بالوں کی کوئی خاص ترتیب نہیں تھی۔ بے حد عام سا حلیہ تھا' پورا پورا مجنوں لگ رہا تھا' جبکہ وہ اس کے پہلو میں بیٹھی فیروزی مدار رنگا پہنے نفیس سی دلہن بنی حوروں کو مات دے رہی تھی۔

ایزد کی نظروں میں وارفتگی اتر آئی تھی۔ کشمالہ نے نظر چرا کر چہرہ جھکا لیا اور اس کے چہرے کے ساتھ ایزد نے جھکتے ہوئے اس نے شعر پڑھا تھا۔

نہ نگاہ پھیر ساقی' نہ برت بے نیازی!
تیرے پاس آئے ہیں ہم کئی راستے بدل کے

کشمالہ اس کے شعر پہ مسکرا دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسے انگوٹھی پہنا کر فارغ ہوا تو سائرہ حیدر نے دونوں کی نظر اتاری اور سب کے ساتھ ہال میں جا کر بیٹھ گئی تھیں کیونکہ اب رسمیں کرنے کا حق مسز آفندی اور اسینہ بیگم کو تھا' جو مائیں ہونے کا حق ادا کرتی پھر رہی تھیں۔

آج صبح انہوں نے واپس اسلام آباد چلے جانا تھا۔ انہیں کشمالہ نے بلایا تھا اور وہ غیروں کی طرح آ گئی تھیں۔!

سب لوگ اپنی باتوں میں مگن تھے اور دولہا دلہن اپنی محبتوں میں گم تھے۔

"اب بتاؤ میرے بیڈ روم میں جاؤ گی یا نہیں؟" ایزد کے معنی خیز سے سوال پہ اس کا چہرہ بلش ہو گیا تھا۔

"بتاؤ ناں جاؤ گی؟"
وہ اصرار کر رہا تھا۔"

"ہاں! مجبوری ہے' کیونکہ اب آپ کا بیڈ روم میرا بھی بیڈ روم ہو گا۔" اس نے جواب تو دیا تھا مگر دلیل کے ساتھ۔

"ہاہاہا" ایزد فلک شگاف قہقہہ لگا کے ہنسا۔ سجی سنوری دلہن کے ساتھ اسٹیج پہ ملنگ سا دولہا دیکھ کر باقی سب بھی مسکرا رہے تھے۔ سچویشن ہی کچھ ایسی تھی دلچسپ اور خوش گوار۔ جذبوں' چاہتوں اور محبتوں سے بھرپور۔!

☆
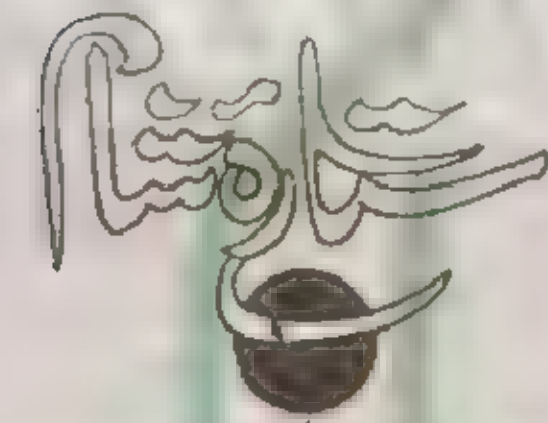
دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اُگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے جو وہ اپنے چھ مربعہ زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ، اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مُردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دُعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوبصورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی جنت کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ بہتر مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دُنیا آباد رکھتا ہے۔ بوڑھی اس کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آدھی رات کو پہنچتا ہے۔ پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے جنت بی بی حراست میں ہے۔ جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگ کر پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت بی بی شیزوفرینیا کی مریض ہے جس کی شادی بھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی وفات جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کر گئی ہے جسے اس نے نوکروں کے سہارے میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ ۱۹ سال بعد اپنی بیٹی مادی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتلائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ تربت دیال ملنسار، مہذبی خاتون ہیں۔ دلی، وید اور انیبان کے بچے ہیں۔ مادی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آپ کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہے... وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔"

فیضان نے پلٹ کر ثمینہ کو خفگی و غصے سے دیکھا۔ وہ خود سر ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھیں۔ فیضان بے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے پھر ان کے کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

"کیا ضرورت تھی تمہیں فیضان کے سامنے یہ کہنے کی... اس لیے تمہیں یہ بات بتائی تھی میں نے؟" ثمینہ نے غصے سے کہا تھا۔

"اب آپ بھی مجھے ہی ڈانٹ لیں۔ میں ہی پاگل ہوں جو آپ کے بھائی کی زندگی میں خوشیاں لانے کے لیے اپنا وقت برباد کر رہی ہوں۔" ہادی نے غصے سے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا اور زور زور سے کارن فلیکس والے پیالے میں چمچ مارنے لگی۔

ثمینہ نے پر سوچ انداز میں اسے دیکھا اور پوچھنے لگیں۔

"ہادی! سچ سچ بتاؤ۔ کیا تم نے ہی انبیا کے دل میں فیضان کا خیال ڈالا ہے؟"

"کم آن ممی!... "ہادی چڑ گئی۔ "فیضان ماما میں کس چیز کی کمی ہے کہ ایک باشعور خوب صورت لڑکی ان کے متعلق نہ سوچے...؟ اتنا ہی لڑکیوں سے بیزار ہیں تو ان کو چاہیے عورتوں کی طرح پردہ کر کے گھر میں بیٹھیں... باہر نکلنا چھوڑ دیں... بتاؤ... ہیرو بنے گھوم رہے ہیں اور چاہتے ہیں کوئی لڑکی ان کی طرف دیکھے بھی نہیں۔"

اس نے سر جھٹکا اور چمچ بھر کر نوالہ منہ میں ڈالا۔ ثمینہ نے چھری چاپنگ بورڈ پر رکھی اور گہری سانس بھر کر واش بیسن کی طرف بڑھیں تب ہی ہادی کو کچھ خیال آیا۔

"ممی! آپ کے پاس پھپھی جان کا ایڈریس ہے؟"

"چلو! اب اپنی پھپھی کو ڈھونڈنے نکل پڑو۔" ثمینہ نے ہاتھ دھوتے ہوئے ... کہا ... تمہاری عمر کے تین چار بچے ہوں گے اس کے... تب ابی کی شادی میں ہوئی تھی فیضان ... بیٹھی ہوئی ... احمق! ... تم دونوں تو ... کر کے چھوڑو گے۔"

ثمینہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی کچن سے باہر نکل گئیں۔ ہادی نے ایک اور بڑا سا چمچ منہ میں ڈالا۔ اس کے چہرے پر سوچ کا عکس دکھائی دیتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ثمینہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوئیں۔ فیضان الماری کے قریب کھڑے ... موڑ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بیڈ پر فیضان کا دستی بیگ کھلا پڑا تھا اور کچھ سامان بکھرا ہوا تھا۔ غالباً یہ دبئی روانگی کی تیاری تھی۔

"کب جانا ہے؟" ثمینہ نے گلا کھنکھار کر صاف کرتے ہوئے جھجک آمیز لہجے میں پوچھا۔

"پرسوں... صبح۔" سرد مہری سے جواب آیا۔

"پیکنگ ہو گئی؟"

"نہیں... کر رہا ہوں۔" سابقہ انداز۔

"میں مدد کروں؟"

"جتنی آپ کر چکیں وہی بہت ہے۔" ترشی و سرد مہری سے کہتے ہوئے فیضان نے ہاتھ میں پکڑی قمیص گول مول کر کے دستی بیگ کے کھلے منہ میں ٹھونس دی۔

ماتھے پر بل، آنکھوں میں غصہ۔

"آئی ایم سوری فیضان!" ثمینہ نے شرمندگی سے کہا۔

"بس کریں ثمینہ آپا!" فیضان نے سلگ کر کہا تھا۔ "کیسی محبت ہے آپ کی کہ میرا ایک راز نہیں سنبھال سکیں؟ کم عمر تھا میں، نا سمجھ تھا، کم عقلی میں اگر کوئی بات منہ سے نکل بھی گئی تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ آپ اسے میری ساری زندگی کے لیے طعنہ بنا دیں۔ میں بھول چکا ہوں جو بات... آپ بھی اسے بھول کیوں نہیں جاتیں؟"

"خدارا... فیضان! اتنے بدگمان نہ ہو۔" ثمینہ نے تیزی سے کہا۔

"میں نے ہادی کو یہ بات محض اس لیے بتائی... کیونکہ میرا خیال تھا وہ تمہارے انٹرسٹ کا سن کر چپ ہو جائے گی... مجھے کیا پتا تھا، وہ پھر بھی عقل نہیں پکڑے گی۔ بعض اوقات تو ہادی حد کر دیتی ہے۔ پتا نہیں کیا سوچ کر اس نے انبیا کے ذہن میں تمہارا خیال ڈالا۔" ثمینہ نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ غلط بیانی کرتے ہوئے اتنی نظریں تو سب ہی چرا لیتے ہیں۔

"اس کا مطلب ہے میرا شک صحیح تھا۔ یہ ہادی کا ہی کارنامہ ہے۔" فیضان نے دانت کچکچا کر کہا۔

"میں نے پوچھا تھا ہادی سے، مان تو نہیں رہی لیکن میرا خیال ہے ایسا ہی ہے، ویسے فیضان! اس نے جو بھی کیا، تمہاری محبت میں کیا۔" ثمینہ نے تھوڑی سی غلط بیانی کے ساتھ ساتھ بیٹی کو بھی بری الذمہ کروانے کی کوشش کی۔

"کیسی محبت ہے بھانجی صاحبہ کی... آپ جانتی ہیں، مجھے کتنی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے انبیا سے، محض اس لڑکی کی اوٹ پٹانگ باتوں کی وجہ سے وہ بے چاری اتنی سیریس ہو گئی کہ پتا نہیں میرے بارے میں کیا کچھ سوچ چکی ہو گی... ہادی نے مجھے، حالانکہ میری کوئی غلطی بھی نہیں ہے پھر بھی انبیا کا دل توڑنے کا بوجھ میرے ہی ... رہے گا۔" فیضان حد سے زیادہ جھنجلائے ہوئے تھے۔

"فیضی! ویسے انبیا اچھی لڑکی ہے... اگر تم چاہو..." ثمینہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ فیضان نے فوراً ناگواری سے ٹوک دیا۔

"پلیز ثمینہ آپا! اب آپ ہادی کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں... انبیا کی اچھائی میں مجھے کوئی شک نہیں ہے، لیکن شادی... ناممکن، میری اور انبیا کی عمر کا فرق دیکھیں... کیا اتنے ایج ڈفرنس کے ساتھ ہم اسٹیٹل لیول تک پہنچ ہو سکے گا، جھمیلا ہے۔" فیضان نے دستی بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے قطعیت سے کہا۔ گو کہ ثمینہ کو ان کے جملے میں کئی باتیں قابل اعتراض لگی تھیں لیکن یہاں وہ فیضان کی تصحیح کرنے نہیں آئی تھیں، وہ جو کرنے آئی تھیں انہوں نے وہی کیا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ تمہیں کچھ روز کے لیے چلے جانا چاہیے... سامنے نہیں ہو گے تو انبیا سنبھل جائے گی۔ لڑکیاں بہت حساس ہوتی ہیں، سنبھلنے میں وقت لگتا ہے انہیں... پھر دانیال حسن تو یہ جان کر کہ میں اور تم ثروت کے ماضی سے واقف ہیں، پہلے سے اکھڑ گئے تھے۔ بیٹی کا رشتہ تمہیں دینے پر کہاں رضا مند ہوں گے، کاش! یہ بات ہادی بھی سمجھ لے... میرا خیال ہے فیضان! تمہارا یہاں سے چلے جانا ہی ٹھیک رہے گا۔"

ثمینہ نے جملہ مکمل کیا اور آہستگی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ دروازہ ایک مدھم آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ فیضان الماری سے اپنا کچھ اور سامان نکالنے لگے، لیکن ماتھے پر تیوریاں ہنوز برقرار تھیں۔

☆ ☆ ☆

جلال جوں ہی سعدی کے کمرے میں داخل ہوا، ایک تکیہ پوری قوت سے اڑتا ہوا آ کر اس کے چہرے سے

ٹکرایا۔ جلال کے چودہ نہیں اٹھائیس طبق روشن ہوگئے۔ اگر فوری طور پر اس نے دروازے کا سہارا نہ لیا ہوتا تو یقیناً "سر کے بل گرتا اور یقین کامل تھا کہ ایسی زبردست چوٹ کھاتا کہ کئی دن تک تو ضرور بستر پر پڑا رہتا۔

اپنے بوکھلائے ہوئے حواس اور چکرائے ہوئے سر پر قابو پاتے ہوئے اس طرف دیکھا جہاں سے یہ گولہ باری کی گئی تھی، لیکن بے سود اسے حد درجہ تعجب نے گھیرا۔ سعدی کے چھوٹے سے روم میں کم و بیش بارہ سے پندرہ لڑکے گھسے ہوئے تھے بلکہ گھسے کیا ہوئے تھے ایک دوسرے کے اوپر ہی چڑھے ہوئے تھے۔ دو پلنگوں کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی وہیں سب کے سب ایک ٹانگ پر اچھل رہے تھے اور منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکال رہے تھے۔ کمرے میں اسٹیریو فل والیوم پر چل رہا تھا، لیکن لڑکوں کا شور اتنا تھا کہ نہ گیت کے بول سمجھ میں آرہے تھے نہ ان کی باتیں۔

کچھ چہرے جلال کے لیے جانے پہچانے تھے کچھ قطعی انجان۔ اتنی بھیڑ میں یہ طے کرنا بھی مشکل تھا کہ آخر اس پر حملہ کیا کس نے ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ لڑکوں نے ہاتھوں میں تکیے پکڑے ہوئے ضرور تھے۔

جلال نے سوچا اسے واپس چلے جانا چاہیے خدا معلوم یہ سب کس بات پر اتنی ہنگامہ آرائی کر رہے ہیں اور یہ بھی خبر نہیں کہ سعدی گاؤں سے واپس بھی آچکا ہے کہ نہیں۔

ابھی وہ واپسی کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ اس کی نظر سعدی پر پڑی وہ پلنگ پر دراز ہونٹوں کے کناروں کو کانوں تک پھیلائے تالیاں پیٹ پیٹ کر لڑکوں کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ اس کے قریب پلنگ پر مٹھائی کا ٹوکرا کھلا پڑا تھا جس میں سے بیشتر مٹھائی کھائی جا چکی تھی، باقی پر سعدی ہاتھ صاف کر رہا تھا، ساتھ ساتھ سر بھی دھن رہا تھا۔

"جلدی! میرے دوست!" سعدی کی نظر اس پر پڑی تو وہیں سے نعرہ مستانہ بلند کر دیا۔

جلال ہجوم سے بچتا بچاتا بمشکل سعدی تک پہنچا۔

"یہ ہو کیا رہا ہے سعدی! کم سے کم والیوم ہی کم کرو... کان پھٹ رہا ہے اس شور سے۔"

"شاباشے... "سعدی نے آخری حرف کو خوب لمبا کر کے کہا۔

"اس شور سے میرے یاروں کا خون ابل رہا ہے اور وہ جذباتی ہو کر میرے نکاح کی خوشی میں ناچ رہے ہیں اور تم اسے شور کہہ رہے ہو۔" سعدی کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا اور جلال بھونچکا۔

"نک... کیا کہا تم نے؟" اس نے حیران پریشان کیفیت میں پوچھا۔

سعدی نے دوبارہ اپنا جذباتی جملہ دہرا دیا، لیکن اس بار شور پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔ لڑکے پہلے سے زیادہ دیوانے ہو کر بقول سعدی بھنگڑا ڈالنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ سعدی بھی ان کا شریک بنتا جلال یکدم ہوش میں آیا اور اسے کھینچتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

"اب بتاؤ! کیا کہہ رہے تھے تم؟" جلال نے کسی قدر غصے سے کہا۔

"یار! تم تو اس طرح ناراض ہو رہے ہو جیسے میرے نکاح کی خبر سے بڑا شاک پہنچا ہو۔" سعدی ناراضی سے کہنے لگا۔

"تو ظاہر سی بات ہے شاک نہیں لگے گا تو کیا ہوگا... آناً فاناً نکاح کیسے ہو گیا تمہارا؟" جلال نے جھنجلا کر پوچھا۔

"بس یار! تجھے تو پتا ہے میرے اباجی کی پھرتیوں کا۔" سعدی نے بلاوجہ خوشی اور شرم ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو مجھے فون کر کے کسی ضروری کام کا جھانسہ دے کر گاؤں بلوا لیا، پھر پکڑ کر نکاح کروا دیا میری منگیتر سے اب کیا کہوں یار! سرپرائز تو دیا اباجی نے مگر تھا اچھا سرپرائز۔"

"گدھے! اباجی کے سامنے اتنی ہی تابعداری دکھانا تھی تو مجھے ثمینہ آنٹی کے ساتھ بات کرنے کا کیوں کہا تھا،

"بات... کون سی بات؟" سعدی نے پوچھا۔

"مادی سے شادی کی بات۔" جلال نے دانت کچکچائے۔ اسے ثمینہ آنٹی کے سامنے شرمندگی کا خیال پریشان کر رہا تھا۔

"او یار! اپنے نکاح کی خوشی میں اسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔" سعدی نے بے ساختہ کہا۔ "تم نے ذکر تو نہیں کر دیا ان سے؟"

"اتنا دماغ کھا رہے تھے تم میرا۔ تمہارا کیا خیال ہے اب تک میں نے ذکر نہیں کیا ہوگا؟"

"شاباشے... تو اب مجھ پر اتنا غصہ کس لیے کر رہے ہو؟ میں نے تو یونہی مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی، تم سنجیدہ ہی ہو گئے۔" سعدی نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"وہ مذاق تھا؟" جلال کو بے پناہ غصہ آیا۔ "ایک لڑکی کی زندگی کو مذاق بناتے تمہیں ذرا شرم نہیں آئی۔"

"تم کتنے سالوں سے مجھے جانتے ہو، اب تک مجھے اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ میں کب مذاق کر رہا ہوتا ہوں، کب نہیں۔"

"سعدی! کچھ خدا کا خوف کرو۔ تم نے وہ ساری باتیں مذاق میں نہیں، سو فیصد سنجیدگی سے کی تھیں۔" جلال نے دہائی دی۔

"ہاں تو یار! جذباتیت میں کچھ بھی منہ سے نکل گیا ہوگا۔ اباجی سے جھگڑا ہوا تھا میرا۔ میں نے غصے میں کہہ دیا، آپ کچھ بھی کر لیں، اب آپ کے بھائی کی بیٹی سے تو ہرگز شادی نہیں کروں گا، پھر میں نے تم سے کہہ دیا کہ مادی کے لیے بات کرو۔ اب مجھے کیا خبر تھی تم اتنی جلد بازی دکھاؤ گے۔" سعدی کسی طرح اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اور جلال کا بس نہ چلتا تھا اس کا سر ہی پھاڑ دے۔

"اب میں ثمینہ آنٹی کو کیا جواب دوں گا؟"

"مجھے کیا خبر... اب تم جانو اور تمہارا کام۔ ہاں میں ذرا رقص میں شریک ہو جاؤں۔" سعدی نے مزے سے اندر کی راہ لی۔ جلال دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا، کرتا بھی تو کیا؟ ایک مرتبہ پھر دوست نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ شبیہہ کو پتا چلتا تو اس کی درگت بنا دیتا، لیکن یہ سوچ کر پھر بھی تسلی محسوس ہو رہی تھی کہ ثمینہ آنٹی نے سعدی کے معاملے میں زیادہ دلچسپی ہی نہیں لی تھی۔

جلال وہیں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ حیرت انگیز طور پر اسے اتنی فکر لاحق نہیں ہو رہی تھی، جتنی کہ حق بنتا تھا اور ایسا کیوں تھا؟ جلال نے ایک پل کے لیے اس بات پر غور کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے دل میں عجیب سی سرخوشی کا احساس ابھر رہا تھا۔

یہ احساس ایسا عجیب تھا کہ جلال پہلے چونک گیا، پھر حیران ہوا اور آخر کار شاد ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

ولی نے ابھی ویڈیو گیم آن کی ہی تھی کہ ولید آن دھمکا۔ اب دونوں میں جھگڑا جاری تھا۔ انیبا سمجھا سمجھا کر تھک گئی مگر مجال ہے جو دونوں میں سے کوئی بات سن لے۔

"تم دونوں الگ الگ کیوں نہیں کھیلتے؟" انیبا نے عاجز ہو کر کہا۔

"کھیل کون رہا ہے؟" ولید نے اطمینان سے ریموٹ کنٹرول گھماتے ہوئے کہا۔

"میں تو ولی کی مدد کر رہا ہوں، آخر اس کا بڑا بھائی ہوں، میں مدد نہیں کروں گا تو کون کرے گا؟"

"مجھے گیم کھیلنا آتی ہے' بڑے بھائی کی مدد نہیں چاہیے۔" ولی نے ولید سے ریموٹ کنٹرول چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں' نہیں میرے بھائی! مجھے میری ذمہ داری پوری کرنے دو ورنہ یہ بوجھ ساری زندگی میری روح پر رہے گا۔" ولید نے ڈرامائی انداز میں کہا اور بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"انو۔۔۔" ولی نے روہانسا ہو کر انیبا کو دیکھا۔

"ہر فساد کرنے میرے کمرے میں ضرور آنا ہوتا ہے۔۔۔ اپنے کمرے میں کیوں نہیں جھگڑتے تم دونوں؟" اس نے سر دونوں ہاتھوں میں گراتے ہوئے کہا تب ہی شازیہ آگئی۔

"انو باجی! آپ کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔"

"ڈیڈی آگئے۔" انیبا نے چونک کر کہا۔ دانیال حسن آفس کی طرف سے دو روز کے لیے فیصل آباد گئے ہوئے تھے۔

"شازیہ! تم جاؤ میں آتی ہوں۔" پھر ان دونوں سے بولی۔

"میں ڈیڈی کی بات سن کر ابھی واپس آ رہی ہوں اور واپسی پر تم دونوں مجھے یہاں نظر نہ آؤ۔" اس نے انگلی اٹھا کر کہا اور کمرے سے باہر آگئی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے دیکھا' لاؤنج میں دانیال حسن کے ساتھ فیضان بھی موجود تھے۔

انیبا کے قدم سست ہوئے۔ بایاں ہاتھ بے ساختہ ماتھے کے زخم تک چلا گیا' ماتھے پر بینڈیج کا ابھار تھا۔

اس کے دل پر بوجھ سا بڑھ گیا۔ دل چاہا یہاں سے ہی پلٹ جائے' لیکن ڈیڈی کو کیا جواب دیتی۔ ناچار بوجھل قدموں سے چلتی لاؤنج میں آگئی۔

"السلام علیکم۔" فیضان نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ مرجھایا ہوا چہرہ' زرد رنگت اور ماتھے کی بینڈیج' فیضان نے سر جھکا کر آنکھیں فائل سے چپکا دیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسا ہے میرا بچہ؟" دانیال حسن نے پیار سے پوچھا' پھر اس کی طرف دیکھ کر بری طرح ٹھٹکے۔

"یہ۔۔۔ یہ ماتھے پر کیا ہوا ہے؟" وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بے قراری سے اس کی طرف بڑھے۔

انیبا کی نظریں یکبارگی فیضان کی طرف اٹھیں۔

"کالج میں سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ تھوڑی سی چوٹ لگ گئی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تھوڑی سی چوٹ؟" دانیال نے اس کا زخم دیکھتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔ "یہ تو بہت گہرا زخم لگ رہا ہے انیبا!"

"جی ڈیڈی! زخم تو گہرا ہی ہے۔" انیبا نے بوجھل لہجے میں کہا۔

فیضان کے دل میں شرمندگی قد آور ہوئی کہ وہ جانتے تھے یہ جملہ بطور خاص انہیں ہی سنایا گیا ہے۔

"لیکن آپ فکر مند نہ ہوں' بینڈیج کروائی تھی میں نے۔ آپ کے لیے کھانا لگواؤں؟"

اس نے بات پلٹتے ہوئے پوچھا۔ دانیال حسن اس کے لیے فکر مند ضرور تھے۔ انہوں نے پر سوچ انداز میں سر ہلا دیا۔

"نہیں' فی الحال کھانا رہنے دو۔۔۔ اچھی سی کافی پلوا دو' اسی لیے بلوایا تھا۔ وہ شازیہ تو کافی کے نام پر کوئی عجیب سی چیز بنا دیتی ہے۔ تم اچھی سی بنا دو' فیضان بھی آیا ہوا ہے۔"

"میں بھجوا دیتی ہوں کافی۔" وہ کچن میں آگئی۔ فریج سے دودھ اور کیبنٹ سے کافی کا جار نکالا' کافی میکر کا سوئچ آن کیا۔ مگ ٹرے میں رکھے پھر کافی پھینٹنے لگی۔ ایک ایک کام کرتے اس کا ذہن بار بار فیضان کو سوچتا رہا۔

"میں کیوں ماما کی باتوں میں آکر بولے پن کا مظاہرہ کر گئی۔ خاموش رہتی تو اچھا تھا۔۔۔ خوامخواہ بھرم بھی ٹوٹا' شرمندگی ہوئی' رسوائی اور زخم ملا' ہر بات سے الگ۔ اس پتھر دل سے تو اتنا نہ ہو سکا کہ خیریت ہی معلوم کر لے۔ بس ختم یہ قصہ۔ حماقت تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ میں بھول جاؤں گی فیضان مہدی کو بھی اور اپنی اس حماقت کو بھی۔"

اس نے خود سے عہد کیا اور کافی تیار کر کے خود ہی پیش کرنے پہنچ گئی۔ فیضان کے سامنے مگ رکھتے ہوئے پل بھر کے لیے نظروں کا تصادم ہوا۔

ایسے جیسے راہ چلتے کسی سے نظر ٹکرا جائے' ایک ناواقف لاتعلق سی نظر جس میں اپنائیت کا شائبہ تک نہ ہو۔ ہاں' نگاہوں کا یہ تصادم ایسا ہی تھا۔

انیبا نے کافی پیش کی اور تیز قدموں سے چلتی وہاں سے ہٹ گئی۔ فیضان نے اسے جاتے دیکھا۔

"مجھے انیبا سے ایکسکیوز کر لینا چاہیے۔" انہوں نے سوچا مگر وہ جا چکی تھی۔ کمرے میں اس کے بھائی تھوڑے سے جھگڑے کے بعد اب شیر و شکر ہوئے بیٹھے تھے' وہ بالکونی میں آگئی۔ پتا نہیں کیوں لیکن اس کا دل اس وقت تنہائی چاہتا تھا۔

ہلکی سی ہوا موگرے کی مدھم سی مہک اپنی جھولی میں لیے پھرتی تھی۔ آسمان کے کناروں پر دن کا اجالا شام کے رنگوں میں مدغم ہو کر رات کا منظر بناتا تھا۔ یوکلپٹس کے پتے ہلکی ہوا سے لرزتے تھے۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

وہ دیر تک وہاں کھڑی اس منظر کو دیکھتی رہی۔ معاً اسے اپنے گالوں پر نمی کا احساس ہوا تو وہ چونک سی گئی۔ اس نے اپنی پوروں سے پلکوں کو چھوا' تو انکشاف ہوا کہ وہ رو رہی تھی۔ انیبا کو اپنی بے بسی پر تاؤ سا آگیا اور وہ مزید

☆ ☆ ☆

یہ ایک مختلف سا دن تھا۔ موتیا کے پودے پر کھلی نئی کلی جیسا تر و تازہ اور دلکش۔

تنوی کالج پہنچی تو وہاں تھرتھلی سی مچی ہوئی تھی۔ جدھر دیکھو لڑکیاں دو چار کے گروپ میں کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ تنوی کو دیکھ کر عبیر اپنے گروپ کی لڑکیوں کو ہاتھ ہلاتی اس کے پاس دوڑی چلی آئی۔

"تنوی بی! آپ کو بہت مبارکاں' صبح صبح ایک خوش خبری سن لو۔" اس نے اپنے انداز میں کہا۔

"کیسی خوش خبری؟"

"عروش کو کالج سے نکال دیا گیا ہے۔" عبیر نے اطمینان سے اس کے سر پر دھماکا کیا تھا۔ تنوی کی آنکھیں خوشی اور بے یقینی سے پھیل گئیں۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"جھوٹ کیوں بولوں گی بھئی۔" عبیر نے چڑ کر کہا۔ "کالج میں سب کو پتا چل چکا ہے' صرف تم ہی انجان ہو۔"

"تمہیں بتایا کس نے عبیر؟" تنوی نے پوچھا۔

"مجھے تو انکل نے بتا دیا تھا لیکن کالج پہنچی تو پتا چلا' یہاں سب مجھ سے بھی زیادہ باخبر ہیں۔"

"لیکن عبیر! یہ سب ہوا کیسے؟" اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"پولیس کو اس کے خلاف شواہد مل گئے تھے' بس ان ہی شواہد کی بنا پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ انکل کہہ رہے

تھے اب اگر پولیس نے اسے چھوڑ بھی دیا تو کالج میں [illegible] آنے نہیں دیا جائے گا۔"

"چلو خس کم جہاں پاک... میں تو کئی دن سے [illegible] پریشان ہو [illegible] کہ [illegible] دوبارہ بلوا لیا تو کیا ہوگا۔"

تنوی نے سکون کا سانس لیتے ہوئے [illegible] عبیر نے اس بات پر منہ کے زاویے [illegible] البتہ بولی کچھ نہیں۔ وہ دونوں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کلاس روم کی طرف چل دیں۔

"نمرہ کا کیا ری ایکشن ہے؟" تنوی نے کچھ خیال آنے پر پوچھا۔

"پتا نہیں ہمیں تو ابھی تک اس سے ملی نہیں ہوں۔ مجھ سے تو خیر اب وہ ملتی بھی نہیں ہے، جہاں دیکھتی ہے منہ پھیر لیتی ہے۔ زینت بتا رہی تھی کالج تو آئی ہوئی ہے لیکن اداس لگ رہی ہے۔ سب لڑکیاں نمرہ کا مذاق اڑا رہی ہیں... کسی کا کیا قصور؟ نمرہ نے خود ہی عروش کے پیچھے خود کو لطیفہ بنا رکھا ہے۔ احمق نہ ہو تو۔" عبیر نے تنی سے کہا پھر موضوع بدل کر پوچھنے لگی۔

"تم شبیہہ کے ساتھ آئی ہو؟"

"نہیں بڑے بھیا آئے تھے چھوڑنے، شبیہہ بھائی تو کل ہی واپس لاہور چلے گئے تھے۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

تب ہی کاریڈور کے کونے پر ان کی مڈبھیڑ نمرہ سے ہوگئی۔

وہ غمگین لگ رہی تھی۔

"ہوگئی تم دونوں کی تسلی؟ عروش کو کالج سے نکلوا کر سکون آگیا؟" اس نے سلگتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"عروش کے کالج سے نکالے جانے کی خبر سن کر کافی سکون آیا ہے۔ ایسے بدل کو کسی بھی [illegible]" عبیر نے حسب عادت اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ [illegible] نمرہ کے لیے [illegible] ہی [illegible] برداشت نہیں کرتی تھی۔

"گواہی بھی تو تم دونوں نے ہی دی تھی۔" نمرہ نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ تو... ہمیں اور کوئی کام نہیں ہے جو گواہیاں دیتے پھریں۔ عروش کے خلاف اس کی اپنی حرکتیں ہی کافی تھیں... لیکن ایک بات طے ہے کہ مجھے گواہی کے لیے بلوایا جاتا تو میں ضرور پہنچ جاتی۔ شکر کرو انہوں نے مجھے نہیں تنوی کو بلوایا تھا۔" اس نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

نمرہ نے بری طرح دونوں کو گھورا۔

"نمرہ! ہماری بات تو سنو۔" تنوی نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"کیوں سنوں میں تمہاری بات کون سی بھلائی کی ہے تم نے میرے ساتھ؟" نمرہ ترش کر بولی۔

"تمہارے ساتھ ہی تو بھلائی کی ہے احمق لڑکی!" عبیر بری طرح سلگی۔

"بالفرض ہم عروش کے خلاف کچھ کہتے بھی تو اس کے ساتھ برائی کرتے، تم اس سارے چکر میں کہاں سے آگئیں؟"

"عروش میری دوست ہے اور دوست کا دشمن، اپنا دشمن ہوتا ہے۔ تم دیکھنا! اب میں کیا کرتی ہوں۔" نمرہ نے خونخوار لہجے میں دھمکایا اور واپس پلٹ گئی۔

"واہ کیا ڈائیلاگ ہے؟ خوف سے تو میری ٹانگیں بھی کانپ رہی ہیں۔" عبیر نے استہزائیہ ہنسی کے ساتھ پھبتی کسی لیکن نمرہ نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

"اب یہ کیا کرے گی؟" تنوی نے بیزاری سے کہا۔

"[illegible] کی طرح [illegible] چندہ [illegible] کر کے عروش کی ضمانت کے لیے روپے جمع کرے گی۔" عبیر نے غیر سنجیدگی سے کہا۔ تنوی نے [illegible] بری طرح [illegible]

"[illegible] سنجیدہ بھی ہو جایا کرو۔"

"[illegible] نمرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دو، جب انسان خود اپنے ساتھ ہی مخلص نہ ہو تو کسی دوسرے [illegible]"

پھر انہوں نے واقعی نمرہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ کچھ دن تک عروش کا قصہ زبان زد خاص و عام رہا، پھر اس معاملے پر گرد پڑ گئی۔ نمرہ کی مسلسل غیر حاضری پر اسے کالج سے stuck off (خارج) کر دیا گیا اور یوں اس کالج کی تاریخ سے زیادہ ان سہیلیوں کی زندگی میں راوی چین ہی چین لکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"فیضان ماما دبئی جا رہے ہیں۔"

ہادی نے جس وقت کمرے میں داخل ہوتے ہوئے یہ بریکنگ نیوز سنائی، انیبا اسٹڈی ٹیبل پر ایک کتاب کھولے پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھی، بے ساختہ چونکی اور گردن موڑ کر ہادی کو دیکھا۔

"کیا؟ کیا کہا تم نے؟"

"فیضان ماما دبئی جا رہے ہیں۔" ہادی نے گہری سانس بھرتے ہوئے دہرایا۔

"اچھا۔" انیبا نے لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے نظریں واپس کتاب کے صفحے پر جما دیں۔

"صرف اچھا... کچھ اور نہیں کہو گی؟" ہادی نے پوچھا۔

"کیا کہوں؟" انیبا نے [illegible] لہجے میں کہا۔

ہادی [illegible] بے بسی سے انیبا کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"انہیں روک لو انو! تم انہیں روک سکتی ہو۔" اس کا لہجہ التجائیہ تھا۔ انیبا نے بدک کر اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیے اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے تنی سے بولی۔

"پاگل ہوگئی ہو؟ میں انہیں کیسے روک سکتی ہوں؟"

"اپنی محبت سے۔" ہادی نے اطمینان سے کہا۔ انیبا کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کون سی محبت؟ وہی محبت جس کا اظہار اپنی زبان پر لاتے ہی مجھے تمہارے ماموں کی طرف سے اتنا بہترین [illegible] کہ دو دن بعد بھی زخم سے ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔" اس کا لہجہ حد درجہ طنزیہ تھا لیکن کہیں دکھ بھی موجود تھا، جو چھپے چھپے اس کے لہجے سے جھانکتا تھا۔

"نہیں، وہ محبت جس کا ذکر آتے ہی تمہارا چہرہ روشن ہو جاتا ہے، آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ تب یہ انیبا زیادہ اچھی لگتی ہے بہ نسبت.....

"اس انیبا کے جو ایک بار ٹھوکر کھا کر محبت کو اپنی زندگی سے ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔"

انیبا نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پر اچھال دی۔

"ایک بار کی ٹھوکر ہی کافی ہے۔ میں بار بار اس محبت کے پیچھے اپنی توہین نہیں کروا سکتی۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے قطعیت سے کہا تھا۔

"سوچ لو... وہ چلے گئے تو پچھتاؤ گی۔" ہادی نے اسے ڈرانا چاہا۔

"میں تو پہلے ہی پچھتا رہی ہوں۔" انیبا نے زہر خندی سے کہا۔ "معمولی سی پسندیدگی تھی، جیسے ہم کسی ایکٹر کو

پسند کر لیتے ہیں۔ میں خوامخواہ اس پسندیدگی میں محبت تلاش کرنے لگی۔ مجھے تو ٹام کروز بھی پسند ہے۔ Hugh Jackman کی بھی فین ہوں۔ کیا ان سب سے شادی کرنے کے متعلق سوچنے لگوں؟ پتا نہیں وہ حماقت بھرے جملے میرے منہ سے کیسے نکل گئے۔" اس نے بے حد تاسف سے کہا۔

مادی نے کچھ کہنا چاہا مگر رک گئی پھر قدرے توقف سے بولی۔

"میں چلتی ہوں۔"

"پلیز مادی! خفا ہو کر مت جاؤ۔" انبہا نے تیزی سے کہا۔

"میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں لیکن، لیکن اپنی مزید توہین نہیں کروا سکتی۔"

"میں خفا ہو کر نہیں جا رہی۔ اپنے پوائنٹ آف ویو میں تم بھی غلط نہیں ہو مگر مجھے افسوس ضرور ہو رہا ہے۔ میں نے بڑے خلوص سے تمہارے اور فیضان ماما کے لیے کوشش کی تھی اور میں ابھی بھی جانتی ہوں تم دونوں ایک بہترین زندگی گزار سکتے ہو۔"

"تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"محبت کی بنیاد پر قائم ہونے والے رشتے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔"

"محبت... نہیں، اسے محبت مت کہو۔ وقتی کشش تھی جسے میں محبت سمجھی۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں شاید پتا نہیں انبہا! نظریں چرا کر سچ بھی بولا جائے تو جھوٹ لگتا ہے۔" مادی نے کہا۔

"مطلب؟"

"گزرتا وقت، تمہیں اس کا مطلب خود سمجھا دے گا۔" پھر اس نے آگے بڑھ کر پیار سے انبہا کے بال تھپتھپائے۔ "تم بہت اچھی ہو انبہا! کاش! فیضان ماما کے دل سے اس عورت کا عکس اتر پاتا ہوتا۔"

"کون... کس کی بات کر رہی ہو؟" انبہا نے بری طرح چونک کر پوچھا۔

"تھیں کوئی... مجھے بھی کل ہی پتا چلا، فیضان ماما پسند کرتے تھے انہیں مگر..."

"مگر؟" انبہا کا رواں رواں سماعت میں ڈھل گیا۔

"مگر عمر میں بڑی تھیں وہ، اس لیے شادی نہیں ہو سکی فیضان ماما کی ان سے۔"

"اوہ..." انبہا کے دل کو ٹھیس سی لگی مگر کھو کر مسکراتی رہی۔

"مجھے یقین ہے، فیضان ماما کے دل پر کسی اور کا سایہ نہ ہوتا تو تم محبت کرنے کے لیے بہترین تھیں۔" مادی نے کہا۔

"چھوڑو بھی ان فضول کی باتوں کو... میں شازیہ سے کہتی ہوں چائے لے کر آئے۔"

"نہیں، دل نہیں چاہ رہا۔ پھر سہی، آج میرا دل بہت بوجھل ہو رہا ہے۔" مادی نے بیزاری سے کہا اور سچ بھی تھا، اس کا مخصوص شوخ چلبلا پن آج مفقود تھا۔ انبہا کے اپنے دل کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی تب ہی زیادہ اصرار بھی نہ کر سکی۔ مادی واپس چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

شبیہہ دیکھ رہا تھا، جلال پچھلے بیس منٹ سے مسلسل گنگنا رہا ہے۔ کبھی سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا تو کبھی شیشے کے آگے کھڑا ہو کر بال بنانے لگتا۔ بلاوجہ مسکرا رہا تھا۔

"کیا بات ہے، بہت خوش لگ رہے ہو؟" بالآخر شبیہہ نے پوچھ ہی لیا۔ جلال نے بے ساختہ شیشے میں اپنے

عکس کے عقب میں بیڈ کی طرف دیکھا جہاں شبیہہ ایک ہاتھ سر کے پیچھے رکھے نیم دراز تھا اور اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر لگی تھیں۔

"نہیں کوئی خاص بات نہیں بس یونہی۔" جلال نے برش کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"چلو چلو... جیسے میں تو تمہیں جانتا ہی نہیں ہوں۔" شبیہہ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

"ضرور بہت دن سے کسی دوست نے تمہیں دھوکا نہیں دیا ہوگا۔ جیسے نوٹس یا کوئی اسائنمنٹ ہتھیانے کے لیے، تب ہی اتنا خوش ہو رہے ہو۔" شبیہہ نے اندازہ لگایا۔ جلال کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"اب کوئی مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتا۔"

"کیوں؟ اب تم نے لوگوں کی باتوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا ہے یا تمہارے ہاتھ سلیمانی ٹوپی آگئی ہے، جسے پہن کر تم لوگوں کی نظروں سے غائب رہتے ہو؟ کوئی تمہیں دیکھے اور بدھو نہ بنائے... یہ تو ناممکن ہی ہے۔" شبیہہ نے حسب عادت صاف گوئی سے کہا۔ جلال نے گھورا۔

"میں اب محتاط ہو گیا ہوں، کسی کی بات پر بنا تصدیق یقین نہیں کرتا۔"

"اچھا... کتنی مدت کے لیے؟"

"مطلب؟" جلال نے گھور کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ کتنے عرصے کے لیے یہ لائحہ عمل تیار کیا ہے؟ مجھے یقین ہے چند مہینے تو کیا، چند دن بعد ہی تم مجھے لڑکیوں کی طرح بسورتے ہوئے ملو گے کہ فلاں نے بے وقوف بنا دیا، فلاں نے اس طرح نوٹس نکلوا لیے۔"

شبیہہ نے دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا لیکن جلال برا ماننے کے بجائے ہنس دیا۔

"شبیہہ! اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے پرعزم لہجے میں کہا تھا۔

"حویلی میں سب کیسے ہیں؟" جلال نے موضوع گفتگو جان بوجھ کر بدل دیا۔

"ٹھیک ہیں... چچی تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں بہت دن ہوئے جلال نے حویلی کا چکر نہیں لگایا۔" شبیہہ نے کہا۔

"ہاں... میں اس ویک اینڈ پر حویلی جانے کا سوچ رہا ہوں۔" جلال ایک بار پھر کھڑکی کے پاس جا رکا اور باہر جھانکنے لگا۔ موسم صبح سے ابر آلود تھا۔ آسمان پر سیاہ، بھورے، سفید بادل دوڑے چلے آتے تھے۔ ٹھنڈی ہوا تیز تیز چل رہی اب بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔

ایسا موسم آج سے قبل جلال کو کبھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ ہوا کے زور سے اپنے چہرے سے ٹکراتی بوندوں کو محسوس کرتے ہوئے جلال نے اک سرخوشی کے عالم میں سوچا تھا۔

"نوری کیسی ہیں؟" جلال نے پوچھا۔

"کون؟" شبیہہ سن نہیں سکا تھا۔

"تمہاری ہونے والی نصف بہتر کا پوچھ رہا ہوں؟" جلال نے اس کی طرف پلٹتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

"یار! وہ تو عجیب احمق لڑکی ہے۔" شبیہہ نے گہری سانس بھر کر کہا۔ جلال ہنس دیا۔

"اب کیا کر دیا بے چاری نے؟"

"میں نے ناخن کاٹنے کے لیے کہہ دیا تو رونے لگی کہ مجھے لمبے ناخن پسند ہیں... بتاؤ، اس سے زیادہ احمقانہ بات کوئی ہو سکتی ہے، جس پر رویا جائے۔" شبیہہ نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ جلال ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔

"خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

"مجھے تو خود پر ابھی سے رحم آ رہا ہے۔ عجیب پاگل لڑکی ہے۔ عقل نام کو بھی نہیں، نان سینس۔"

”اتنی بھی پاگل نہیں ہے‘ اچھی خاصی عقل ہے اس میں۔۔۔ بس تم سے ڈرتی ہے‘ قصور اس کا نہیں تمہارا ہے‘ کبھی پیار سے بات کی ہو تو اسے پتا چلے کہ تمہارے پاس بھی دل ہے۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے اسے بتانے کی۔“ شبیہہ نے چڑ کر کہا۔ ”اور پیار سے کیسے بات کی جاتی ہے؟ میں پیار سے بات نہیں کرتا؟ مجھے تو ایسے ہی بات کرنا آتی ہے۔“

”ایسے۔۔۔ پتھر مارنے والے انداز میں؟“ جلال نے چڑانے والے انداز میں کہا اور شبیہہ چڑ بھی گیا۔

”ہاں۔۔۔ ایسے ہی۔“

”تم نہیں سدھر سکتے۔“ جلال نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

”موسم بڑا خوشگوار ہے۔ واک کے لیے چلتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں۔۔۔ مجھے کوئی شوق نہیں اس گندے موسم میں باہر نکلنے کا۔“

”یار شبیہہ! بے چاری تنوی کی تو سچ مچ قسمت پھوٹ گئی۔ تیرے اندر تو کوئی لطیف حس ہے ہی نہیں۔“ جلال نے بیزاری سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

ماوی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

موسم خوش گوار تھا۔ کچھ دیر پہلے خوب بارش برسی تھی۔ اب کن من باقی تھی۔ دھوپ ندارد۔ آسمان پر بادلوں کے غول اترے ہوئے تھے۔ ہوا سرمست تھی۔ ماوی نے چند لمحے سوچا پھر لکڑی کے چھوٹے سے خوب صورت پھاٹک کو دھکیل کر باہر نکل آئی۔

سڑک سیدھی اور بارش کی روانی سے نم تھی۔ بنگلوں کے باہر لگی بیلوں کے بے تحاشا [illegible] ہو رہے تھے اور ان پر سیاہ پروں والی [illegible] ننھی منی چڑیاں پھدک رہی تھیں۔

وہ یونہی بے سبب چہل قدمی کرتی آگے نکل آئی۔ ذہن مسلسل فیضان ماما اور انیبا کی طرف لگا ہوا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا فیضان ماما کو کس طرح ان کے ارادے سے باز رکھے۔ انیبا بلاشبہ ایک بہترین لڑکی تھی۔ ماما کی زندگی میں خوشیاں لانے کا سبب بنتی اور فیضان ماما تھے کہ گھر آئی نعمت کو ٹھکرا رہے تھے۔ یہ کس قدر کم عقلی کا فیصلہ تھا۔ کوئی انہیں کیسے سمجھاتا۔

ایسے ہی چلتے اور اس کن من میں بھیگتے ہوئے اسے ایک بنگلے کے باہر بڑے خوب صورت سفید اور زرد رنگ کے پھول نظر آئے دکھائی دیے۔ ماوی کے قدم بے ساختہ رک گئے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا‘ چوکیدار تو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ماوی نے ذرا سا آگے ہو کر پھول توڑنا چاہے‘ لیکن دیوار سے لپٹی بیل کو کہ نیچے جھک آئی تھی مگر پھول اوپری شاخ پر تھے۔ بڑی تگ و دو کے بعد بھی اس کا ہاتھ پھولوں کے گچھے تک نہ پہنچ سکا۔ تب وہ مایوس ہو کر پلٹنے لگی لیکن پلٹتے ہی بری طرح سٹپٹائی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر جلال کھڑا تھا اور بے حد دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ماوی کے چہرے پر خفت کے رنگ تھے لیکن اگلے ہی لمحے وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”شکر ہے یہ تم ہو۔۔۔ میں سمجھی میں پھول چوری کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑی گئی ہوں اور اب پٹائی ہو گی۔“ اس کے انداز میں شرمساری بھی تھی‘ شرارت بھی۔

”ویسے پھول اچھے ہیں ناں؟“

اب وہ سر اٹھا کر اوپری شاخوں پر موجود پھولوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی اور جلال جواب خاک دیتا وہ کچھ بولنے کی خواہش کے باوجود بس چپ چاپ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ماوی ا

پونی ٹیل سے نکل کر کچھ لٹیں تیز ہوا کے ساتھ اس کی گردن سے لپٹ رہی تھیں۔ بارش کی باریک بوندیں اس کے بالوں اور پلکوں پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ حسب معمول وہ جینز پر کرتا پہنے ہوئے تھی۔ اس کا کرتا گہرے نیلے رنگ کا تھا یا سیاہ رنگ کا‘ جلال فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا یہ رنگ جو وہ زیب تن کیے ہوئے تھی‘ دنیا کا سب سے خوب صورت رنگ تھا۔

محبت کسی انکشاف کی طرح جلال کے دل پر وارد ہوئی تھی اور اس کا دل اسے جیسے ہواؤں میں اڑائے پھر رہا تھا۔ اس کی نظریں ماوی کے چہرے سے ہٹتی ہی نہ تھیں۔ خوشی و انبساط کا کوئی منفرد سا احساس تھا‘ جو اس کے سارے وجود کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔

معاً جلال کی نظریں ٹھٹک گئیں۔ ماوی کی اٹھی ہوئی گردن پر ہنسلی کی ہڈی سے ذرا اوپر ایک گہرا سیاہ تل تھا۔ جلال کے دل میں آن کی آن ایک خیال نے جنم لیا۔ اس سے قبل کہ وہ اس خیال سے بڑھ کر اپنی نظروں کا زاویہ بدلتا‘ ماوی نے اس کی طویل خاموشی پر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

جلال کی نظروں میں کچھ ایسا تھا جس نے لحظہ بھر کے لیے ماوی کو چونکا دیا۔

”کیا بات ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ اس کی پیشانی پر ایک الجھن آمیز سلوٹ بیدار ہو چکی تھی۔

”نن۔۔۔ نہیں کچھ نہیں بس یونہی۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”پھر اتنی دیر سے خاموش کھڑے میری شکل کیوں دیکھ رہے ہو؟ اتنا لمبا قد ہے تمہارا‘ کیا فائدہ ایسے قد کا؟ یہ نہیں کہ دو چار پھول ہی توڑ دو۔ پتا ہے میں تمہارے جتنی لمبی ہوتی تو سب کے سب پھول توڑ کر دیتی۔“

آخر میں رازداری سے بتایا گیا۔ جلال کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور یہ پہلی بار تھا کہ ماوی کی کسی بات پر سٹپٹانے کے بجائے وہ مسکرا رہا تھا۔ جب ساری زندگی ساتھ ہی بتانا تھی تو کتنی دیر تک سٹپٹایا جا سکتا ہے‘ وہ سوچ رہا تھا۔

اور ایک بھی پل ضائع کیے بنا وہ آگے بڑھا اور سب سے اوپری شاخ پر لٹک رہے پھولوں کے گچھوں میں سے دو پھول توڑ کر ماوی کو پکڑا دیے۔

”تھینک یو۔“ ماوی نے خوش ہو کر پھولوں کو دیکھا‘ انہیں ناک کے پاس لے جا کر سونگھا۔ مدھم سی خوشبو بڑی دلفریب تھی پھر اس کی طرف دیکھ کر اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں پوچھنے لگی۔

”تم اکیلے کیا گھوم رہے ہو؟ وہ تمہارا سڑیل بھائی کبھی دکھائی نہیں دیا۔“

”وہ آرام کر رہا ہے‘ اسے بارش سے چڑ ہے۔“ جلال نے سنجیدگی و سادگی سے بتایا۔ اسے اب ماوی کی کوئی بات بری نہ لگ رہی تھی۔

”اور تمہیں؟“

”مجھے تو بارش بہت پسند ہے۔“

”مجھے بھی۔“ وہ چہکی۔ ”آؤ ذرا وہاں تک واک کرتے ہیں۔ میں نے ممی سے کہا تھا میرے ساتھ آئیں لیکن تمہارے بھائی کی طرح انہیں بھی بارش پسند نہیں ہے۔“ اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

”آپ کو پھول پسند ہیں؟“ جلال نے اسے پھولوں کو سونگھتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ ماوی نے چہرے پر جھولتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا۔

”اور بارش؟“ جلال نے مزید پوچھا۔

”ارے بارش تو بہت ہی پسند ہے۔“ ماوی نے کھلکھلا کر کہا۔

”اور کیا کیا پسند ہے؟“ جلال کا بس نہ چلتا تھا‘ آج کسی طرح اس بہتے ہوئے وقت کو روک لے۔ ان قیمتی لمحوں

کو کہیں جانے نہ دے۔

"مجھے؟" ہادی نے لحظہ بھر کے لیے سوچا پھر بولنا شروع کیا۔ بات بات کے درمیان سانس لینا بھی بھول گئی۔ پیڑ پودے، پھول، تتلیاں، آسمان، زمین، چاند، ستارے، سورج، سیارے، پہاڑ، کھائیاں، گھاٹیاں، انسان، جانور... کون سی چیز تھی، جو اس نے اپنی پسندیدگی کی فہرست میں شامل نہ کی ہو۔

جلال نے اس کا ہر ہر لفظ اپنے دل پر تحریر کیا۔

"کچھ ایسا بھی ہے، جو آپ کو ناپسند ہو؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

ہادی سوال سن کر سوچ میں پڑ گئی پھر زور سے ہنس دی۔

"مجھے کچھ برا نہیں لگتا جلال! زندگی اتنی خوب صورت چیز ہے۔ اس میں کیا معمولی معمولی چیزوں کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کرنا... میں تو کہتی ہوں، ہر چیز سے محبت کرو، ہر انسان سے عشق کرو ہاں لیکن مجھے وہ لوگ بہت برے لگتے ہیں جو دوسروں کو اپنے معمولی معمولی فائدوں کے لیے بے وقوف بناتے ہیں۔ پتا نہیں لوگ اتنے خود غرض کیسے ہو جاتے ہیں۔"

جلال کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ کہہ رہی تھی۔ ہادی کو سننا جلال کو اچھا لگ رہا تھا تب ہی بارش تیز ہو گئی۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے ایک قریبی بنگلے کے باہر لگے شیڈ کے نیچے آ رکے۔ بادل ہولے ہولے گرج رہے تھے۔ کبھی کبھی بجلی بھی کڑکتی، ہاں لیکن بارش تیز تھی۔

"تم نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں جلال!" ہادی نے بازو پھیلا کر ہتھیلی پر بارش کے موتی جمع کرتے ہوئے پوچھا۔ "کہ تمہیں کیا پسند ہے۔ کیا ناپسند ہے؟" اس نے پھر پوچھا جلال کا دل چاہا برجستہ کہہ دے۔ "مجھے تم پسند ہو۔" مگر پتا نہیں کیوں وہ کہہ نہ سکا لیکن اس دن ان دونوں نے بارش میں بھیگتے ہوئے، گھر لوٹتے ہوئے بہت سی باتیں کیں گو کہ جلال زیادہ تر خاموش ہی رہا لیکن جب وہ دونوں ہادی کے گھر پہنچے تو جلال کا دل خوشگواریت کے بے پناہ احساس سے بھرا ہوا تھا۔

ہادی نے لکڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر پلٹ کر اسے دیکھا۔

"رک کیوں گئے؟ اندر آؤ نا، ممی سے نہیں ملو گے؟" بارش کب کی تھم چکی تھی۔ بادلوں کی جھری سے سورج جھانک رہا تھا اور تیز زرد کرنوں نے ہادی کے وجود کو سنہری کر دیا تھا۔

جلال نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔ "آج نہیں پھر کبھی۔" ہادی پر خلوص انداز میں مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی... بائے وائے تم سے باتیں کر کے اچھا لگا۔ آج آئے نا کس میں۔"

اس نے الوداعی مسکراہٹ اچھالی اور اندر کی طرف پلٹ گئی لیکن چھوٹی سی روش، سیڑھیاں اور پھر مختصر برآمدے کو عبور کر کے دروازے کے پیچھے غائب ہوتے ہوئے ہادی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی سادہ اور معصوم سا انسان اپنے دل میں اس کے لیے بہت خاص جذبات لیے اور آنکھوں میں محبت کا جہان آباد کیے اسے دیکھ رہا ہے۔

جلال نے دروازہ بند ہوتے دیکھ کر سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ گہرے بادل چھٹ رہے تھے اور سورج جھانکنے لگا تھا لیکن ابھی بھی کہیں کہیں سے پانی جھڑ رہا تھا۔ اس نے باریک بوندوں کو اپنے چہرے پر برسنے دیا پھر زور سے سر جھٹکا اور ایک سرخوشی کے عالم میں چل دیا۔

☼ ☼ ☼

"ہادی! تم بس یہ آئی تھیں؟ میں کب سے راہ دیکھ رہی ہوں تمہاری۔"

ثمینہ کھڑکی کے قریب آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، ہادی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر انہوں نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ آسمان پر پھیلے بادلوں اور ان بادلوں سے جھانکتی کرنوں کی وجہ سے کمرے میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

"میں تو بارش دیکھنے گئی تھی لیکن جلال کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔" وہ جھک کر اپنے کرتے کا دامن جھاڑ رہی تھی جس پر کیچڑ لگی ہوئی تھی۔

"تم جلال کے ساتھ تھیں؟" ثمینہ نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ ہادی کا رخ دوسری طرف تھا وہ ثمینہ کا چونکنا محسوس نہیں کر سکی۔

"جی اسی کے ساتھ تھی، باہر راستے میں مل گیا تھا۔ ویسے ممی! وہ بدھو نظر آتا ہے لیکن باتیں اچھی کرتا ہے۔" وہ مبہم لہجے میں لیکن متاثر کن انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ہاں... باتیں تو اچھی کرتا ہے جلال!" ثمینہ نے واپس کتاب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بے تاثر لہجے میں کہا تھا۔

"اچھا میں ذرا چینج کر لوں۔ فیضی ماما سو تو نہیں رہے؟" ہادی کو یکدم خیال آیا تھا۔

"پتا نہیں۔ بڑی دیر سے اپنے کمرے میں ہے۔ سنو ہادی! تمہیں جلال کیسا لگتا ہے؟" یکدم ثمینہ نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ ہادی حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

"یہ کیسا سوال ہے؟ ویسے میں... اچھا ہے تو اچھا ہی لگے گا لیکن بونگا بہت ہے یعنی اس کا چہرہ دیکھ کر ہی پتا چل جاتا ہے... بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن... لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں ممی!"

وہ الجھن بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"نہیں... کوئی خاص وجہ نہیں۔" ثمینہ نے ہنس کر ٹالا۔ "میں نے بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ سنو تم کافی پیو گی؟"

"آپ رہنے دیں میں چینج کر کے بنا لاتی ہوں۔" ہادی ان کے جواب سے فوری طور پر مطمئن نہیں ہوئی تھی لیکن نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے کہا پھر اپنے اور ممی کے مشترکہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ثمینہ مطمئن انداز میں کرسی جھلاتے ہوئے کتاب پڑھنے لگیں۔ کھڑکی سے باہر بادل ایک بار پھر گہرے ہونے لگے تھے۔ بند شیشے کے باوجود بادلوں کی گرج صاف سنائی دے رہی تھی۔ شیشے پر چند بوندیں بھی تواتر سے گر کر بیچ میں ہی غائب ہو رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

بشریٰ نے اپنی بڑی بیٹی کو سرخ رنگ کا خوب صورت سا فراک پہنا کر اس کے بالوں کی چھوٹی سی پونی بنائی۔ گڑیا سی بچی ایک دم بڑی پیاری لگنے لگی تھی۔ بشریٰ نے بے اختیار اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کان کے پیچھے نظر کا ننھا سا ٹیکا بھی لگا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بچی کو گود میں لے کر بیٹھ گئی اور اس کی چھوٹی چھوٹی معصومانہ شرارتوں پر ہنسنے لگی لیکن اس کا دھیان مستقل باہر کی طرف لگا ہوا تھا، دین محمد نے وعدہ کیا تھا، وہ بڑی بیٹی کو اپنے ساتھ کھیتوں کی سیر کروانے لے جائے گا لیکن ابھی تک اس نے ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا تھا، وہ جب سے آیا تھا۔ جنت سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

اس نے گردن موڑ کر اپنی چھوٹی بیٹی کی طرف دیکھا جو کمبل میں لپٹی سو رہی تھی۔ یہ بچی بشریٰ کے یہاں چند روز قبل ہی پیدا ہوئی تھی جبکہ گود میں بیٹھی ہوئی بچی کی عمر بمشکل دس ماہ تھی۔ دین محمد کے ہاتھوں پٹنے اور اپنا پہلا بچہ

ضائع ہو جانے کے بعد بشریٰ کے دل میں جنت کے لیے نفرت ہو گئی۔ پہلے پیار نہ ہونے کے برابر تھا، اب اس سے بھی زیادہ استقلال سے جنت کی جڑیں کاٹنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کسی انسان کی جڑیں کاٹنا اور کھیتوں میں گندم کی بالیاں کاٹنا بہت مختلف کام ہے۔

وہ جتنی محنت سے جنت کو دین محمد کی نظروں میں گرانے کی کوشش کرتی، جنت اتنی ہی ہوشیاری سے اس کا پینترا اس پر الٹا دیتی۔ اب تو بشریٰ لاشعوری طور پر جنت سے خوف کھانے لگی تھی۔ وہ ایک سیاہ سائے کی طرح اس کے سر پر منڈلاتی جس سے بچنا ممکن ہرگز نہ تھا۔ پھر آگے پیچھے کی دو بیٹیوں نے اس کی گود میں آکر اس کی قدر اور بھی گھٹا دی تھی۔ دین محمد اس سے بیٹے کی توقع رکھتا تھا تب ہی بیٹیوں سے اسے کچھ خاص لگاؤ محسوس نہ ہوتا تھا۔ اسے جنت کے چاؤ لاڈ اٹھانے سے فرصت نہ تھی کہ دوسری بیٹیوں پر دھیان دیتا اور یہی بات دن بہ دن بشریٰ کو مزید فکر میں مبتلا کر رہی تھی۔

وہ بہانے بہانے سے دین محمد کو اپنی بیٹیوں کا احساس دلانے کی کوشش کرتی، دین محمد بظاہر بچیوں کی پرواہ بھی کرتا لیکن جہاں جنت آجاتی، اسے کچھ اور دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔

کل ملا کر کوئی ایک بھی بات ایسی نہ تھی جس سے بشریٰ کو خوشی نصیب ہو۔ دین محمد کمرے میں داخل ہوا اور آکر پلنگ پر دوسری طرف لیٹ گیا۔

"کیوں جی! ثنیا کو سیر کے لیے نہیں لے جائیں گے؟" بشریٰ نے اسے تساہل سے لیٹتے دیکھ کر جلدی سے پوچھا۔

"نہیں آج نہیں۔ پھر کسی دن لے جاؤں گا۔ آج جنت اس کے ساتھ کھیلنا چاہتی ہے۔" دین محمد نے کہا۔ اسی وقت جنت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر وہی بھولپن تھا، جسے وہ دین محمد کے سامنے اپنے چہرے پر طاری کیے رکھتی تھی۔

"اسے جنت کو دے دو۔" دین محمد نے بشریٰ سے کہا۔

"لیکن۔" بشریٰ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی جنت ثنیا کو اس کی گود سے لے کر جا چکی تھی۔ بشریٰ جھاگ کی طرح بیٹھی رہ گئی۔

"جنت بتا رہی تھی تم اسے بچیوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتی۔" دین محمد نے کڑے لہجے میں کہا۔

"جنت ان دونوں کو مارتی ہے۔" بشریٰ نے کہا۔

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی بغیر کسی وجہ کے۔" بشریٰ نے سابقہ انداز میں کہا۔

"میری جنت پاگل ہے کیا جو تیری حور پریوں کو مارے گی؟" دین محمد تڑخا۔

"میں نے یہ نہیں کہا، لیکن آپ خود سوچیں۔ اتنی چھوٹی بچیاں کیا غلطی کر سکتی ہیں کہ غصے میں آکر انہیں مارا جائے۔ جنت میں خود سری ہے۔ وہ بچیوں سے برابر کا مقابلہ کرتی ہے۔"

بشریٰ گگیا گمیانے، لیکن دین محمد کی ایک ہی دھاڑ نے اسے خاموش کروا دیا۔ اس نے بشریٰ کے ایسے لتے لیے کہ بشریٰ کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔

"اگلی بار میری جنت کے بارے میں الٹی سیدھی بکواس کی تو کاغذ تیرے ہاتھ میں پکڑا دوں گا، اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھ کر ساری زندگی روتی رہنا۔ دروازہ بند کر۔ نیند آرہی ہے مجھے۔"

بشریٰ روتے ہوئے اٹھی اور کمرے سے باہر آکر دروازہ بند کر دیا۔ اسے اپنی اور اپنی بیٹیوں کی کم مائیگی کا احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا تب ہی اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ غیر ارادی عمل کے تحت چلتی وہ رسوئی تک آگئی۔ اس کی چھٹی حس جیسے اسے اشارہ دے رہی تھی۔ رسوئی تک آتے ہی اس کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔ اس کی ننھی سی گڑیا چولہے کے قریب بیٹھی تھی اور لپک لپک کر آگ کی طرف جا رہی تھی۔ بشریٰ نے وحشت زدہ ہو کر اسے گود

میں اٹھایا اور شدت سے چومنے لگی۔

"آج یہ چولہے کے پاس ملی ہے۔ اگلی بار اگر یہ میری شکایت لگائی تو چولہے کے اندر پڑی ملے گی۔"

جنت رسوئی کے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ جملہ مکمل کر کے باہر نکل گئی۔ بشریٰ نے ہکا بکا ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس روز پہلی بار اسے جنت سے اتنا خوف محسوس ہوا کہ دل چاہا اپنی بیٹیوں کو لے کر کہیں دور بھاگ جائے۔ یہ لڑکی کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی تھی۔ محض ساڑھے تیرہ برس کی عمر میں وہ کسی عفریت کی مانند بشریٰ اور اس کی بیٹیوں کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔

اس روز بشریٰ نے جنت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ اس لڑکی سے مقابلہ کرتی اور اس مقابلے کے نتیجے میں اپنی اولاد کو نقصان پہنچاتی۔ اس نے ہار مان لی اور اپنا سر جنت کے آگے جھکا دیا۔

☆ ☆ ☆

بڑی دیر کی سوچ بچار کے بعد ہادی اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اپنی تمام تر ناراضی اور اختلاف رائے کے باوجود اسے فیضان ماما سے بات کرنا چاہیے تب ہی اس نے کافی بنائی اور فیضان ماما کے سر پر پہنچ گئی۔

دروازہ نیم وا تھا۔ اس نے ہلکی سی دستک دے کر اندر جھانکا۔ فیضان ماما بیڈ پر بیٹھے تھے اور لیپ ٹاپ آن کر رکھا تھا۔

"آجاؤں؟" فیضان ماما کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے پوچھا۔

"کوئی الٹی سیدھی بحث کرنا ہے تو مت آؤ۔ معافی مانگنے آئی ہو تو کم آن۔" فیضان نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے رکھائی سے کہا۔

"نہ میں بحث کرنے آئی ہوں نہ معافی مانگنے آئی ہوں۔ آپ کے لیے کافی لائی ہوں۔" اس نے بے تکلفی سے اندر آتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ کافی رکھ دو اور جاؤ۔" فیضان نے سابقہ انداز میں کہا۔

"بیٹھنے کے لیے تو نہیں۔ میں آپ کے ساتھ کافی پینے آئی تھی۔" ہادی نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"دیکھ نہیں رہیں۔ میں مصروف ہوں۔"

"کم آن فیضان ماما! ڈونٹ بی روڈ۔" ہادی نے روہانسی ہو کر کہا۔

"ابھی بھی تم چاہتی ہو تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آیا جائے؟" فیضان نے سلگ کر کہا۔

"پلیز... ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ۔" (سمجھنے کی کوشش کریں) وہ زچ ہو کر بولی۔ "آپ اس طرح منہ چھپا کر چلے جائیں گے تو سب آپ کو بزدل کہیں گے۔"

"سب نہیں۔ صرف تم۔" فیضان نے دانت کچکچائے۔ "صرف تم مجھے بزدل کہو گی کیونکہ تمہیں اوٹ پٹانگ حرکتیں کر کے دوسروں کو مشکل میں ڈالنے کی عادت ہے۔"

"فیضان ماما! سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں نے انیبا سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے خود اپنی فیلنگز مجھ سے شیئر کی تھیں اور میں سمجھتی ہوں اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے کہ آپ اسے ریجیکٹ کریں۔"

"تم جاؤ یہاں سے، مجھے اس ایشو پر بات ہی نہیں کرنی۔" فیضان نے رکھائی سے کہا۔

"کیوں بات نہیں کرنی۔" ہادی جھنجلا کر بولی۔ اس میں اس سے زیادہ تحمل نہیں تھا۔ "میں آپ کی اس روکھی پھیکی، بے رنگ و بو زندگی میں تھوڑے کلرز ایڈ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چاہتی ہوں آپ تنہائی کی زندگی نہ گزاریں اور آپ ہیں کہ مسلسل..."

"بھئی۔ تم سے کس نے کہہ دیا۔ میری زندگی کے لیے فکر مند ہو۔" فیضان آنا کر بولے۔ "بے رنگ، روکھی پھیکی ہے لیکن میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں' مجھے کسی لائف پارٹنر کی ضرورت نہیں ہے۔ انبیا جیسی کسی اپیچور لڑکی کی تو ہرگز گنجائش نہیں ہے میری زندگی میں۔"

"کیوں؟" مادی نے سرد مہری سے کہا "صرف اس لیے کیونکہ ابھی تک آپ میری پھوپھی جان جیسی خود غرض عورت کو نہیں بھول سکے؟"

"اسٹاپ اٹ مادی!" فیضان نے غصے سے کہا۔

"مجھ پر یوں چلا کر آپ کچھ ثابت نہیں کر سکیں گے۔" مادی نے سرد مہری سے کہا تھا۔ "میں صرف آپ کو آپ کے ارادے سے باز رکھنے آئی تھی انبیا جیسی بہترین لڑکی کو رد کریں گے تو ساری زندگی پچھتانا پڑے گا۔ جس عورت نے آپ کو قبول نہیں کیا اس کا جوگ لے کر اپنی ساری زندگی کیوں خراب کر رہے ہیں آپ۔"

فیضان کا ہاتھ اٹھا اور مادی کے چہرے پر زوردار طمانچے کا نشان چھوڑ گیا' مادی کی آواز یوں بند ہو گئی تھی۔ جیسے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن کسی نے بند کر دیا ہو۔

"بار بار اس بات کا ذکر کر کے آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم۔" فیضان نے غضب ناک ہوتے ہوئے کہا۔

مادی نے جھکا سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور بنا ایک لفظ کہے تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

فیضان چند لمحے غصے سے سلگتے رہے پھر انہوں نے اپنا سر ہاتھوں میں گرا لیا۔ ایک اور پچھتاوا ان کے دامن سے لپٹ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆
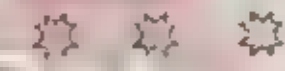
"انبیا! بیٹے! یہ چوٹ کیسے لگی؟"

انبیا اسٹڈی سے باہر جا رہی تھی جب دانیال حسن نے چونک کر پوچھا۔ وہ ان کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی تھی۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔ کالج میں سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔" اس نے وہی کہا جو پہلے بھی کہہ چکی تھی۔ دانیال حسن نے آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے انو! کہ تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو۔"

دانیال حسن نے الجھن آمیز انداز میں کہا۔ انبیا گڑبڑا سی گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دانیال حسن اس کا جھوٹ پکڑ سکیں گے۔

"میں جھوٹ کیوں بولوں گی ڈیڈی!" اس نے اپنی گڑبڑاہٹ پر قابو پاتے ہوئے بے وجہ ہنس کر کہا تھا۔

"ہوں۔" دانیال حسن کی الجھن دور نہیں ہوئی تھی مگر انہوں نے محض یہی کہا پھر کچھ خیال آنے پر پوچھنے لگے۔

"تم نے اپنی ممی کو بتایا؟"

"کس بارے میں؟" اب کی بار انبیا الجھی۔

"اسی چوٹ کے بارے میں۔" دانیال حسن نے ثروت کے ذکر پر دانستہ نظریں چراتے ہوئے کہا۔

انبیا خفیف سی ہو کر ہنس دی۔

"ڈیڈی! بہت معمولی سا زخم ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب اتنی سی چوٹ کے لیے ممی کو پریشان کیوں کروں؟"

"ہوں۔۔۔ ہاں۔ پھر بھی انو! تمہیں بتانا چاہیے اپنی ممی کو۔۔۔ خود تو اس عورت کو اولاد کی پروا نہیں ہے تو

ہو گئے، ہاں ہار کر بیٹھی ہوئی ہے انسان کو کم سے کم پیچھے رہ جانے والوں کی خبر تو لینا چاہیے۔"

دانیال حسن اپنی ٹیبل پر کچھ تلاش کرتے ہوئے بظاہر لاپروا لیکن جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

انبیا نے بغور انہیں دیکھا پھر ہنس دی۔

"آپ کو ممی یاد آ رہی ہیں تو انہیں فون کر کے بلوا لیں۔ بے شک میری چوٹ کا بہانا کر دیں لیکن بلانا انہیں آپ کو خود ہی پڑے گا۔ میری بات نہیں مانیں گی ممی۔ لیکن آپ کا کہا ٹالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

وہ ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے ڈیڈی! آپ کو میرا اس معاملے میں کچھ بھی کہنا اچھا نہ لگے لیکن مجھے اس کے سوا کوئی حل نظر نہیں آ رہا۔ آپ پلیز ممی کو واپس لے آئیں۔ میرے زخم کی پروا نہ کریں۔ یہ زخم تو بھر ہی جائے گا لیکن جو زخم دل پر لگے ہوں وہ کبھی نہیں بھرتے۔" اس نے جملہ مکمل کیا اور آہستگی سے دروازہ دھکیل کر باہر نکل گئی۔

دانیال حسن ششدر رہ گئے۔ وہ انبیا سے اتنی گہری باتوں کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ ہاں یہ درست تھا کہ وہ ثروت کی کمی بری طرح محسوس کر رہے تھے لیکن یہ ایسا سچ تھا جس کا اعتراف کرنے کی راہ میں ان کی انا حائل ہوتی تھی اور ساری زندگی وہ اپنی انا کا احترام کرتے آئے تھے لہٰذا اس وقت بھی گہری سوچ لاحق ہو جانے کے باوجود سر جھٹک کر کتاب پڑھنے لگے۔

☆ ☆ ☆

فجر کی نماز پڑھ کر انبیا نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند جیسے اس کی آنکھوں سے خفا ہو چکی تھی۔ دل کو عجیب سی بے چینی لاحق تھی۔ کچھ دیر وہ کروٹیں بدلتی رہی پھر سائیڈ ٹیبل دور ہٹا کر ٹیرس پر نکل آئی۔

رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے صبح کی اولین کرنوں نے چہرہ دکھا دیا تھا لیکن ابھی اتنی روشنی نہیں پھیلی تھی کہ روشنیاں گل کر دی جاتیں۔ انبیا ناٹیرس کی لائٹ آن کیے ٹیرس پر چکر لگانے لگی۔

باہر نور سناٹا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ نیم تاریک آسمان پر سفید بگلوں کی قطار پرواز کر رہی تھی وہ سر اٹھا کر پرندوں کو دیکھنے لگی پھر کھٹکے کی آواز پر سر جھکایا۔ ٹیرس کی گرل سے انیکسی کا برآمدہ دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی ابھی برآمدے کی روشنی جلائی گئی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر گرل کے قریب ہو کر اس طرف دیکھنے لگی۔ دروازہ کھول کر فیضان باہر آئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کچھ سامان تھا اور وہ روانگی کے لیے تیار لگ رہے تھے۔ انبیا کا دل یکدم جیسے کسی شکنجے میں جکڑا گیا۔

اس کا دل چاہا انہیں روک لے لیکن۔۔۔ تب ہی کسی احساس کے تحت فیضان نے سر اٹھا کر ٹیرس کی طرف دیکھا اس نیم تاریکی' نیم اجالے کے سنگم میں محض ایک پل کے لیے ان دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائی تھیں' انبیا تیزی سے پلٹ گئی۔

"کاش! آپ کو میرے چہرے میں کسی اور کا عکس ہی نظر آ گیا ہوتا۔"

اس کے دل سے ہوک سی اٹھی تھی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی یورش شروع ہو گئی تھی۔ دوسری جانب فیضان جانے سے قبل اس سے معافی مانگ لینا چاہتے تھے لیکن حالات نے اجازت دی نہ ہی انہوں نے حالات کو سازگار بنانے کی کوشش کی تھی لہٰذا اب ایسے کسی خیال کا کیا فائدہ تھا۔

وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنا سامان گاڑی میں رکھنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

بشریٰ نے جنت کے سامنے محض اپنی ہار تسلیم نہیں کی تھی بلکہ دل سے بھی اس کی غلام ہو گئی تھی۔ وہ جنت

کے سامنے زبان بند رکھتی یا اس کی ہاں میں ہاں ملاتی' اس کی تعریف کرتی' اس کی ہر غلط حرکت کو صحیح قرار دیتی وہ سمجھ چکی تھی اگر اسے اس حویلی میں رہنا ہے تو جنت سے ساتھ بنا کر رکھنے میں ہی عافیت ہے تب ہی اس نے دین محمد کے سامنے ـــــ کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ دین محمد کی غیر معمولی محبت نے جنت کو مزید بگاڑا تھا جو سوتیلی ماں کی جی حضوری نے دماغ بالکل ہی ساتویں آسمان پر پہنچا دیا' اس پر مستزاد سہیلیاں بھی ایسی ملی تھیں جو تعریفیں کر کر کے اس کو چنے کے جھاڑ پر چڑھائے رکھتیں اور سچی بات ہے کہ یہ تعریفیں کچھ ایسی بے جا بھی نہ تھیں' وہ بے تحاشا خوب صورت ہوتی جا رہی تھی۔ سمجھنا مشکل تھا' اتنی سی عمر میں اتنا ڈھیر سارا روپ وہ کہاں سے چرائے لا رہی ہے۔

انہی دنوں "وہ" چلا آیا۔ کسی نے بتایا اس کا نام فاروق ہے محکمہ زراعت کی طرف سے ملازم ہو کر اس گاؤں میں تعینات ہوا تھا' اونچا لمبا گبھرو جوان' اس پر نظر پڑتی تو لگتا دل تھم رہا ہے۔ فضاؤں میں خوشبو پھیل رہی ہے اور آسمان سے دھنک برسنے لگی ہے اور جب وہ دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے سینے سے دل کھینچ رہا ہو۔

جنت نے آج تک باپ کی بے تحاشا محبت' سہیلیوں کی چاپلوسی دیکھی تھی لیکن اس مرد کی ہر نظر ایک نیا تجربہ تھی اور وہ اس نظر کے زیر اثر ششدر سی کھڑی ہوا کی طرح اچانک زندگی میں در آنے والے احساس کو اپنے وجود سے ٹکراتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

فیضان کے جانے سے ثمینہ خاصی مطمئن ہو گئی تھیں اور اطمینان سے بیٹھی اس ساری صورت حال پر غور کر رہی تھیں کہ ماوی اپنے کمرے سے نکلی اور آکر صوفے پر لیٹ گئی۔

"ماما چلے گئے؟" اس نے آنکھیں بند کیے ہوئے پوچھا' ابھی سو کر اٹھی تھی' چہرے پر مند دھونے کے بعد کی تازگی تھی اور اعصاب پر نیند کی غنودگی۔

"ہاں۔ ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ تھی ان کی۔" ثمینہ نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت برا کیا ہے فیضان ماما نے۔" ماوی نے اپنے سر کے نیچے کشن رکھتے ہوئے کہا۔ "صرف اپنے ساتھ ہی نہیں انیہا کے ساتھ بھی برا کیا ہے۔ خوشیوں سے منہ موڑ کر چلے گئے۔ خوشیاں بار بار کسی کے دروازے پر دستک نہیں دیتیں۔"

"تمہیں اس کے ذاتی معاملے میں نہیں بولنا چاہیے تھا' ماوی۔"

"ذاتی معاملہ؟" ماوی بری طرح سلگ کر بولی۔ "یہ ذاتی معاملات کون سے ہوتے ہیں ممی! میری زندگی کے ہر چھوٹے بڑے فیصلے میں فیضان ماما شریک رہے ہیں۔ اسکول' کالج' یونیورسٹی تک کا چناؤ ان کے مشورے اور ان کی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا گیا حتیٰ کہ جب شہروز سے منگنی کی باری آئی تب بھی فیضان ماما کی مرضی زیادہ شامل تھی اس رشتے میں ـــــ اس وقت تو کسی نے اعتراض نہیں کیا کہ وہ میرے ذاتی معاملے میں دخل دے رہے ہیں اور اب ـــــ اگر میں ان کی شادی کے معاملے میں کچھ کرتی ہوں یا کہتی ہوں تو یہ ان کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی ہو گئی۔ بھئی واہ۔" اشتعال اور دکھ سے اس کی آواز تیز ہو گئی تھی اور آنکھوں میں نمی بھی دکھائی دینے لگی تھی۔

"ہمیشہ مجھ سے پہلے انہوں نے مجھے اپنی دوست کہا۔ کبھی بہن بنا لیتے تھے۔ لاڈ جتاتے ہوتے تو بھائی بنا لیتے۔ آج ہر رشتہ ایک طرف ڈال دیا ماما نے۔" اس نے آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑ ڈالا۔

"اچھا تم پاگل مت ہو۔" ثمینہ نے کہا "ویسے بھی اب تو فیضان جا چکا ہے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔" اس نے پختہ ارادے کے ساتھ کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

پاؤں سلیپر میں ڈالنے لگی۔

"جا کہاں رہی ہو؟" ثمینہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ابھی آتی ہوں۔"

"ارے رکو نا مجھے تم سے بات کرنا ہے۔"

"کون سی بات؟" ماوی نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"میں سوچ رہی تھی ماوی! تم نے اپنے بابا جان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں پوچھا۔" ثمینہ نے پر سوچ انداز میں کہا۔

"بابا جان کے بارے میں کیا پوچھوں؟ ان کے بارے میں تو میں سب کچھ جانتی ہوں۔" ماوی نے ہنس کر کہا۔

"کیا جانتی ہو؟"

"یہی کہ وہ کتنے بہترین اسٹوڈنٹ تھے۔ انہیں رائٹر کون سے پسند تھے انہیں سبزی اور پھل کون کون سے پسند تھے۔ میں نے ان کی ڈائریز پڑھی ہیں ممی! البم میں ان کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"نہیں ماوی! تم کچھ نہیں جانتیں۔ ڈائریز ہمیشہ کسی کی شخصیت کا ایک رخ جانتی ہیں۔ زندگیوں کے بہت سارے راز انہیں معلوم نہیں ہوتے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے اپنے باپ کی زندگی کے راز تم نہیں جان سکیں۔" ثمینہ نے گہری سانس لے کر سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلی دن بھر برسنے والی بارش کے بعد آج بے حد چمک دار دن طلوع ہوا تھا۔ ماوی نے برآمدے میں رک کر ہتھیلی سے آنکھوں پر چھجہ بنا کر دیکھا انیہا گیٹ کے قریب کھڑی کوریر سروس کے نمائندے سے کوئی پارسل وصول کر رہی تھی۔

ماوی وہیں رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

انیہا آئی تو اس کے ہاتھوں میں رنگ برنگی کا بہت سے خوب صورت سا بوکے (گل دستہ) تھا۔

"ارے اتنے خوب صورت پھول کس نے بھجوا دیے۔" ماوی نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"پتا نہیں۔ تم خود ہی دیکھ لو۔ جس نے بھی بھجوایا ہے تمہارے لیے بھجوایا ہے۔" انیہا نے کہا۔

"ارے۔" ماوی حیران ہوئی۔ "میرے لیے کس نے بھجوا دیے۔"

اس نے حیرت بھرے انداز میں بوکے انیہا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے درمیان میں لگا کارڈ نکال کر دیکھا۔ کارڈ بوکے سے بھی زیادہ خوب صورت تھا لیکن کسی کا نام نہیں لکھا تھا' ماوی الجھ کر کارڈ پر لکھی تحریر پڑھنے لگی۔

"میں اپنی ایڑی پہ اتنی تیزی سے گھومتا ہوں
کہ چار جانب تمام منظر بدل کے
نظارہ مسلسل میں ڈھل گئے ہیں
عجب تحرک ہے
اک فسوں ہے
ایک سپنا جو صرف اپنا ہے
تم نہیں ہو

کہو تو یہ گردش ماہ و سال
اپنی ایڑی پہ روک لوں میں؟
جو اک تسلسل ہے منظروں کا
وہ توڑ دوں میں؟
مگر یہ تب ہو سکے گا ممکن
اگر میرے ساتھ تم رکو تو

مادی نے متعجب سے انداز میں کارڈ الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن نتیجہ صفر۔

"یہ کون ہے بھئی سا اپنی ایڑیوں پر گھومنے والا۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"اپں۔" انبہا نے چونک کر اس کے ہاتھ سے کارڈ لے لیا۔ پوری نظم پڑھی پھر کارڈ اس کے سر پر مارا۔

"اتنی خوب صورت نظم کا ستیاناس مار دیا۔"

"اچھا یہ نظم ہے۔ یار! یہ شاعری میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا تھا "کوئی مجھے شاعری لکھ کر کیوں بھیجے گا؟ فیضان ماما نے تمہارے لیے بھجوائے ہوں گے۔"

مادی ابھی بھی خاصی پرامید تھی۔ انبہا نے کڑی نظروں سے اسے گھورا۔

"یہاں رہتے وہ مثبت جواب دے نہیں سکے۔ دبئی جا کر پھول بھجوائیں گے اونہہ۔" انبہا نے کارڈ مادی کے ہاتھ پر پٹخا۔

"ویسے بھی اس پر تمہارا نام لکھا ہے۔"

"مجھے کس نے بھجوا دیے یار!" مادی بیزار ہو کر برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی اور گلدستہ بھی نیچے رکھ دیا۔

"کیا پتا شہروز نے بھجوائے ہوں۔" انبہا نے بھی بافاصلے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شہروز اور پھول بھجوائے گا، ناممکن۔" مادی نے ہنس کر کہا تھا۔

"کیوں بھئی؟"

"شہروز نے آج تک مجھے پھول گفٹ نہیں کیے کیونکہ اس کا ماننا ہے تحفہ ہمیشہ ایسا ہونا چاہیے جو یوز فل (کارآمد) ہونے کے ساتھ ساتھ دیرپا بھی ہو۔ ایک مرتبہ اس نے میرے لیے پین خریدا جس کا کیپ ہٹاتے ہی اس میں سے لائٹ نکلتی تھی۔ اس نے کہا۔ مادی اب تمہیں لکھنے کے لیے لائٹ جلانا نہیں پڑے گی۔ اگلی بار اس نے میرے لیے ایک ہیر کلپ خریدا جس سے سر کا مساج بھی ہوتا تھا۔" وہ جل بھن کر لیکن مسکرا مسکرا کر بتا رہی تھی انبہا خوب ہنسی۔

"شہروز نہیں تو پھر کون بھجوا سکتا ہے؟ تم ایک بار پوچھ لو ممکن ہے اس کو اس بار پھول دینے کا خیال آگیا ہو۔"

"ہوں۔" مادی نے مثبت انداز میں کہا پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ہنسنے کے باوجود انبہا کے چہرے پر اضمحلال دکھائی دیتا تھا۔ آنکھوں کے گرد غیر واضح حلقے تھے۔

"آئی ایم سوری۔" مادی نے اچانک کہا۔

"کس لیے؟" انبہا متعجب ہوئی۔

"فیضان ماما چلے گئے۔ میں تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکی۔"

"تم نے تو کوشش کی تھی۔" انبہا سر جھکا کر برآمدے کے ٹائلز پر انگلی پھیرنے لگی۔

"بے کار کوشش۔ اونہہ۔ پہلے تمہیں چوٹ پہنچا دی پھر مجھے تھپڑ مار کر چلے گئے۔" مادی نے ناراضی سے کہا تھا۔

انبہا کا منہ کھل گیا۔

"انہوں نے تمہیں تھپڑ مارا؟ یا اللہ کتنے ہاتھ چھٹ ہیں تمہارے۔"

"ارے نہیں یار! بس دونوں بار کچھ جذباتی ہو گئے تھے ورنہ تو بڑے پولائٹ ہیں۔" مادی نے پھر فیضان کا ساتھ دیا۔

"جانے دو۔ تم تو یہی کہتی رہتی ہو۔" انبہا نے چڑ کر کہا۔ "میں تو سوچ رہی ہوں شکرانے کے نوافل پڑھوں اچھا ہوا انہوں نے کوئی پوزیٹو رسپانس نہیں دیا ورنہ ساری زندگی مجھے ان کے ہاتھوں پٹنا پڑتا۔ میں تو بھول رہی ہوں بھئی انہیں۔ تم بھی اس سارے قصے کو بھول جاؤ۔"

مادی نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ انبہا بول تو مستحکم لہجے میں رہی تھی لیکن مستقل نظریں چرا رہی تھی۔

"کہہ تو رہی ہو کہ بھول جاؤں گی لیکن کیا بھول پاؤ گی؟" مادی نے یکدم کہا انبہا کچھ بول نہ سکی۔

"میں تو ہرگز نہیں بھول سکتی اس قصے کو۔ ویسے میں سوچ چکی ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔" مادی نے مزید کہا تھا۔

"اب کیا کرو گی؟" انبہا نے پوچھا۔

"پھپھی جان کو تلاش کروں گی۔" مادی نے بالآخر بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی۔

"کیا؟" انبہا حیران ہوئی۔

"ہاں۔ میں پھپھی جان کو تلاش کروں گی۔ بس تم دعا کرو اس عرصے میں وہ بڑھی کھوسٹ ہو چکی ہوں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے ہوں۔ خوب صورت جلد عمر رسیدہ ہو کر لٹک چکی ہو۔ بال جھڑ گئے ہوں۔ ان میں اس خوب صورتی کی ذرا سی بھی رمق باقی نہ رہی ہو جسے دیکھ کر فیضان ماما ان پر فلیٹ ہوئے تھے۔ صرف ایک یہی راستہ ہے جس کے ذریعے فیضان ماما کے دل سے میری پھپھی جان کی تصویر اتار کر وہاں تمہاری تصویر لگائی جا سکتی ہے۔" وہ سنجیدہ تھی۔ انبہا ضرور اس کی باتیں سن کر چڑ گئی اور جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" وہ اندر چلی گئی۔

"ارے سنو تو انبہا! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم دیکھنا یہ ٹرک سچ مچ کام کرے گی۔" وہ آوازیں دیتی رہ گئی مگر انبہا نے ایک بھی نہ سنی۔ مادی نے مایوسی سے پھولوں کو دیکھا پھر گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا پتا اس بار شہروز کو مجھے پھول بھجوانے کا خیال آہی گیا ہو۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

صباحت گل

اس نے پاؤں میں آئے پتھر کو ایک زوردار ٹھوکر رسید کی تھی۔ دھول کا ایک مرغولہ سا اٹھا اور اس کے پہلے سے گرد آلود چہرے اور لباس سے لپٹ گیا مگر وہ بے نیاز ہر شے سے لاپروا چلتا رہا۔ فلور شاپ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی نظر پھولوں پر پڑی۔ تروتازہ سرخ گلابی سفید نارنجی... ہر قسم کے پھول اپنی بہار دکھا کر وہاں سے گزرتے لوگوں کو مجبور کر رہے تھے کہ جو انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ بھی پل بھر کو رک کر دیکھیں ضرور۔ وہ بے دلی سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ آج یہ پھول بھی اس کی پژمردگی کو سمیٹنے میں ناکام رہے تھے کیونکہ زندگی اس کے لیے پھولوں کی سیج نہیں... کانٹوں کی راہ گزر تھی اور وہ جواب تک بڑی ثابت قدمی اور حوصلے کے ساتھ ان کانٹوں کو چیرتا آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور وہ تمام خوش امیدیاں جو وقتاً فوقتاً اس کے گرتے حوصلوں کو سہارے فراہم کرتی تھیں۔ کانٹوں کے ساتھ جاملی تھیں۔

وہ جو چار سال سے بے روزگاری کا عذاب اپنے کاندھوں پر اٹھائے گھسٹ رہا تھا مگر اب ہانپنے لگا تھا کیونکہ اس کی واحد ہمدرد اور غمگسار اس کی ماں بھی اب اس سے عاجز اور بے زار ہوتی جارہی تھی... یا شاید اس سے نہیں' اس کی بے روزگاری سے... وہ بے چاری بھی کیا کرتی جو خود مجبور اور بے بس تھی۔ مہنگائی کے اس اندھے طوفان میں غریب اور سفید پوش لوگوں کے لیے کھڑے رہنا انتہائی دشوار ہو گیا تھا' ان کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے اور وہ بھی تو غریب ہی تھی پھر چار چار بیٹیوں کی ماں... جس کی واحد امید اس کا بیٹا تھا اور اب جب وہ امید بھی دم توڑتی نظر آرہی تھی تو وہ کہاں تک خود کو سنبھالتی لہٰذا بکھر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

نوید حسنین چار بہنوں کا اکلوتا بھائی اور اپنی ماں کا اکلوتا لخت جگر تھا۔ چار سال پہلے تک زندگی اس کے لیے اگر بہت اچھی نہیں تو اتنی بری بھی نہیں تھی۔ وہ [illegible] کے فائنل سمسٹر میں تھا۔ اس کے ابا حسنین [illegible] سیمنٹ [illegible] فیکٹری میں مزدور تھے... گزر بسر گو کہ بہت مشکل سے ہی ہو رہی تھی مگر چونکہ خوش امیدی کی تھنی چھاؤں ابھی چھتر تانے ہوئے تھی لہٰذا مزاجوں کو وہ تلخی جو صرف حالات کی دین ہوتی ہے' ابھی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ زمانے کی ہوا کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں نے بھی اپنے اکلوتے بیٹے کو افسر بنانے کے خواب آنکھوں میں سجا لیے تھے لہٰذا اپنی انتہائی محدود آمدنی سے [illegible] اس کے مستقبل کے لیے جوڑتی رہی اور اسی جمع پونجی کی بدولت شہر کی بہترین یونیورسٹی میں پڑھنے کا اس کا خواب تعبیر پاسکا تھا۔

خوابوں کی زمین کچھ اور وسیع تب ہوئی جب اس کا رزلٹ آیا۔ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا تھا۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس خوشی کو سیلیبریٹ کرتے ہی وہ بڑے اعتماد سے اپنی ڈگریاں سنبھالے اس کارزار میں کود پڑا تھا جس نے بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ شروع شروع میں تو ناکامی اس کی ہمت کو اور

[illegible] کچھ کر دکھانے کا جذبہ [illegible] تھی مگر رفتہ رفتہ مسلسل ناکامی کے بہتے [illegible] سے اس کے حوصلوں کی ناؤ ڈوبنے لگی۔ ایک سال دو' پھر تین' [illegible] اور پھر چار سال بعد اس ناؤ میں اتنے سوراخ ہو گئے تھے کہ اس کا اپنا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا تھا۔

گھر کی فضا میں لہجوں کی تلخی زہر بن کر پھیل چکی تھی۔ ابا کا بوڑھا وجود اب مزید بوجھ سہارنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اوپر سے چار بیٹیوں کی ذمہ داری۔ حسنہ اور زارا تو پھر بھی ابھی چھوٹی تھیں مگر روبانہ اور نعمانہ شادی کے قابل ہو چکی تھیں۔ روبانہ بچپن سے ہی اپنے تایازاد محبوب سے منسوب تھی مگر نعمانہ کی ابھی کہیں کوئی بات نہیں بنی تھی۔ بنتی بھی کیسے... ان کے گھر کے حالات دیکھ کر جو بھی جاتا پلٹ کر واپس نہیں آتا تھا۔ تایا بھی شادی پر زور ڈال رہے تھے ان ہی فکرات نے اماں کی زبان پر کانٹے اگا دیے تھے۔ ہر وقت کڑوی رہتیں۔ [illegible] ایک بار پھر [illegible] اس کے سامنے ناشتہ [illegible] اور [illegible] نا پسند [illegible]۔

"آج پھر جانے نوکری کے لیے...؟"

اس کی نظر جائے پاپوں پر تھی۔ اسے پاپے سخت ناپسند تھے مگر پچھلے کئی دنوں سے وہ ناشتے میں یہی کھانے پر مجبور تھا اور اوپر سے اماں کا سوال... جواب دینے کو کچھ تھا ہی نہیں وہ بات بدلنے کو بولا۔

"اماں! آج پھر پاپے۔ گھر میں آٹا نہیں ہے کیا؟ تم جانتی تو ہو مجھے پاپے سخت ناپسند ہیں۔" اماں جو پہلے ہی نہ جانے کس بات پر بھری بیٹھی تھیں اس کے منہ بنانے پر تو پھٹ ہی پڑیں۔

"پاپ مسٹر لگا ہے نا' تمہارا جو یوں نخرے دکھا رہے ہو۔ باتیں تو ایسے بنا رہے ہو جیسے ہر مہینے بیس' پچیس ہزار میری ہتھیلی پر لا کر رکھتے ہو اور پھر بھی میں تمہیں پاپے ہی کھانے کو دیتی ہوں۔ جو دو وقت کی مل جاتی ہے نا! اسی کو غنیمت جانو اور یہ بھی وہ غریب اس بڑھاپے میں جانے کس طرح کما کے لاتا ہے۔ اپنی آوارہ گردیوں سے فرصت مل جائے تو کبھی بازار جا کر آٹے کا بھاؤ معلوم کرلینا' سونے کے مول بک رہا ہے پاپے ناپسند ہیں۔"

"اماں! آپ بھی..." ان کی آوارہ گردی والی بات پر اسے شدید صدمہ پہنچا تھا۔

"آپ کے تو سب کچھ سامنے ہے۔ میرے چار سالوں کا ایک ایک پل۔ کہاں کہاں میں نے جوتیاں نہیں چٹخائیں' سارا سارا دن تک بھوکے پیاسے دفتروں کے چکر کاٹے ہیں پھر بھی نوکری نہیں ملی تو کیا

سولی پر چڑھ جاؤں۔"

اس کے چہرے پر ایسا کچھ ضرور تھا کہ پل بھر کو اماں بھی خاموش سی ہو گئیں۔ نوید نے ان کا چہرہ دیکھا جہاں دکھ عمر سے بہت پہلے جھریاں بن کر بچھ رہا تھا۔ اس نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"میری پیاری اماں۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کس قدر پریشان ہیں خاص کر نغمانہ اور روبانہ کی وجہ سے مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میرے حوالے سے آپ نے کتنے خواب دیکھ رکھے ہیں۔ کس طرح اپنا پیٹ کاٹ کر میری تعلیم کے لیے پائی پائی جوڑی اور مجھے پڑھایا لکھایا۔ مجھے سب احساس ہے اماں اور آپ بالکل فکر نہ کریں۔ چار سال ہی ہوئے ہیں نا چار صدیاں تو نہیں۔۔۔ میں مسلسل کوشش کر رہا ہوں۔ آپ دیکھیے گا جلد ہی مجھے نوکری مل جائے گی۔" وہ خود مایوسی کے اندھیروں میں گھرا اماں کو امید کی ڈور پکڑا رہا تھا۔

"بس رہنے دو یہ جھوٹی تسلیاں۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"مجھے پھر سے وہی خواب مت دکھاؤ جو مجھے اور بے سکون کر دیں۔ اور اب تو مجھے ان پیسوں پر بھی افسوس ہوتا ہے جو میں نے تمہاری تعلیم پر خرچ کیے۔ کیا فائدہ ہوا۔۔۔ ضائع ہی گئے نا' اگر آج وہ میرے پاس ہوتے تو کم از کم تمہاری بہنوں کی شادیاں تو کر سکتی تھی۔" ان کے لہجے میں احساس زیاں بول رہا تھا' نوید نے دونوں ہاتھوں میں اپنے بال جکڑ لیے۔

"میں کیا کروں اماں! کوشش کر تو رہا ہوں مگر میں مجبور ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا تو اماں پھر بھڑک اٹھیں۔

"تم مجبور ہو تو آرام سے بیٹھے رہو مگر اتنا دھیان رکھنا کہ تمہارا ماموں تمہاری طرح مجبور نہیں ہے اسی لیے وہ لوگ بسمہ کا رشتہ کہیں اور کرنے کا سوچ رہے ہیں۔" اماں کی تازہ ترین برہمی کی وجہ سامنے آ گئی تھی۔ چارپائی پر دراز نوید جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"کیا مطلب۔۔۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔"

"مطلب وطلب کچھ نہیں' صاف بات ہے کہ وہ لوگ اب مزید انتظار نہیں کر سکتے۔ کل گئی تھی میں بھائی کی طرف' بھابھی نے صاف کہہ دیا کہ اگر ایک مہینے کے اندر اندر نوکری کا انتظام نہ ہوا تو وہ لوگ بسمہ کا رشتہ اس کی خالہ کی طرف کر دیں گے۔ وہ لوگ بھی کافی عرصہ سے پیچھے پڑے ہیں۔ تمہاری ممانی کا جی تو شروع سے ہی ادھر تھا مگر غیاث بھائی نے سب کو چھوڑ کر بسمہ ہمیں دی تھی پر اب وہ لوگ بھی کیا کریں۔ ساری زندگی تو بیٹی کو بٹھا کر نہیں رکھ سکتے نا! اس مہینے پورے بائیس کی ہو جائے گی بسمہ۔" وہ برتنوں پر غصہ نکالتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔ نوید کا تو خون ہی کھول اٹھا۔

"ایسے کیسے کر سکتے ہیں' مذاق سمجھ رکھا ہے رشتوں کو۔" وہ بگڑ کر بولا تو اماں تلملا اٹھیں۔

"کیا کرو گے تم؟ کیا کر سکتے ہو؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں یہ تو وقت ہی بتائے گا مگر آپ ماموں ممانی کو اچھی طرح سمجھا دیں' ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بسمہ میری عزت ہے اور اپنی عزت کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" وہ دو ٹوک انداز میں اپنی بات کہہ کر راستے میں آتی ہر چیز کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔

بسمہ غیاث اس کے اکلوتے ماموں کی اکلوتی بیٹی تھی اور اسے بچپن سے ہی بہت اچھی لگتی تھی لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوا' یہ احساس ہوا کہ یہ پسندیدگی بڑھ کر کچھ ہے۔ شاید محبت۔ اس نے اماں سے بات کی اور ان کے لیے اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا تھا کہ ان کی اکلوتی بھتیجی ان کی بہو بنے' لہٰذا وہ اگلے ہی دن بھائی کے گھر رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ انکار کا تو سوال ہی کیا تھا کیونکہ پورے خاندان میں نوید جتنا پڑھا لکھا اور ہینڈسم لڑکا دوسرا کوئی نہیں تھا۔ یوں بسمہ اس کے نام ہو گئی اور شادی جاب ہونے تک موخر کر دی گئی مگر چار برس ہونے کو آئے اور جاب تھی کہ مل کر ہی نہیں دے رہی تھی اور اب یہ نئی ٹینشن۔۔۔ وہ سخت پریشان تھا۔ ایک مہینے میں جاب کا بندوبست کہاں سے ہوتا

اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور بار بار آنکھوں میں در آنے والی بسمہ کی معصوم صورت نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔

☆☆

اس نے چونک کر ارد گرد دیکھا۔ سوچ کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی دور نکل آیا تھا۔ یہ ایک پوش ایریا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف بنے بڑے بڑے گھر وہاں کے مکینوں کی مالی حیثیت کا پتہ دے رہے تھے۔ سہ پہر کا سورج آگ برسانے میں کسی قسم کی رعایت سے کام نہیں لے رہا تھا اور اوپر سے بھوک تھی کہ الگ بے حال کیے دے رہی تھی۔

"آج کا دن ہی خراب ہے اور اوپر سے صبح سویرے جھگڑا بھلا جس دن کا آغاز ایسا ہو' اس کا انجام کیا ہو گا۔"

وہ غصے میں بڑبڑاتا سر جھکائے آگے بڑھ رہا تھا جب اس کی نظر ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے رکی گاڑی پر پڑی' قریب ہی ایک کوٹھی تھی' اس کے گیٹ کا رنگ بھی نیلا تھا' ایک شخص نہایت عجلت میں برآمد ہوا۔ اس نے ہاتھوں میں چند نسبتاً چھوٹے بیگ انتہائی بے ترتیبی سے رکھے تھے۔ نوید کا خدشہ سچ ثابت ہوا اور اس کے گاڑی میں بیٹھنے کے دوران ہی افراتفری میں ایک بیگ پھسل کر نیچے گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگ کر انہیں اس کے بارے میں بتاتا' وہ زن سے گاڑی بھگا کر لے گئے۔

"کیا مصیبت ہے۔۔۔" اس نئی صورت حال پر جھنجلاتے ہوئے نوید نے آگے بڑھ کر بیگ اٹھا لیا۔ کوٹھی کا گیٹ بند تھا۔ اس نے اوپر نیچے ہلا کر بیگ کے وزن کا اندازہ کرنا چاہا۔ وہ قدرے بھاری تھا۔

"جانے اس میں کیا ہے؟" تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے بیگ کو کھولا اور دنگ رہ گیا۔ وہ پیسوں سے بھرا تھا۔ نوید نے بے اختیار ادھر ادھر دیکھا۔۔۔ گلی بالکل خالی تھی۔ وہ جلدی سے بیگ لے کر ایک خالی

پلاٹ میں اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپ گیا' جو شاید تعمیر کی غرض سے وہاں پھینکی گئی تھیں اور نوٹ گننا شروع کیے۔ پانچ پانچ ہزار کے پورے سو نوٹ تھے یعنی پورے پانچ لاکھ روپے۔

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ان پیسوں سے اسے اپنے مستقبل کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں صاف ہوتی محسوس ہو رہی تھیں اور دل چند ہی لمحوں میں خواب بننے لگا تھا۔

"اب سب سے پہلے میں ان پیسوں سے کوئی چھوٹا موٹا کام شروع کروں گا' پھر جب کام چل جائے گا تو کسی اچھی سی جگہ پر گھر بناؤں گا' اپنی بہنوں کی شادیاں کروں گا۔۔۔ بسمہ کو اپنے آنگن کی زینت بناؤں گا اور ہاں۔۔۔ پھر اماں کو بھی کام پر جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

وہ سرشار سا پلان بناتا وہاں سے اٹھا' سڑک پر آ کر اس نے ایک بار پھر اطمینان کیا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا۔ مطمئن ہو کر وہ دیواروں کے سائے میں تیز تیز چلنے لگا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے دور نکل جانا چاہتا تھا کہ ایک خیال نے اس کے تیزی سے اٹھتے قدموں کو جیسے جکڑ کر رکھ دیا۔

"میں کس سے بھاگ رہا ہوں۔۔۔ ان لوگوں سے' جو خود میری طرح اس دنیا کی ہوس میں مبتلا' اچھائی اور برائی کا فرق تک بھلا چکے ہیں۔۔۔ میں ان سے خوف زدہ ہوں اور وہ اللہ جو اوپر بیٹھا میری ہر ہر جنبش کو دیکھ رہا ہے۔ جو دلوں میں چھپے بھیدوں تک سے واقف ہے' اس سے بھاگ کر کہاں جاؤں۔۔۔؟" ایک لمحے کی بات تھی۔ اس کے پھرتیلے قدم جیسے یکدم بے جان ہو گئے' وہ لڑکھڑاتا وہیں دیوار کے سہارے بیٹھتا چلا گیا۔

یہ احساس ہی اتنا طاقت ور تھا کہ وہ سراپا پسینے میں نہا گیا۔

"تم اس دنیا سے ڈر رہے ہو اور وہ ذات کہ جس کا ڈر دنیا اور آخرت دونوں سنوار دیتا ہے' اس سے یکسر غافل اور بے نیاز۔۔۔" ایک آواز اس کے اندر ابھری اور اگلے ہی پل وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"یا اللہ! یہ میں کیا کرنے چلا تھا۔ اپنی دنیا اور آخرت دونوں قربان کرنے چلا تھا اور وہ بھی اتنے حقیر داموں۔" اس کی آواز بے تحاشا کانپ رہی تھی۔

"مجھے معاف کر دے میرے مولا۔۔۔ بے شک میں بڑے گھاٹے کا سودا کرنے چلا تھا مگر تو نے اپنی رحمتوں کا سہارا دے کر مجھے بچا لیا اور بلاشبہ تو تمام رحمتوں، تمام قدرتوں کا مالک ہے۔ مجھے ہمت دے میرے رب اور میرے ایمان کی حفاظت فرما۔۔۔ بے شک تو ہی محافظ و نگہبان کافی ہے۔"

اپنے رب کی مدد کا یقین لے کر وہ ایک نئے جذبے کے ساتھ اٹھا تھا کہ اس نے آنسوؤں سے تربتر اپنا چہرہ بھی صاف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کا دل سکون سے لبریز تھا اور اس کے پیروں میں جیسے کسی نے بجلی سے بھر دی تھی۔ نیلے گیٹ کے برابر لگی بیل پر انگلی رکھتے ہوئے اس کی نظر بے ساختہ اوپر اٹھی جہاں خواجہ حسن کا نام جگمگا رہا تھا۔

"مجھے خواجہ حسن سے ملنا ہے۔" چوکیدار کے گیٹ کھولتے ہی نوید نے بیگ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ چوکیدار نے اس کے ابتر حلیے اور بھیگے چہرے کو حیرت سے دیکھا مگر اس کی آنکھوں سے جھانکتی سنجیدگی کے پیش نظر بولا تو صرف اتنا۔

"صاب تو اس وقت فیکٹری میں ہوتا ہے جی۔۔۔ کوئی ضروری کام ہے تو وہیں جا کر مل لو۔"

"اوہ۔۔۔ تو یہ خواجہ گلاس فیکٹری والے خواجہ حسن ہیں۔" اس نے سوچا اور قریب سے گزرتے رکشے کو ہاتھ دے دیا۔

☆ ☆ ☆

فیکٹری جانے کے بجائے وہ سیدھا ان کے آفس پہنچا تھا۔ سامنے ہی ایک لڑکی کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہی تھی وہ اس کے پاس چلا آیا۔

"ایکسکیوز می!" اس نے اسے متوجہ کیا۔

"میں نوید حسنین ہوں اور مجھے بہت ضروری کام کے سلسلے میں خواجہ صاحب سے ملنا ہے۔"

"آپ کی ان سے کوئی اپائنٹمنٹ۔۔۔" اس نے کی بورڈ پر تیزی سے چلتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"جی نہیں، اپائنٹمنٹ تو کوئی نہیں ہے مگر آپ انہیں بتائیے کہ میرے پاس ان کی ایک امانت ہے۔" لڑکی نے پل بھر رک کر اس کے لہجے کی سچائی کو جانچا اور پوری بات من و عن اندر پہنچا دی۔

"آپ پلیز۔ اندر چلے جائیں۔" لڑکی کی نشان دہی پر وہ ایک کمرے کے سامنے رکا، دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی میز کے دوسری طرف پچاس پچپن سال کا ایک سوبر سا شخص کسی سے محو گفتگو تھا۔

"میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا قریشی صاحب کہ آخر وہ بیگ گیا تو گیا کہاں۔۔۔ آپ نے اپنی نگرانی میں تو تمام بیگ رکھوائے تھے نا!" اتنا کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگے پھر چند لمحوں بعد دوبارہ بولے۔

"ٹھیک ہے قریشی صاحب! اب تو کل صبح بینک کھلنے پر ہی کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے تو سوچا تھا آج کی [illegible] شروع کی جا سکتی ہے۔ خیر۔۔۔ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ او کے پھر کل بات ہوتی ہے۔" وہ فون رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی۔۔۔ تو کون سی امانت لوٹانا چاہتے تھے آپ مجھے؟" وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نوید نے بیگ اٹھا کر ان کی ٹیبل پر رکھا۔

"یہ کچھ پیسے تھے آپ کے میرے پاس۔"

"میرے پیسے۔۔۔؟" انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "مگر مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ ہماری پہلے کبھی ملاقات بھی ہوئی ہو، کہاں کہ قرض دینا۔"

"نو سر! یہ قرض نہیں ہے۔" وہ انہیں حقیقت سے آگاہ کرنے لگا۔

سادگی سے اپنی بات مکمل کر کے اس نے بیگ خواجہ حسن کی طرف کھسکا دیا جو ناقابل بیان تاثرات کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے جواب میں وہ کیا کہیں۔ بہت دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئے بھی تو آواز میں بے یقینی

نمایاں تھی۔

"آج کل کے دور میں کہ جب دولت کی ہوس نے باپ بیٹے کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے، تم سب کچھ جانتے بوجھتے بھی یہ پیسوں سے بھرا بیگ مجھے واپس کرنے چلے آئے۔ کیا ایک بار بھی تمہارے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ یہ پیسے تمہاری زندگی سنوار سکتے ہیں۔" ان کے الجھے انداز پر نوید دھیرے سے مسکرایا۔

"بندہ بشر ہوں سر، خطا کا پتلا۔۔۔ مگر شکر ہے اس خدا کا جو ایمان اور نیتوں کا محافظ ہے۔" اس کے مبہم الفاظ میں سب کچھ واضح تھا۔ خواجہ حسن کی پرسوچ نظریں اس کی ذات کو کھوجنے لگیں۔

"کرتے کیا ہو۔۔۔؟" کافی دیر بعد انہوں نے پوچھا تھا۔

"انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا ہے اور چار سال سے بے روزگار ہوں۔"

"میرے پاس جاب کرو گے؟" خواجہ حسن نے جیسے پل میں فیصلہ کیا تھا۔

"جی۔۔۔؟" نوید نے جھٹکے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی بے یقینی تھی جو کچھ دیر قبل خواجہ حسن کی آنکھوں میں تھی۔

"دراصل مجھے اپنے فیکٹری ورکرز کی سپرویژن کے لیے ایک ایماندار آدمی کی ضرورت ہے۔" وہ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے اسے تفصیل سے آگاہ کرنے لگے۔

"ایمان دار کا خصوصی لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کیونکہ میرا پرانا سپروائزر کچھ ہی دن قبل میرے پانچ سالہ نمک کو حرام کرتے ہوئے مجھے دغا دے کر فرار ہو چکا ہے لہٰذا نئے ایمپلائی کی سلیکشن میں میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہوں مگر آج تمہیں دیکھ کر مجھے احساس ہوا ہے کہ تم سے بہتر شخص اس سیٹ کے لیے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ جو انسان ایک اجنبی کے مال کے لیے اتنا پوزیسو ہو سکتا ہے تو اپنے مالک کے لیے اس کے خلوص کی حد کیا ہوگی میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔ ہاں۔۔۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو بتاؤ۔" اپنی بات کے اختتام پر انہوں نے اس سے پوچھا تو وہ جو سکتے کی حالت میں انہیں سن رہا تھا، جیسے یکدم ہوش میں آ گیا۔

"نو۔۔۔ نو سر" اس کا سر بے اختیار نفی میں ہلا تھا۔

"دین کانگریچولیشنز ینگ مین۔۔۔ آج سے تم خواجہ گلاس فیکٹری کا حصہ ہو۔ کل صبح ٹھیک نو بجے آفس آ جانا، اسٹاف سے تمہارا تعارف بھی ہو جائے گا اور باقی معاملات بھی طے کر لیں گے۔" نوید سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بولے تھے۔

"بہت بہت شکریہ سر، بڑی مہربانی۔۔۔ جو ذمہ داری آپ نے مجھے سونپی ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ مجھے اپنی امیدوں سے بڑھ کر پائیں گے۔ تھینک یو سر۔"

خوشی سے بے قابو ہوتی اس کی آواز نے خواجہ حسن کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ وہاں سے نکل کر وہ باہر آیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ نوید حسنین جو صبح [illegible] اپنی چار سالہ بے روزگاری سے تنگ اپنی ماں سے لڑ کر گھر سے نکلا تھا، اس دن کے اختتام پر شہر کی سب سے بڑی فیکٹری کا سپروائزر بن چکا ہوگا۔ اس نے بے حد محبت سے آسمان کی وسعتوں کے پار اس ہستی کو دیکھا تھا جس نے ایک راست قدم کے بدلے اس کا کشکول اپنی رحمتوں سے بھر دیا تھا۔

واپسی کا سفر اس کے لیے ہرگز دشوار نہیں تھا کیونکہ اس کی نگاہوں میں اس کی ماں کا خوشی سے چمکتا چہرہ تھا۔ اس کے باپ کی فخر سے تنی ہوئی گردن تھی۔ اس کی بہنوں کی نئی زندگیوں کی نوید تھی اور بسمہ کی محبت سے لبریز آنکھیں، جنہیں اب اس کا نصیب بننے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

☆

فائدہ

موسم کی خرابی کے باعث
فلائٹ لیٹ ہوگئی
تو سوچا تم سے بات کرلوں
پانچ سال کا ایگریمنٹ ہے
جو ایکسٹینڈ بھی ہوسکتا ہے
اس لیے
میں کوشش کروں گا
مگر تم....
اُس کا جملہ اُدھورا ہوتے ہوئے بھی
پورا تھا
اور
اچھا ہی ہوا اُس روز موسم خراب تھا
کہ آندھیوں کے شور میں
آئینے ٹوٹنے کی آواز
کوئی نہ سن سکا

رخسانہ نگار

کوئی موجِ گل سے کہہ دے نہ چلے مچل مچل کے
وہ نظر بدل گئی ہے مری زندگی بدل کے

شبِ ماہ مختصر تھی، مجھے ہائے کیا خبر تھی
کہ طلوع پھر نہ ہوگا مرا ماہتاب ڈھل کے

مری مشکلات تم نے کچھ اور ہی بڑھا دیں
رہِ زندگی میں دو دن مرے ساتھ ساتھ چل کے

نہ بہ نازِ نگہِ ساقی نہ برسمِ بے نیازی
ترے پاس آ رہے ہیں ہم کئی راستے بدل کے

تیری بزم کے چراغوں کا نیا ہی رنگ دیکھا
کوئی مشتعل ہے بجھ کے، کوئی مطمئن ہے جل کے

کئی آندھیوں میں اُلجھے، کئی ظلمتوں میں ڈوبے
تیری آرزو کے لیکن نہ بجھے چراغ جل کے

نہ ادیب کیوں دوبالا ہو جمالِ مہ وشوں کا
غزل اُن کا آئینہ ہے، یہ سنگھار ہیں غزل کے

ادیب سہارن پوری

آنکھوں میں ہے رات الگ
خوابوں کی ہے بات الگ

ایک تو کچا گھر اپنا
ہے موسم برسات الگ

دیکھو ذرا ہم دونوں کو
کر دیں [illegible] حالات الگ

ایک تو روگ محبت کا
اور اس پر صدمات الگ

دونوں کی تقدیر جدا
دونوں کے جذبات الگ

سید نعیم الدین

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے، وہ ایسے کہاں کے ہیں

کیا اضطرابِ شوق نے مجھ کو خجل کیا
وہ پوچھتے ہیں، کہیے، ارادے کہاں کے ہیں

عاشق ترے عدم کو گئے کس قدر تباہ
پوچھا ہر ایک نے یہ مسافر کہاں کے ہیں

ہر چند داغ ایک ہی عیار ہے مگر
دشمن بھی تو چھٹے ہوئے سارے جہاں کے ہیں

داغ دہلوی

نورین نقش عرفان ______ سرگودھا
پلکوں کے کنارے جو ہم نے کبھی بھگوئے نہیں
انہیں لگتا ہے کہ ہم کبھی روئے نہیں
پوچھتے ہیں کہ کیسے دیکھتے ہو سپنوں میں
انہیں کیا معلوم کہ ہم برسوں سے سوئے نہیں

ثمر بھٹی ______ چک نمبر ... ب
سوچ کر چنی ہے میں نے آخری آرام گاہ
میں تھا مٹی اور مجھے مٹی کا گھر اچھا لگا
منزلوں کی بات چھوڑو کس نے پائیں منزلیں
اک سفر اچھا لگا اک ہم سفر اچھا لگا

سدرہ تحسین ______ چوک اعظم لیہ
لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
مستقل ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے

حنا نسیم اعوان ______ گوٹھ آخون بدین
اک ملچہ مجھے رہتی ہے تازہ اک شکایت
کبھی تجھ سے کبھی خود سے کبھی اس زندگی سے
وہ بے بسی کا عالم ہے کہ دل یہ چاہتا ہے
کہیں روپوش ہو جاؤں اچانک خامشی سے

رخسانہ سیر ______ چکوال
سودا جنوں کا سر سے اتر تو نہیں گیا
مجنوں نکل کے دشت سے گھر تو نہیں گیا
پوچھا نہ پھر پلٹ کے اسیر جنوں کا حال
تجھ سے بچھڑ کے جاں سے گزر تو نہیں گیا

سونیا ربانی ______ قاضیاں محلہ بالا
کب تک کیے جاؤں اسے پیار مسلسل
وہ شخص کیے جاتا ہے انکار مسلسل
اس شخص کو اندازہ نہیں میری نفرت کا شاید
اس شخص نے دیکھا ہے میرا پیار مسلسل

صبا افضل بٹ ______ دینالہ خورد
درد کے سمندر کو اتارا کب تھا
ہم تو ڈوب گئے تھے تم کو پکارا کب تھا
سب فیصلے تو قدرت طے کر چکی تھی پہلے
ہمارے ہاتھ میں مقدر کا ستارہ کب تھا

عقیلہ حنا ______ دینالہ خورد
اداس شاموں کا تم کچھ حساب رکھ لینا
دل حزیں میں محبت کا باب رکھ لینا
نہ بیٹھنا کبھی تنہا اداس موسم میں
نظر کے سامنے دل کی کتاب رکھ لینا

مسز بشریٰ نصرت ______ دینالہ خورد
[illegible]
[illegible]

... خان ______ کوئٹہ
دل بیچنے آئے تیرے بازار کی جانب
تکتے رہے حسرت سے خریدار کی جانب
کیا خوب کرشمہ ہے تیرے دست شفا کا
پھر زندگی لوٹ آئی ہے بیمار کی جانب

رقیہ اسماعیل ______ بزمان
مٹا دو چاہے میرا نام تک کتاب زندگی سے
مگر کسی پل تو رلائے گی تمہیں کمی میری

شائستہ اکبر ______ ڈگری کالج گڈو
وہاں تک لے گئی مجھ کو میری انا محسن
جہاں جا کر مقدر کے ستارے ٹوٹ جاتے ہیں

ام عمیرہ ______ نوتھیہ گلباد
ضبط غم آسان نہیں غالب!
آگ ہوتے ہیں وہ آنسو جو پیے جاتے ہیں

شہناز شاہد بہانہ ______ خانیوال
رنگ ... کتنے مردہ تجربے زندہ ہوئے
یاد آئے دیکھ کر تجھ کو کئی بھولے ہوئے نام
[illegible]
کچھ تیری صبحوں کے نام کچھ تیری شاموں کے نام

سحرش خان ______ لاڑکانہ
جب کوئی میرے ہاتھ میں تقدیر دیکھتا
میں جھک کے اپنے پاؤں میں زنجیر دیکھتا
اک خواب تھا بہت ہی پرانا جھٹک دیا
کب تک نقش خیال کی تصویر دیکھتا

نمرہ افسر ______ کراچی
شب بھر کی مسافت ہے گواہی کی طلب گار
اے صبح سفر اپنا ستارہ مجھے دینا
اک دشت کا میلہ کہ لگا ہے دل و جاں میں
اک درد کی آواز کہ رستہ مجھے دینا

شبنم شہزاد ______ بزمان
[illegible]
[illegible]

عائشہ شفیع الرحمان ______ مانڈہ
ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے
اب اس پیڑ کے پتے جھڑتے جاتے ہیں
جب بھی نئے سفر پر جاتا ہوں ناصر
پچھلے سفر کے ساتھی دھیان میں آتے ہیں

رقیہ اشفیس ______ بزمان
بند ہاتھوں کا مقدر تو سبھی کرتے ہیں مگر
سارے جگنو اڑ گئے دیکھا جو مٹھی کھول کر
شہر والے جھوٹ پر رکھتے ہیں بنیاد خلوص
مجھ کو پچھتانا پڑا محسن یہاں سچ بول کر

رشیدہ بتول ______ کراچی
اب کے کچھ پیار عجیب ہی سا ہوا ہے محسن
سرد شاموں کی طرح، گرم سویروں جیسا

الماس تنویر ______ ہری پور
ہم سے تو بہت اور بھی مل جائیں گے تم کو
ہے بات بس اتنی سی کہ نایاب یہ دل ہے

شگفتہ اعجاز ______ کراچی
ملنے آئے ہو چھوڑنے کے لیے
اس تکلف کی کیا ضرورت تھی

غزل قمر ______ کراچی
یوں ہی شاید کوئی تسکین کی صورت نکلے
آؤ افسانۂ آغاز وفا دہرائیں

نعم عنبر ______ فیصل آباد
کاش اس کو یہ معلوم ہو عدم
وہ ہمیں زندگی سے بھی پیارا ہے

نوشین اقبال نوشی ______ گاؤں بدو مرجان
وہ لوگ تم دل کو لگا لیتے ہو اور لوگ میسر
ربط کتنا بھی گہرا ہو دو دن میں بھلا دیتے ہیں

صبا طارق ______ گوجرانوالہ
بیکراں تشہیر تو بہت بڑی شے ہے
ہم تو اخبار کی سرخی سے سہم جاتے ہیں

ردا شفیق ______ ڈلوال
[illegible]
فیصلہ کی گھڑی ہے چلو بکھر جائیں
تیرا اور دکھ سچ ہے مگر نہیں تجھ سے
وہ عشق ہے کہ تجھے سوچ کر ہی مر جائیں

کرن ... ______ بنوں
حادثے سے بڑا حادثہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں حادثہ دیکھ کر

عفت جبیں ______ فیصل آباد
راز دلوں کے کہہ جاتے ہیں جاگی آنکھوں دیکھے خواب
موسم کے دکھ بھی سہہ جاتے ہیں جاگی آنکھوں دیکھے خواب
سنگ چھپے ہوں لفظوں میں اور نشتر ہوں گر لہجوں میں
آنسو بن کر بہہ جاتے ہیں جاگی آنکھوں دیکھے خواب

حرا شاہ ______ شجاع آباد
تیری آنکھوں میں جو نمی سی ہے
وہ میری ذات کی کمی سی ہے
کوئی رو دیا ہے چھپ کے تاروں میں
آج پھر رات شبنمی سی ہے

دستک دستک دستک

شاہین رشید

عائشہ خان' جونیئر

"جی کیا حال ہیں؟ گزشتہ دنوں ایک خبر نے بہت ٹنشن کیا؟"

"ارے وہ تو صرف' ایک مذاق تھا اور پھر اس کی وضاحت بھی کردی گئی تھی' بس جس نے ادھوری خبر سنی' انہوں نے یقین کرلیا اور جنہوں نے پوری خبر سنی' انہوں نے انجوائے کیا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہمارا ایک ڈرامہ آن ایئر ہے "تم ہو کہ چپ" اس میں میری اور ہمایوں سعید کی شادی ہوئی اور اس حوالے سے یعنی ڈرامے کے حوالے سے اس چینل پہ بات ہوئی اور بس۔۔۔ اللہ خیر کرے ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"بحیثیت فنکار آپ کی دوستی کیسی ہے ان سے؟"

"بہت اچھی دوستی ہے۔۔۔ وہ بہت اچھا انسان ہے بلکہ ہم تو جس کے ساتھ بھی کام کرتے ہیں وہ سب ہی بہت اچھے ہیں اور ہمایوں سعید سے تو اس لیے بھی زیادہ دوستی ہے کہ اس کا اور میرا ڈرامہ "مہندی" بہت زیادہ مقبول ہوا تھا۔"

"ہاں مہندی ڈرامہ تو ہمیں بھی یاد ہے۔ اس کے بعد آپ غائب ہوگئی تھیں' کیا ہوا تھا؟"

"ہوا کچھ بھی نہیں تھا۔ بس میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کینیڈا چلی گئی تھی اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد دوبارہ پاکستان آئی۔"

"آتے ہی اچھا رسپانس ملا' یا کچھ مشکلات پیش آئیں؟"

"ارے بہت اچھا رسپانس ملا' جیسے سب میرے منتظر ہوں۔ آتے ہی ایک کے بعد ایک ڈرامے ملنا شروع ہوگئے۔"

"اور اب ہم بھی دیکھ رہے ہیں کہ آپ ہر دوسرے نہیں تو تیسرے ڈرامے میں ضرور ہی ہوتی ہیں۔"

"بس یہ اللہ کا کرم اور ناظرین کی پسندیدگی ہے' ورنہ بندی کس قابل ہے۔"

"اب تک کتنے ڈرامے کرچکی ہیں؟"

"کافی کرچکی ہوں۔ "تم ہو کہ چپ" اور "زپ" آن ایئر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کافی ڈرامے کرچکی ہوں' اور کافی سارے انڈر پروڈکشن ہیں۔ "بول میری مچھلی" بہت زیادہ مقبول ہوا تھا۔ ویسے تو خیر میرے سارے ہی ڈرامے ماشاء اللہ ہٹ جاتے ہیں۔"

"ہاں' اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کے سارے ڈرامے بہت ہٹ جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اسٹار پلس کے ڈراموں کی مقبولیت میں کمی آئی ہے یا پہلے جیسی مقبولیت ہے؟"

"میں تو سمجھتی ہوں کہ اب اسٹار پلس کے ڈراموں کی مقبولیت میں بہت کمی آگئی ہے اور پہلے جیسا کریز نہیں رہا لوگوں کو۔ اب تو ہمارے ڈرامے بہت ہی اچھے ہوگئے ہیں اور اب پھر سے لوگ اپنے ڈراموں کی طرف راغب ہوگئے ہیں۔"

"شوبز جوائن کیے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟"

"جی 2000ء میں شوبز جوائن کیا تھا اور ابتدا ماڈلنگ سے کی تھی مختصر دورانیے کے ایک ڈرامے میں کام کیا تھا۔ بس اس ڈرامے [illegible]"

"[illegible] شہرت بھی مل جائے گی؟"

"نہیں سچی بات ہے یہ نہیں سوچا تھا کہ اتنی جلدی آفر آجائے گی اور میں ڈراموں میں کام کرنے لگ جاؤں گی اور جب ڈراموں میں کام کرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا تو بھلا شہرت کے بارے میں کیسے سوچ سکتی تھی۔"

"چلیں جی' بات کرنے کا شکریہ۔ پھر بات کریں گے۔"

"اوکے جی۔"

☼ ☼ ☼

مہوش حیات

"جی۔۔۔ مہوش! جب تم نظر آتی ہو تو مسلسل نظر آتی ہو اور جب غائب ہوتی ہو تو ایک دم سے غائب ہوجاتی ہو۔"

"بس جی اتفاق ہے۔ مگر آپ نے دیکھا ہوگا کہ میں

بہت زیادہ اسکرین پر نظر نہیں آتی۔ ہر رول کرنا اب میری ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔ میں وہی رول کرنا چاہتی ہوں جو دیر تک لوگوں کو یاد رہ جائیں۔"

"نگیٹیو رول کی طرف تمہارا رجحان زیادہ نہیں ہو گیا کیا؟"

"زیادہ تو نہیں کیے۔ زیادہ تر تو پوزیٹو رول ہی کرتی ہوں۔ "تھوڑی سی وفا چاہیے" اور "بھوررانی" میں میرا رول نگیٹیو تھا۔ اس کے علاوہ تو کوئی نہیں کیا۔"

"نگیٹیو رول میں لوگوں نے پسند کیا؟"

"ناظرین نے پسند تو کیا' لیکن زیادہ تر نے یہی کہا کہ تمہیں ایسے رول نہیں کرنے چاہئیں۔"

"کیا لوگ اثر لیتے ہیں؟"

"جی بالکل لیتے ہیں۔۔۔ جب میں "تھوڑی سی وفا چاہیے" اور "بھوررانی" کررہی تھی تو اکثر خواتین مجھے روک کر کہتی تھیں کہ بیٹا آپ جو کچھ کررہی ہو' ٹھیک نہیں کررہیں۔ کسی کا گھر برباد نہیں کرنا چاہیے۔"

"تم نے دونوں سیریلز میں یہی کام کیا۔۔۔ فلم میں

امت الصبور

دس سال بعد

عارف لوہار دس سال کے طویل عرصے بعد اداکاری کے میدان میں پھر کود پڑے ہیں۔ انہیں فلموں میں واپس لانے کا سہرا سید نور کے سر ہے۔ فلم "جگنی" میں عارف لوہار کے علاوہ صائمہ، شان، معمر رانا اور بابر علی بھی اداکاری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ توقع ہے کہ فلم "عید" پر نمائش کے لیے پیش کردی جائے گی۔

سزا میں اضافہ

انٹرنیشنل کرکٹ کونسل (آئی سی سی) نے میچ فکسنگ میں ملوث پاکستانی تیز باؤلر عامر کی سزا میں مزید ایک سال کی توسیع کردی ہے۔ ان کے خلاف یہ فیصلہ پابندی کی دوسری مرتبہ خلاف ورزی پر کیا گیا ہے۔ عامر نے لندن میں سرے کرکٹ لیگ کا میچ کھیل کر اپنے اوپر عائد پابندی کی خلاف ورزی کی۔ واضح رہے کہ میچ فکسنگ کا تنازعہ سامنے آنے کے بعد آئی سی سی نے عامر پر پانچ سال کے لیے میچ کھیلنے پر پابندی عائد کی تھی۔ توسیع کے بعد اب یہ پابندی چھ سال تک عائد رہے گی۔

چوری کا ڈراما

اداکارہ لیلیٰ کی والدہ کے انتقال پر اداکارہ ریشم تعزیت کے لیے گئیں تو وہاں [illegible] انہوں نے اپنے پرس سے رقم چوری ہونے کا شور مچا دیا۔ [illegible] نے لیلیٰ کے بھائی پر لگایا اس پر لیلیٰ کے بھائی نے قسم کھائی کہ انہوں نے چوری نہیں کی۔ [illegible] اس کے باوجود ریشم نے یہ خبر میڈیا پر دے دی۔ شوبز کے لوگوں [illegible] اہم افراد نے "رقم کی چوری" ریشم کا ڈراما قرار دیا ہے۔ ان سے تعلق [illegible] ریشم [illegible] کی خاطر کیا ہے۔

گلوکاری کا مقابلہ

گلوکارہ حمیرا ارشد کے اداکار شوہر احمد بٹ نے اداکاری ترک کرکے گلوکاری کا آغاز کردیا ہے۔ وہ ایک نجی ٹی وی چینل کے پروگرام میں [illegible] ارشد کے ساتھ باقاعدہ نغمات گاتے دکھائی دیے۔ [illegible] سال قبل فلم "سلاخیں" سے اداکاری کا آغاز کرنے کے بعد احمد نے تقریباً "بیس فلموں میں کام کیا تاہم وہ کوئی خاص تاثر قائم کرنے میں ناکام رہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ گلوکارہ بیوی کے راس آنے کے بعد انہیں فن گلوکاری راس آتا ہے یا نہیں۔

پذیرائی

چاہے قیمت اپنی عزت اور قومی حمیت کی ہی چکانی پڑے۔ ہمارے فنکاروں کے لیے بھارت جا کر کام کرنا کامیابی کی سند بن چکا ہے۔ اب معروف گلوکار راحت فتح علی خان کو ہی لیجیے جو بھارتی حکام کے ہاتھوں بری طرح "عزت افزائی" کے بعد بھی ان سے مزید اچھے تعلقات کے خواستگار ہیں اس لیے زیر حراست اور تفتیش کے بعد پاکستان واپسی پر یہی کہہ رہے ہیں کہ اگر عزت سے بلوایا گیا تو دوبارہ بھارت ضرور جائیں گے۔ اب اسے پیسے کی کشش کہیں یا کیا کہ راحت فتح علی خان دوبارہ وہاں جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ دہلی ایئرپورٹ پر ایک لاکھ چوبیس ہزار ڈالر کی کیش رقم رکھنے پر منی لانڈرنگ کیس کے سلسلے میں راحت فتح علی خان کو شامل تفتیش کیا گیا تھا۔ ممکن ہے "پذیرائی" کا یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے۔ جب اصولی بائیکاٹ کے بجائے ایسے بھائی چارے کا مظاہرہ ہوگا تو عزت افزائی تو ہونا لازمی ہے۔

تبدیلی

یوں لگتا ہے کہ شان کو ہماری فلم انڈسٹری کی واقعی فکر ہے۔ اس لیے بے حد تندہی سے نئے چہرے متعارف کروانے کی مہم پر لگے ہوئے ہیں۔ یہ ان ہی کی کوششیں ہیں کہ اداکارہ جگن کاظم نے فلموں میں کام کرنے کی ہامی بھری ہے۔ ان دنوں جگن کاظم رقص سیکھنے پر کمربستہ ہیں اور کوریو گرافر نگاہ حسین سے تربیت لے رہی ہیں۔ جتنی متحرک جگن کاظم ٹی وی پر نظر آتی ہیں۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جگن جلد اس مشن میں کامیاب ہوجائیں گی۔ خیر سے یہ تبدیلی

"فیلقوس" شاہ مقدونیہ کی ملکہ تھی۔ وہ لڑکا خود فیلقوس شاہ مقدونیہ کا اکلوتا جائز بیٹا اور جانشین "سکندر" تھا جسے بعد میں دنیا نے سکندر اعظم کے نام سے جانا۔

"میں دوڑ میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ یہ مقابلہ صرف شہزادوں سے ہو۔" سکندر کے جواب پر بطلیموس مزید کچھ کہہ نہ سکا۔

سکندر کی زندگی کے شروع کے سالوں میں اس کے متعلق تمام فیصلے اس کی ماں کرتی تھی۔ وہ ہر صورت اسے اپنا تابع رکھنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو سکندر کے سامنے مظلوم ظاہر کرنے کی کوشش کرتی اور کامیاب بھی رہتی سکندر "فیلقوس" (باپ) سے دور دور رہنے لگا کہ وہ دوسری عورتوں کو اولمپیاس کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

فیلقوس نے صرف ایک مرتبہ اس اجنبیت اور لاتعلقی کی وجہ بتائی کہ وہ سانپوں کے ہوتے اولمپیاس کے نزدیک نہیں جا سکتا۔ اولمپیاس کی خواب گاہ میں عشق پیچاں کی بیلیں تھیں، جن پر اس نے بڑے بڑے سانپ پال رکھے تھے۔ حالانکہ سچ بات یہ تھی فیلقوس کو جیسی محبت اولمپیاس سے ہوئی، کسی اور عورت سے نہ ہوئی تھی۔ ان کی شادی بھی اسی محبت کی مرہون منت تھی۔ فیلقوس اولمپیاس کو ایک پل کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتا تھا، یہاں تک کہ سکندر کی پیدائش کے بعد بھی اس کی محبت میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔

سکندر کو حیرانی ہوتی کہ آخر اس کا باپ ان معمولی سانپوں سے کیوں خوف زدہ ہے۔

رات جب سکندر اپنے نرم گدے پر لیٹا ہوا ہومر کا مسودہ پڑھ رہا تھا تو اس کی ماں اس کو شب بخیر کا بوسہ دینے کے لیے اس کے کمرے میں آگئی حسب معمول وہ خوشبو میں رچی بسی ہوئی تھی۔

"بیٹا! آج پھر فیلقوس شراب میں بدمست تھا۔ اس نے تمہارے استادوں اور اتالیقوں کو پیلا سے باہر بھیج دیا ہے۔ یہاں تک کہ لیونی دس کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری تعلیم اس شخص کے سپرد کردے، جو "سٹے جیرا" کا باشندہ ہے۔ وہ ایک طبیب ہے اور اس کا نام "ارسطو" ہے۔"

"ارسطو کا باپ تمہارے دادا کا طبیب تھا اور تمہیں یہ جلاوطنی اس لیے مل رہی ہے کہ تم طب پڑھ لو۔"

ادھر اولمپیاس نے اپنے جاسوس کے ذریعے یہ بات معلوم کروائی کہ ارسطو صرف طب ہی نہیں پڑھاتا، بلکہ قدرت نے اس کی فطرت میں فلسفہ اور سیاسیات کی صلاحیت ودیعت کی ہے۔ اس لیے اس نے سکندر پر یہ زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ ارسطو سے حکمرانی کے گر سیکھے اور سیاسیات کے راز پائے اور اس طرح مقدونیہ کا لڑکا طب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر علوم کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ ارسطو خود ایک عجیب و غریب راز ہے۔

عین ممکن ہے کہ اگر فیلقوس سکندر کو واپس نہ بلاتا تو وہ ایک طبیب بن جاتا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے ارسطو سے سیاسیات کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور یہ اس تعلیم کا آخری دور تھا۔ فیلقوس نے پیغام بھیجا کہ اسے فوراً "فوج میں پہنچنا ہے جو کوچ کرنی جا رہی ہیں۔

فیلقوس کسی حادثے کے تحت زخمی ہو چکا تھا۔ سکندر یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے زخمی باپ کو چھوڑ کر نہ جائے مگر فیلقوس نے اسے رخسار پہ بوسہ دے کر روانہ کر دیا۔ سکندر اپنی زندگی کی پہلی مہم پر روانہ ہوا۔ سکندر جب واپس آیا تب تک اولمپیاس یہ مشہور کر چکی تھی کہ سکندر فیلقوس کا نہیں بلکہ "زیوس دیوتا" کا بیٹا ہے۔ اس لیے جب سکندر قربانی کرنے قربان گاہ آیا تو لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ وہ بمشکل قربان گاہ کے اندر جا پایا۔ عقیدت مند خاموشی سے کھڑے سنہری بالوں والے شہزادے کی ایک جھلک دیکھنے کے آرزومند تھے۔ اس واقعے کو ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ اینٹی پیٹر نے سکندر کو ایک پیغام دیا۔

"مقدونیہ کے بادشاہ اور سپہ سالار فیلقوس نے "اپی رس" کی شہزادی اولمپیاس سے زوجیت کا رشتہ توڑ لیا ہے اور اطالوس کی بھتیجی "قلوپطرہ" سے شادی کر لی۔

اس بات سے سکندر کو بہت دکھ ہوا۔ وہ اور اولمپیاس پرانے خاندانی مکان میں چلے گئے تاکہ فیلقوس اور قلوپطرہ سے ان کا سامنا نہ ہو۔ اسی اثنا میں پیلا سے چند قاصد ان کے پاس پہنچ گئے اور سکندر کو اس کے باپ کا خط دیا۔ فیلقوس نے اس خط میں لکھا تھا۔

"یونانی مشیر مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ جب تم اپنے گھر کے لوگوں کو اکٹھا نہیں رکھ سکتے تو متحدہ یونان کے فرائض سے کیونکر عہدہ بر آ ہو سکو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا سکندر فوراً" واپس آجائے اور ریاست اور فوج میں آکر اپنا عہدہ سنبھالے۔"

سکندر واپس آگیا تو اسے قلوپطرہ کے چچا اطالوس کی جانب سے مختلف طنز کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ ایک دن اس نے سکندر کو اس حد تک زچ کیا کہ سکندر اسے قتل کرنے کے درپے ہو گیا۔ خیر چند دن گزرے، اس دن سکندر کی سوتیلی بہن کی شادی تھی۔ خود سکندر بھی تیار ہو کر مہمانوں کے انتظار میں کھڑا تھا تب ہی ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور اس نے فیلقوس پر خنجر سے وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس وقت لوگوں نے اور فوج نے یہ فیصلہ دیا کہ چونکہ فیلقوس اپنی زندگی میں ہی تمام اختیارات سکندر کو سونپ چکا تھا اس لیے اسے مقدونیہ کا نیا بادشاہ مقرر کیا جائے۔

سکندر جو طبعاً" شرمیلا تھا اور ہر وقت اپنے خیالوں میں گم رہتا اور ہر شخص پر بھروسہ کرلیتا خطرات کو مول لینے سے گھبراتا تھا۔ ہر وقت کتابوں میں اور خیالی دنیاؤں میں رہتا تھا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے جب حقیقی زندگی شروع کی تو ایک سال کے اندر اندر اس کی کایا پلٹ گئی۔ وہ صاحب عزم بن گیا۔ ہر مشورے کو اندھا دھند نہ مانتا، خطرات کے ہجوم میں بے تکلف گھس جاتا۔ اس نے اپنے اندر غیر معمولی قیادت کی صلاحیت پیدا کرلی۔

اب سکندر کی فتوحات کا دور شروع ہوا۔ وہ پیلا سے نکلا تو اسے بہت ساری اموات کی بھی خبریں ملتی رہیں جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر ایمیٹاس اور قلوپطرہ کے نومولود بیٹے کی بھی تھیں۔ جنہیں زہر دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔ مگر سکندر کو نہ واپس پیلا لوٹنا تھا اور نہ وہ ہی لوٹا۔

ایک صبر آزما جدوجہد کے بعد سکندر کرۂ ارض کا ایک بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا تھا۔ مگر وہ جہاں جہاں بھی گیا وہاں اس نے اپنی فتح کے نشان چھوڑے۔ جیسے قدیم شہر "سکندریہ" بھی سکندر نے ہی بنوایا اور اسی نام کے کئی اور شہروں کی بنیاد مختلف ملکوں میں رکھی۔ سکندر نے بحیثیت فاتح اپنے مفتوحوں سے ایسا اعلا سلوک کیا کہ خود یونانی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔ شہنشاہ ایران "دارا" جب میدان جنگ میں اپنے ساتھیوں اور اہل خانہ کو چھوڑ کر بھاگا تو تب سکندر نے یہ اعلان کیا کہ شاہی خاندان کے وہ خیمے جن میں ملکہ اور شہزادیاں موجود ہیں، کسی کو ان کے اندر جانے کی اجازت نہیں۔ نیز اس نے ملکہ کو یہ پیغام بھی بھجوایا کہ آپ لوگ "دارا" کی موت کا سوگ نہ منائیں کیونکہ وہ زندہ ہے اور آپ کو اور اہل خانہ کو ہمیشہ شاہی مراعات حاصل رہیں گی۔

عورتوں کے متعلق سکندر نے بہت ہی محتاط رویہ رکھا۔ سکندر اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ افسروں کی خیمہ گاہ میں طوائفیں موجود رہیں۔ تاہم اس کے خیال میں کسی عورت کو بیوی کا درجہ دینا قابل اعتراض نہ تھا اور "پارمینو" کی کوششوں کے بعد آخر سکندر نے ایک اعلا نسب کی ایرانی بیوہ عورت برسین کو اپنے لیے چنا جو کہ دمشق سے گرفتار ہوئی تھی۔

برسین نے سکندر کی زندگی کے معمولات میں کوئی

دخل نہیں دیا۔ سکندر کی رفیقۂ حیات بن جانے کو نہ اس نے اپنے لیے باعث عزت سمجھا اور نہ باعث شرم۔ "برسین" نے ایک روز ایک بازو بند پہنا ہوا تھا جو کہ اسے کسی غلام نے دیا تھا۔ اس کا ڈیزائن سانپ کا تھا۔ جب سکندر نے اسے دیکھا تو اس زور سے اتار کر دور پھینکا کہ اسے کچھ چوٹ بھی آگئی۔ پھر کچھ دن کے بعد سکندر نے اسے ایک سنہری کنگن دیا جو کہ قیمتی جواہرات سے مزین تھا۔ برسین سکندر کو دکھانے کے لیے اسے ہر وقت پہنے رکھتی تھی۔ سکندر اس راز کو پانا چاہتا تھا جو برسین نے اس ہاتھی دانت کے بنے ہوئے چھوٹے سے صندوق میں بند کر رکھا تھا۔ سکندر وہ صندوق کھولنا چاہتا تھا۔ برسین نے اسے بتایا کہ وہ یقین کرے کہ اس میں اس کے لیے زہر نہیں ہے۔ مگر سکندر کی مشکوک نظروں کو دیکھ کر برسین نے آگے بڑھ کر چپ چاپ وہ صندوق کھول دیا۔

"اندر چند چیزیں درخشاں تھیں جو بڑی ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں مثلاً "ایک بازو بند" ایک چھوٹا سا گوشہ تاج اور کانوں کی بالیاں۔"

ہر شے پر ایک ہی عبارت کندہ تھی۔ "روڈز کے میسنان کی طرف سے تحفۂ محبت" میسنان اس کے پہلے شوہر کا نام تھا سکندر نے ایک چوڑی اٹھا کر دیکھی اور چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر اسے واپس ڈبے میں رکھ کر ڈبہ بند کر کے برسین کو واپس دے دیا اور کہا۔ "تمہیں سکندر کی دی ہوئی چوڑیاں نہیں پہننی چاہئیں۔"

سکندر نے اسے آزاد کر دیا اور جب وہ مشرق کی سمت روانہ ہوا تو برسین کو ساتھ نہ لیا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دمشق کے سارے خزانے کو سکندر نے اپنے استاد "ارسطو" کی طرف بھجوا دیا تاکہ وہ اپنے لیے نئی درسگاہ تعمیر کروا سکے اور یہاں سے اس نے خوشبوؤں کا بہت بڑا انبار "لیونی دس" کو بھیجا اور ساتھ ہی خط میں یہ لکھا کہ۔

"دیوتاؤں کی قربانی کے لیے خوشبو ناپ تول کر ڈالنے کی ضرورت اب نہیں ہونا چاہیے۔"

سکندر نے "دریائے جہلم" تک کے علاقے کو فتح کر لیا تھا۔ یہیں سکندر کا پیارا گھوڑا "بیوسی فالس" مرا تھا۔ سکندر کے فوجی جو چند سال قبل اس کے ساتھ مقدونیہ سے چلے تھے یا تو مارے جا چکے تھے یا پھر مختلف علاقوں کو فتح کرنے کے بعد وہاں کا انتظام سنبھال رہے تھے۔ سکندر نے شہنشاہ دارا کی بڑی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اس لیے سکندر کی فوج میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ شامل تھے۔

یونانی فوجی اب واپس جانا چاہتے تھے۔ آخر سکندر نے انہیں واپسی کی اجازت دے دی۔ مگر خود سکندر کے نصیب میں واپس مقدونیہ جانا نہ تھا۔ سکندر نے بڑے بڑے بحری جہاز تیار کروائے کیونکہ وہ عرب کے گرد سمندری راستے سے چکر لگانا چاہتا تھا اس کا خیال تھا کہ وہ سرزمین ہندوستان جیسی بڑی ہوگی۔ مگر دریا میں نہانے کے بعد یکایک اسے لگا کہ اس کا جسم اکڑ رہا ہے اور بخار کی کیفیت محسوس ہوئی۔ غالباً وہ ملیریا کا شکار ہوا تھا سکندر کی وفات دریائے دجلہ کے کنارے واقع محل میں ہوئی اور وہ صرف 32 سال اور آٹھ مہینے کی عمر میں اس دنیا سے چل بسا۔

سکندر نے ایک عالمگیر ریاست کا خواب دیکھا تھا اور جس کا چند سال وہ مطلق العنان بھی رہا۔ بلاشبہ اپنے باپ کے رفیق اور اپنے فوجی جرنیل پارمینو اور اس کے بیٹوں کو قتل کرانے کے بعد وہ دیوانگی آمیز مراحل سے گزرا۔ لیکن اس نے دارا کی طرح کبھی بھی میدان نہ چھوڑا تھا۔ روشنک سکندر کی بیوی اس کی ماں اولمپیاس اور سکندر کے بارہ سالہ بیٹے کو 310 ق م میں مار ڈالا گیا اور اب فیلقوس اور سکندر کا کوئی خونی رشتہ زندہ نہ تھا۔ سلطنت ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی اور ہر کوئی اپنی اپنی ہانکنے لگا۔

بہرحال سکندر کو لوگ آج بھی دیوتا کا دوسرا روپ مانتے ہیں کیونکہ اہل یونان اور مقدونیہ کے نزدیک "اکی لیز" کا سا حسن اور ہرکولیس سی بہادری رکھنے والا یہ لڑکا زیوس (یونانی دیوتا) کا بیٹا ہے۔" جبکہ اس کی وفات کو تقریباً دو سے اڑھائی ہزار سال ہو چکے ہیں۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کھاؤسہ

اجزا:

بیسن	دو سے تین کھانے کے چمچے
ناریل	ایک پیکٹ
ہرا دھنیا	ایک گڈی
ہری مرچ	چھ سے سات عدد
ہری پیاز	دو گڈی
لیموں	دو عدد
لہسن باریک کٹا ہوا	تین جوئے
نوڈلز	ایک پیکٹ
لال مرچ کٹی ہوئی	تین سے دو کھانے کے چمچے
اجوائن	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
کنور چکن کیوب	ایک عدد

ترکیب:

1 ناریل پاؤڈر پانی میں ملا کر بیسن میں ڈال دیں اور پھر چکن کیوب ڈال کر کڑھی کی طرح پکالیں۔ ساتھ میں کڑھی پتہ بھی ڈال دیں۔

2 نوڈلز ابلتے ہوئے پانی میں ڈال کر ابال لیں اور تھوڑی چکنائی ڈال دیں تاکہ نوڈلز الگ الگ رہیں۔

3 ہرا دھنیا، ہری مرچ، ہری پیاز، لیموں، تلا ہوا لہسن، لال مرچ اور اجوائن کا مکسچر الگ الگ پیالوں میں رکھ دیں۔

پہلے پیالے میں نوڈلز ڈالیں پھر سارا ثابت مسالہ ڈال دیں۔ لیموں ڈال کر اوپر سے کڑھی ڈال کر پیش کریں۔

کشمیری دہی بیگن

اجزا:

بیگن	چھ عدد لمبے والے
دہی	تین پیالی
نمک	تھوڑا سا
سونف پسی ہوئی	ایک چمچہ
سوکھی ادرک پسی ہوئی	ایک چمچہ
ہری مرچ	چار عدد (باریک کٹی ہوئی)
دیگی لال مرچ	ایک چمچہ (پسی ہوئی)
چکن کیوب	ایک پیکٹ
چینی	ایک چمچہ
سفید زیرہ	ایک چمچہ
کارن فلور	ایک چمچہ

ترکیب:

1 سب سے پہلے بیگن کو دھو کر لمبے لمبے سلائس کاٹ کر نمک کے پانی میں بھگو دیں تاکہ کالے نہ ہوں۔

2 ایک پیالے میں دہی، کارن فلور، چینی ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پھر اس میں ہری مرچ، سونف اور سوکھی ادرک ملا دیں۔

3 اب ایک کڑاہی میں تیل گرم کر کے بھیگے ہوئے بیگن کو ڈیپ فرائی کر کے گولڈن براؤن کرلیں۔ جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال کر کسی کاغذ پر پھیلا دیں تاکہ خستہ رہیں۔

4 اب تیل واپس ڈبے میں ڈال کر دو کھانے کے چمچے رہنے دیں۔

5 تیل میں زیرہ، لال مرچ ڈال کر ہلکا براؤن کرلیں۔ پھر اس میں کنور چکن کیوب ذرا سے گرم پانی میں گھول کر فرائنگ پین نیچے اتار کر ملا دیں۔

6 گرما گرم دہی اور بیگن کے اوپر ڈال کر پیش کریں۔

آلو کے ہانڈی کباب

اجزا:

کنور چکن کیوب	ایک پیکٹ
آلو	آدھا کلو
(ابال کر چھیل کر Mash کرلیں)	
سفید زیرہ	ایک چمچہ (بھنا/پسا ہوا)
گرم مسالہ	ایک چمچہ (پسا ہوا)
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی (باریک کٹی ہوئی)
ہری مرچ	تین عدد (باریک کٹی ہوئی)
انڈا	ایک عدد (پھینٹ لیں)

سالن کے لیے اجزا:

ٹماٹر	آدھا کلو
ادرک لہسن (پسا ہوا)	ایک چمچہ
ہلدی	آدھا چمچہ
لال مرچ (پسی ہوئی)	آدھا چمچہ
ہری مرچ	دو عدد
تیل	ایک پیالی

ترکیب:

1 سب سے پہلے ابلے ہوئے آلو اچھی طرح میش کر کے سارے مسالے مع چکن کیوب کے اچھی طرح ملا کر سیخ کے کبابوں کی طرح کباب بنا کر انڈے میں ڈبو کر گرم گھی میں فرائی کرلیں۔

2 جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال کر ایک ڈش میں رکھ لیں۔

3 اب ایک دیگچی لیں، اس میں تیل ڈال کر ٹماٹر باریک کاٹ کر ڈال دیں۔

4 پھر ادرک، لہسن اور سارے مسالے ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔

5 تلے ہوئے کباب پھیلا کر ڈال دیں، ہرا مسالہ ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

6 جب تیل اوپر آجائے تو آلو کے مزیدار ہانڈی کباب تیار ہیں۔ گرم گرم نان یا سادے پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔

ادارہ

حسن و صحت

کچن کی اشیاء میں خوب صورتی کی چیزیں

انڈے :

ایک انڈے سے اپنے چہرے کو نکھاریں۔ ایک کچا انڈا پھینٹ لیں اور اسے اپنے چہرے اور گردن پر مل لیں، بیس منٹ تک آرام کریں اور لیٹی رہیں پھر پانی سے دھولیں۔ انڈوں سے مسام تنگ ہوتے ہیں اور جلد کو تقویت ملتی ہے، دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد وہ آپ کے چہرے پر فوری نکھار پیدا کر سکتے ہیں، انڈے کی سفیدی صفائی کرنے کی شاندار چیز ہے۔ شیمپو سے قبل آدھ گھنٹے تک اسے سر پر ملیں۔

چائے :

رو...

پھر انہیں آنکھوں پر مل لیں تاکہ تھکی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا ہو سکے۔ استعمال شدہ چائے کی پتیاں رکھیں۔ انہیں پانی کی مناسب مقدار میں ابال لیں اور یہ چائے کا پانی شیمپو کے بعد دھونے کے لیے استعمال کریں، اس سے بالوں میں چمک پیدا ہوتی ہے۔

نمک :

گرم پانی جس میں تھوڑا سا نمک ملا دیا گیا ہو اس سے آنکھوں کو دھونے سے واقعی ان میں چمک پیدا ہو سکتی ہے، اس سے سوجن بھی کم ہوتی ہے، ایک دن چھوڑ کر روئی کے پیڈ نمک کے پانی میں جس میں ایک ٹیبل اسپون نمک اور ایک پوائنٹ گرم پانی ہو، بھگو کر آنکھوں پر رکھیں۔ گرم پانی میں تین ٹیبل اسپون نمک ملا کر اس میں پیر بھگونے سے تھکن دور ہو جاتی ہے۔

کاسٹر آئل :

اس کو جب بیرونی طور پر استعمال کیا جائے تو یہ یقیناً بے حد مفید ہوتا ہے، اپنے سر پر اس کو سوتے وقت مل لیں، اور اگلی صبح دھو ڈالیں۔ کاسٹر آئل جذب نہیں ہوتا اور کہا جاتا ہے کہ بالوں کی نشوونما کرتا ہے، دوسرا طریقہ استعمال کریں۔ سر میں کاسٹر آئل ملیں۔ ایک بڑا تولیہ گرم پانی میں بھگوئیں۔ اس کو گولائی کی شکل دے لیں اور کچھ دیر کے لیے سر کے گرد باندھ لیں۔ اس سے تیل سر کی سطح میں اندر تک جذب ہو جائے گا۔

شہد :

قدرت کا ایک عطیہ شہد ہے، اس کو جلد پر ملا جا سکتا ہے، تاکہ جلد نرم، گیلی اور ریشم کی طرح کی نظر آئے۔

پپیتا :

اس میں اینزائمس ہوتے ہیں، جو جلد کے مردہ خلیات کو ... کے ان کو تبدیل کر دیتے ہیں، اس ...